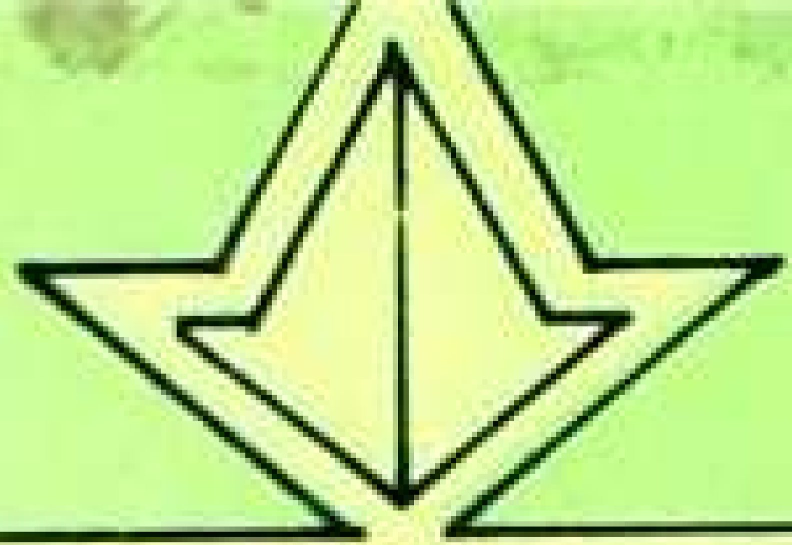
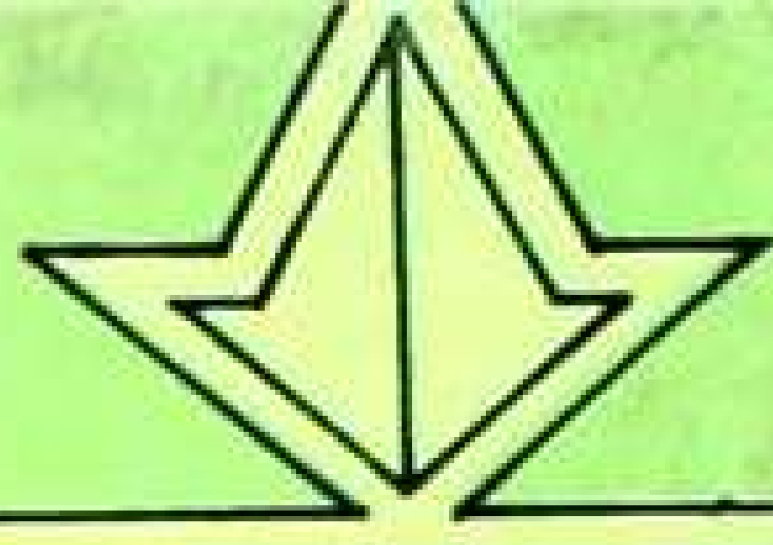
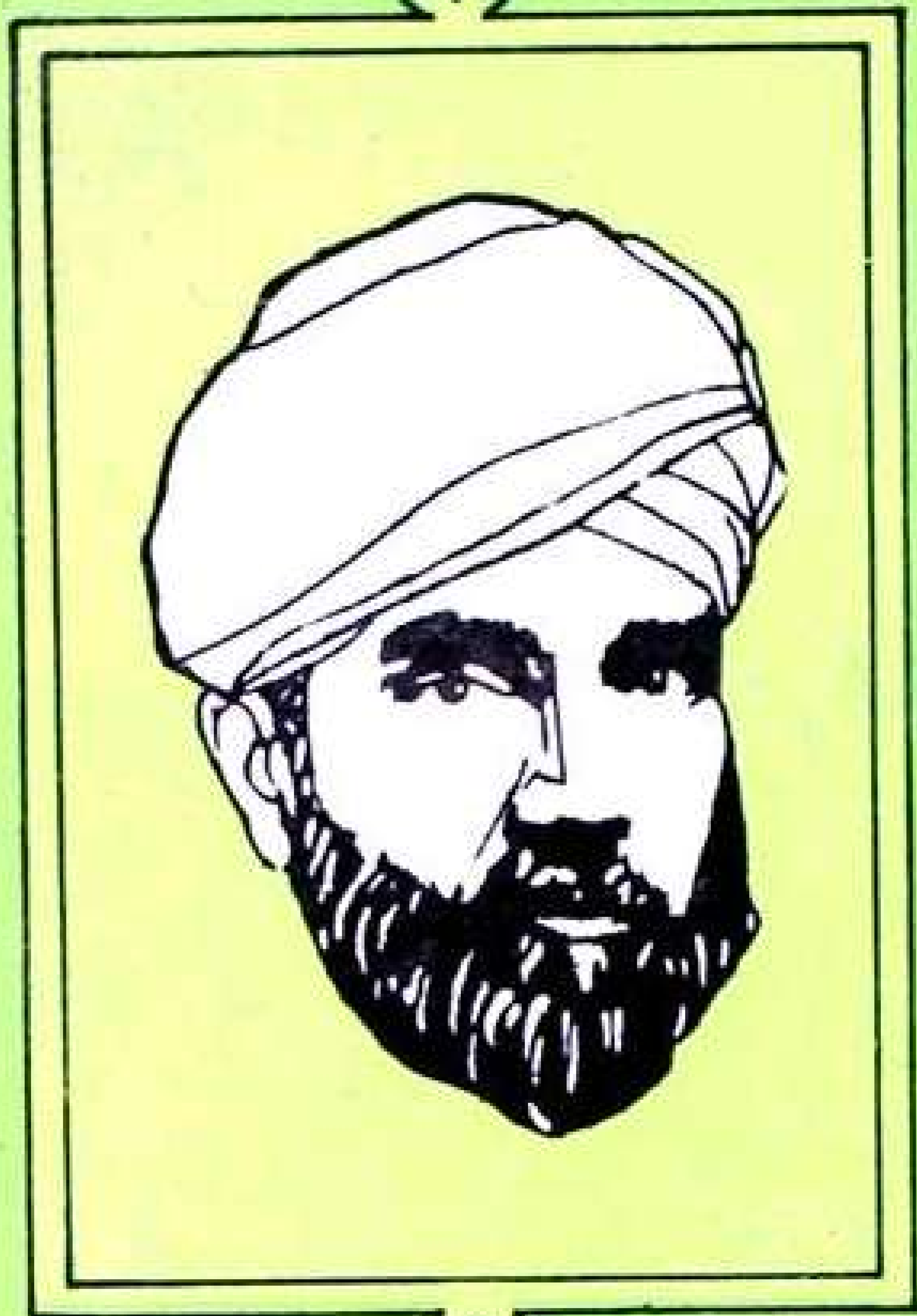
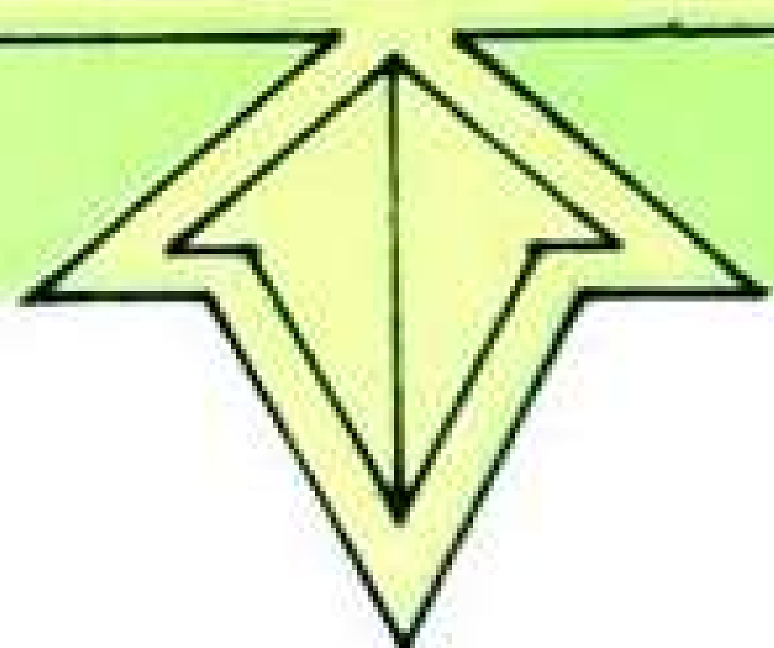
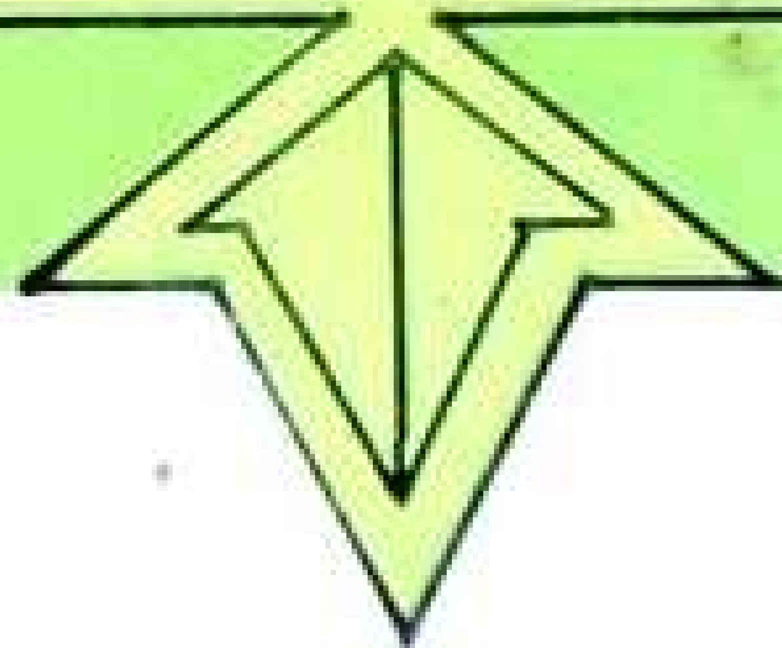




اقبال اور ظفر علی خان

جعفر بلوچ

علامہ اقبال

اور

مولانا ظفر علی خاں

جعفر بلوچ

اقبال اکادمی پاکستان

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

طبع اول : ۱۹۹۵ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۱۳۰/- روپے

مطبع : سعادت آرٹ پریس، لاہور

محل فروخت : ۱۱۶ - میکلوڈ روڈ، لاہور فون : ۷۳۵۷۲۱۴

فہرست

ضمائم

سرمتن

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں دونوں ملی اور ادبی حوالے سے ہمارے برگزیدہ ترین اکابر میں سے ہیں۔ برعظیم کی سیاسیات و ادبیات اپنے فروغ و ارتقا کے لئے ان کی مرہون منت ہیں اور اسلامیان برعظیم خصوصاً ان دونوں حضرات کے زیر بار احسان ہیں۔ ان دونوں ہم عصر شخصیتوں کی اعجاز آفرینی اور تاریخ سازی نے ہماری قومی زندگی کے لئے محکم بنیادیں فراہم کیں اور ان کے حالات و آثار کا مطالعہ دراصل ہمارے حصول آزادی اور دنیا کے نقشے سے ایک نئی مملکت کے ظہور کی ولولہ انگیز داستان ہے۔ ان محسنین ملت کی تابندہ حیات و فتوحات اور ان کے رخشندہ احوال و آثار کے مسلسل و مکرر مطالعہ سے ہم اپنی قومی زندگی کو از سرنو مضبوط و محکم بنا سکتے ہیں۔ یہی احساس "علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں" کی تصنیف کا بنیادی محرک تھا۔

اس کتاب میں حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں شخصی اور نجی حوالے سے بھی متعدد نکات زیر بحث آئے ہیں۔ کتاب کے ان حصوں کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ ہمارے اکابر کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں کوئی بعد نہ تھا۔ یہ حضرات نجی زندگی میں بھی ویسے ہی راست رو' حق پسند' صداقت شعار' اخلاص کیش' شگفتہ طبع اور وضع دار تھے جیسے کہ اجتماعی زندگی میں۔ ان کی باہم آمیزیاں' دوست داریاں اور محفل آرائیاں ان کی ملت دوستی کے تابع ہوتی تھیں۔ ان خیر نہاد اکابر کا اسلوب حیات ہمیں دعوت اتباع دے رہا ہے۔

اخلاص عمل مانگ نیاگان کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

دیگر علوم و فنون کی طرح ادبیات میں بھی تقابلی مطالعہ کا رجحان ہمیشہ مفید اور نتیجہ خیز رہا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ زیادہ تر مختلف ادبی ادوار' مختلف اصناف سخن' مختلف ادبی شہکاروں اور مختلف ادبی شخصیات وغیرہ کے بارے میں ہوتے رہے ہیں۔ تقابلی مطالعہ سے ہم زیر نظر موضوعات کا کافی حد تک صحیح اور متعین تعارف حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم ذوق معاصر شخصیات کا تقابلی مطالعہ بھی دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں۔ اس مطالعہ سے ہم نہ صرف متعلقہ شخصیات کے بارے میں کافی کچھ جان لیتے ہیں بلکہ تقابل کی وجہ سے ہم قدر و مقام کی تعیین کے مراحل میں افراط و تفریط کا شکار بھی نہیں ہونے پاتے۔ پھر جب ایک دور کے سلسلہ واقعات کا مطالعہ ہم دو عصر آفریں شخصیات کے تناظر میں کر رہے ہوتے ہیں تو گویا ہم اس زمانے کو عمل تکوین سے گزرتا ہوا بچشم خود دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ اس دور کے واقعات کا منہاج' اثرانداز ہونے والے متعدد تخلیقی عناصر کے تال میل' کشش و گریز' جذب و دفع اور اتصال و انفصال سے کس طرح صورت پذیر ہو رہا ہے۔

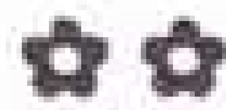
مقام مسرت ہے کہ حضرت علامہ اقبال کے حوالے سے اس طرح کے تقابلی مطالعات کا ایک زریں سلسلہ مشرقی اور مغربی زبانوں میں وجود میں آ چکا ہے۔ خصوصاً اردو میں تو اس نوع کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں بھرپور طور پر سامنے آئی ہیں۔ تقابلی مطالعہ پر مبنی ایسے مضامین کی فہرست بہت طویل ہے۔ تاہم کتابی صورت میں شائع ہونے والے تقابلی مطالعات بھی معتدبہ تعداد میں موجود ہیں۔ ان قابل قدر مطالعات میں سے 'اقبال کے شعری ماخذ مثنوی رومی میں' (سید وزیر الحسن عابدی) اقبال اور حافظ (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) علامہ اقبال اور مولانا محمد علی (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری) اقبال اور مغربی مفکرین (جگن ناتھ آزاد) اقبال اور سید سلیمان ندوی (اختر راہی) اقبال صوفی تبسم کی نظر میں (ڈاکٹر نثار احمد قریشی) خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ''علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں'' کو بھی اسی سلسلہ تالیفات کی ایک کڑی سمجھا جا

سکتا ہے۔

گرامی منزلت ڈاکٹر وحید قریشی' جناب مکرم پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور برادرم ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف کے ضمن میں مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ خدا انہیں جزائے خیر دے۔ اقبال اکادمی پاکستان' اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کر رہی ہے۔ رب کریم اس کی فیض رسانی کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔ خدا کرے یہ کتاب ملک و ملت کے لئے نافع ثابت ہو۔ (آمین)

جعفر بلوچ

۱۱ جولائی ۱۹۹۴ء



علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں
(اشتراک فکر و عمل کے چند پہلو)

جب رات کو چاند ستاروں کی محفل سجتی ہے یا بہار کے موسم میں رنگ برنگ پھول باہم ہنستے چہکتے ہیں تو مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ معاصرت کو صرف رشک و رقابت کا پیش خیمہ سمجھنا درست نہیں' اصلاً تو یہ اتحاد و اشتراک کی لطافتوں کا سرچشمہ ہے۔

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں بیسویں صدی کے آسمان علم و ادب کے مہ و مشتری تھے۔ دونوں حضرات ادبیات میں منفرد اسالیب کے طرح انداز تھے۔ دونوں کا قلم قومی و ملی امنگوں اور تحریکوں کی تب و تاب کا مقیاس تھا۔ عمرانیات و سیاسیات میں عملی طور پر بھی دونوں اکابر نے ملک و ملت کے لئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔ فکر و نظر اور نصب العین کا اشتراک تعلق خاطر اور قربت و رفاقت کے لئے موثر ترین محرک ہوا کرتا ہے اس لئے حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں میں رفاقت و موانست کے غیر فانی رشتے کا استوار ہونا بعید از فہم نہیں۔

دونوں اکابر کے اولین باہمی تعارف کو ان دونوں کی عظمت و شہرت کے اولین ظہور ہی سے وابستہ سمجھنا چاہئے۔ یہ تعارف جلد ہی دوستی میں تبدیل ہو گیا اور چونکہ اس دوستی کی بنیاد اخلاص پر تھی اس لئے یہ دوستی روز افزوں استحکام کی حامل رہی اور بعض فروعی سیاسی اختلافات کے چند ناخوشگوار مراحل کے سوا' فریقین کو حین حیات تک اس دوست داری کا پاس رہا۔

ابتدائی مراسم

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہونا شروع ہو گیا تھا اور ان کا کلام اس دور کے جرائد اور گلدستوں وغیرہ

میں شائع ہو رہا تھا۔ چونکہ دونوں حضرات کا تعلق سیالکوٹ کے مردم خیز خطے سے تھا' اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ادبی تعارف کے علاوہ دونوں حضرات کا باہمی شخصی تعارف بھی بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے قبل ہو چکا ہو گا۔ ۱۹۰۱ء میں ہم ان دونوں معاصر نابغوں کی روشن تخلیقات کو ماہنامہ مخزن میں اشاعت اور قبول عام کی سند پاتے دیکھتے ہیں۔ مثلاً مخزن کے شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء میں حضرت علامہ اقبال کی نظم "ہمالہ" اور مولانا ظفر علی خاں کی نظم "ندی کا راگ" (مشمولہ "بہارستان") شائع ہوئیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے مخزن کے اجراء کا خیرمقدم کرتے ہوئے اور ان دونوں نظموں کی داد دیتے ہوئے لکھا :

"نظم کا حصہ میرے خیال میں نثر سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ خصوصاً شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کی اس نظم کے لحاظ سے جو کوہستان ہمالہ پر ہے اور اس سے بھی زیادہ محمد ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے کی نظم سے جس کا عنوان ہے "ندی کا راگ۔" آخری نظم لارڈ ٹینی سن کی ایک نظم کا ترجمہ ہے مگر سچ یہ ہے کہ مغربی خیالات کو نہایت ہی مناسبت اور بہت ہی جامہ زیبی کے ساتھ اردو کا مشرقی لباس پہنایا گیا ہے۔"(۱)

جنوری ۱۹۰۴ء میں مولانا ظفر علی خاں نے حیدر آباد دکن سے "دکن ریویو" کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ اپنے دور کے اس ممتاز علمی و ادبی جریدہ کے شمارہ مارچ ۱۹۰۴ء میں علامہ اقبال کی نظم "رخصت اے بزم جہاں"(۲) شائع ہوئی جو بعض تبدیلیوں کے ساتھ "بانگ درا" میں بھی شامل کی گئی ہے۔ "دکن ریویو" میں کچھ صفحات معاصر جرائد اور نئی مطبوعات پر تبصروں کے لئے بھی وقف ہوتے تھے اور یہ تبصرے اکثر "پروفیسر نقاد" کے فرضی نام سے شائع کئے جاتے تھے۔ جناب اکبر حیدری کشمیری اپنے ایک مضمون بعنوان 'دکن ریویو' (مطبوعہ "نقوش"۔ شمارہ نمبر ۱۴۰) میں لکھتے ہیں "غالباً پروفیسر نقاد حیدر آبادی کے فرضی نام سے ایڈیٹر ظفر علی خاں ہی لکھا کرتے تھے۔" اسی مضمون میں آگے چل کر انہوں نے پھر لکھا ہے "ہمارے خیال میں غالباً ظفر علی خاں پروفیسر نقاد کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین اسی زمانے میں لاہور کے مخزن میں بھی چھپتے تھے۔"

"افسانہ" و "دکن ریویو" (اس زمانے میں یہ دونوں جرائد بیک جلد شائع ہوتے تھے) کے شمارہ بابت جون۔ جولائی ۱۹۰۴ء میں حضرت نقاد (مولانا ظفر علی خاں) نے مولانا حسرت موہانی کے جریدہ "اردوئے معلیٰ" کے کسی تازہ شمارہ پر تنقید کرتے ہوئے چکبست لکھنوی کے ان اعتراضات کو رد کیا ہے جو موصوف نے حضرت علامہ کے ایک قصیدہ (در مدح نواب بہاولپور) پر

وارد کئے تھے۔ حضرت نقاد نے حضرت اقبال کی مدافعت کرتے ہوئے لکھا :

"ایک مضمون لکھنؤی پکبست کا ہے جس میں اقبال کے ایک قصیدہ کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ قصیدہ ممدوح (نواب بہاولپور) کی شان کے شایاں نہیں بلکہ اسکندر اعظم و نپولین کے قابل تھا۔ میرے خیال میں اس اعتراض سے قصیدہ کی تعریف کا پہلو نکلتا ہے نہ مذمت کا۔ معترض صاحب اگر فارسی اردو کے قصائد دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ معمولی معمولی لوگوں کے لئے ایسے ایسے قصائد لکھے گئے ہیں کہ اقبال کے قصائد کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایک دو شعروں پر اعتراض بھی کئے ہیں مگر وہ کچھ پایہ کے نہیں ہیں۔ کوئی خاص غلطی زبان کی نہیں بتائی گئی۔ بعض شعروں کی بے انتہا تعریف بھی کی ہے۔"

"دکن ریویو" کے شمارہ بابت ستمبر تا دسمبر ۱۹۰۵ء میں حضرت علامہ کی وہ غزل شائع ہوئی جس کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

مثال پر تو مے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں
ہرے رہو وطن مازنی(۳) کے میدانو
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

مولانا ظفر علی خاں نے بعد میں دیگر جرائد و اخبار مثلاً پنجاب ریویو، ستارہ صبح، زمیندار وغیرہ نکالے تو ان میں بھی حضرت علامہ کا کلام گاہے گاہے چھپتا رہا۔

۱۹۰۸ء میں دونوں اکابر کے ربط و تعلق کا ذکر سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب "دانائے راز" میں اس طرح کیا ہے :

"۱۹۰۸ء میں البتہ جب مولانا ظفر علی خاں کے زیر اہتمام "انجمن سخن" قائم ہوئی اور ظہیر رضوی کی وفات پر ایک جلسہ کیا گیا تو اس کی صدارت محمد اقبال نے کی اور اپنا کلام بھی سنایا۔ شاید لے سے۔"(۴)

دسمبر ۱۹۰۸ء کے "مخزن" میں شیخ سر عبدالقادر نے "اردو سبھا" کے نام سے اداریہ لکھا اور اردو کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دینے والے افراد پر مشتمل ایک مجلس مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ زبان اردو کو ایک علمی اور قومی زبان کی حیثیت سے ترقی دی جا سکے۔ مولانا ظفر علی خاں نے دکن ریویو بابت فروری ۱۹۰۹ء میں اس تجویز پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا :

"بہرحال نشوونما کی اس حیرت انگیز اور سریع السیر قابلیت کے بھروسہ پر جو خود

اردو زبان کے ہر رگ و ریشہ میں ودیعت کی گئی ہے' ہمیں ناامید ہوئے بغیر اپنی کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ کچھ تو اس خیال سے اور کچھ یہ سوچ کر کہ شیخ عبدالقادر صاحب اور ڈاکٹر محمد اقبال صاحب جیسے مستعد' لائق اور ذی اثر افراد قوم کی متفقہ مساعی ضرور بار آور ہوں گی' ہم اس تجویز کا نہایت خوشی سے خیرمقدم کرتے ہیں اور شیخ صاحب کی مجوزہ فہرست کی ترتیب میں' جس حد تک کہ اسے دکن سے تعلق ہے' بہ سرگرمی تام' حصہ لینے کو تیار ہیں لیکن اس قدر عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مناسب ہو گا کہ "اردو سبھا" کے بجائے جس پر بادی النظر میں "اندر سبھا" کا دھوکا ہوتا ہے' کوئی اور موزوں نام اس انجمن کے لئے تجویز کیا جائے۔"(۵)

دونوں اکابر کے دوستانہ مراسم گھریلو ملاقاتوں تک وسیع تھے۔ دونوں دوستوں کی ۱۹۱۱ء کی ایک ملاقات کی کیفیت مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے ملاحظہ ہو :

"ایک مرتبہ ہم چار پانچ طالب علم مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے ملنے کے لئے نکلے۔ وہ اس زمانے میں شاہ محمد غوث کے پاس ایک نوتعمیر عمارت میں رہتے تھے۔ جس کی دوسری اور تیسری منزل انہوں نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ ہم دوسری منزل میں پہنچے تو مکان کے صحن میں مولانا ظفر علی خاں بیٹھے تھے۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ عشا کی اذان ابھی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا سے تھوڑے فاصلے پر اقبال بھی تشریف فرما تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ اقبال نے شلوار پہن رکھی تھی سفید قمیص' اوپر چھوٹا کوٹ' سر پر لنگی بندھی تھی' ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس زمانے میں وہ انارکلی لاہور میں رہتے تھے۔ میرا خیال ہے شام کے وقت ٹہلتے ٹہلتے مولانا ظفر علی خاں سے ملنے کے لئے آ گئے تھے۔ ہمارے سامنے انہوں نے جو کچھ فرمایا اس کا مفاد یہ تھا کہ ظفر علی خاں آپ کے اخبار میں کانپور کے فلاں صاحب (شاعر کا نام مولانا مہر نے حذف کر دیا ہے) کی جو لمبی لمبی نظمیں چھپتی ہیں' بعض اوقات خیال آتا ہے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لوں اور کانپور پہنچ کر ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ اس شخص کو ختم کرنے کے لئے کانپور تک تھرڈ کلاس کا کرایہ خرچ کرنا بھی روپے کا ضیاع ہو گا۔

قطعاً شبہ نہیں کہ اس شاعر کی نظمیں بہت معمولی ہوتی تھیں اور عموماً زمیندار کا پورا پہلا صفحہ گھیر لیتی تھیں۔ حضرت علامہ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ اس قسم کی

نظمیں اخبار میں نہ چھپنی چاہئیں لیکن اس زمانے میں خبریں اور مضمون زیادہ نہیں ہوتے تھے اور اخبار نویس کا اولین مقصد یہ ہوتا تھا کہ اخبار کے صفحات جلد سے جلد پر ہو جائیں۔"(٦)

ایک مشترک نظم

"بہارستان" کی ایک نظم بعنوان "پرانی روشنی" کے وضاحتی نوٹ میں مولانا ظفر علی خاں فرماتے ہیں :

"یہ نظم علامہ اقبال کے مکان پر بیٹھ کر اس زمانے میں لکھی گئی جب علامہ اقبال انارکلی میں رہتے تھے۔ اس میں آدھے شعر میرے ہیں اور آدھے علامہ ممدوح کے۔"(٧)

جناب شورش کاشمیری نے یہی نظم بعنوان "مسلمانوں کی جمعیت اگر کم ہے تو کیا پروا" چٹان کے اقبال نمبر بابت ٢٥ اپریل ١٩٤٩ء میں شامل کی اور اس پر یہ نوٹ دیا :

"مولانا ظفر علی خاں نے بیان فرمایا کہ ٢١ جولائی ١٩١١ء کی شب کو وہ علامہ اقبال مرحوم کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ کاسہ لیسان ازلی کا ذکر چھڑ گیا اور دہلی دربار کی تصویر بھی سامنے آ گئی۔ چنانچہ مولانا اور علامہ نے مشترکہ طور پر ایک نظم ترتیب دی جو ذیل میں درج ہے۔ اس کے پہلے دو شعروں میں پشتینی وفاداروں کے عقیدہ واردات کی طرف اشارہ ہے۔ باقی شعروں میں مختلف واقعات پر کنائے ہیں۔"(٨)

نظم ملاحظہ ہو :

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں بساط کہنہ و نو ہے
اگر اس کی سلامی کے لئے نواب جھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لو ہے
کئی مسلک کئے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا
احدشہ کا کوئی پٹھو' کوئی آغا کا پیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ پچپیں الیکشن کی
بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ کو پڑی پو ہے

حصول جاہ و عزت جس وفاداری کا مقصد ہو
وہ جنس ناروا گندم نہیں گندم نما جو ہے
نہیں ہے بہر اظہار وفا لازم نمود اصلاً
کہ بحر شعر میں پانی نہیں مطلق مگر رو ہے
ملے گی تشنہ عزت کو کب اعزاز کی قفلی
مہینا جون کا ہے اور یہ سرگرم تگ و دو ہے
مبارک ہے یہ جشن تاجپوشی جس کے صدقے میں
وہ مسجد تک چلا آیا، کلب گھر کا جو رہرو ہے
مسلمانوں کی جمعیت اگر کم ہے تو کیا پروا
عدد سو کے چھیاسٹھ ہوں مگر مفہوم تو سو ہے
نہیں ہوتے ہیں لیڈر ان میں پیدا قابلیت سے
مسلمانوں میں یہ مخلوق مثل سبزہ خود رو ہے
خوشامد نے جلا ڈالا ہے خودداری کے خرمن کو
ذرا سی شمع ہے کم بخت اور کتنی بڑی لو ہے
ضرورت کچھ نہ کچھ دنیا میں ہے عصمت فروشوں کی
یہ روحانی تدبچہ ہے یہ اخلاقی بد رو ہے
پرانی روشنی میں دیکھ لو ہے پختگی کیسی
کہ پہلے دن سے مہر و ماہ میں قائم وہی ضو ہے(۹)

مرتب "سرود رفتہ" مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں :

"قیاس کی بنا پر یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان میں سے مولانا کے شعر کون کون سے ہیں اور علامہ کے کون کون سے؟ لیکن دونوں کے انداز فکر اور اسلوب بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی حد تک وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نمبر ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۳ علامہ مرحوم کے معلوم ہوتے ہیں اور باقی مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے۔"(۱۰)

طرابلس اور بلقان کی جنگیں

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے یورپی طاقتوں کے ایماء اور درپردہ تعاون سے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ مولانا مہر اس جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ترک' عرب اور مصری مل کر (اٹلی کے) مقابلے میں کھڑے ہو گئے تھے اور انہوں نے غیر معمولی قربانیوں سے کام لے کر اٹلی کی پیش قدمی روک دی تھی- وہ دور بڑا نازک تھا- طرابلس جسے آج کل لیبیا کہتے ہیں' رسمی طور پر سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا- ترکی کے پاس بحری بیڑا کوئی نہ تھا- اس کی فوجیں مصر سے گذر کر طرابلس پہنچ سکتی تھیں- لیکن انگریزوں نے مصر کا راستہ روک لیا- نوجوان بہادر ترک بھیس بدل بدل کر مصر کے غیر معروف راستوں سے گذرتے ہوئے طرابلس پہنچے اور عربوں کو منظم کر کے انہوں نے اٹلی کی فوجوں سے لڑایا- ان بہادر ترکوں میں انور پاشا شہید' نیازی بے شہید' غازی عصمت انونو' غازی مصطفیٰ کمال اور بیسیوں دوسرے جواں مرد قابل ذکر ہیں جن کے نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہیں گے- یورپی طاقتوں پر اٹلی کی نامرادیوں کا راز آشکارا ہو گیا تو انہوں نے بلقانی ریاستوں (عیسائی ریاستیں' جو پہلے ترکی کے ماتحت تھیں) کو شہ دے کر ترکی پر حملہ کرا دیا- اس طرح ترکوں کے گھر میں جنگ شروع ہو گئی اور بہادر ترک سالاروں کو طرابلس چھوڑ کر واپس آنا پڑا-"(۱۱)

مولانا مہر اس سلسلہ واقعات کو بیان کرتے ہوئے "مختصر تاریخ اسلام" میں لکھتے ہیں :

"جنگ بلقان چھڑ جانے پر ترکوں نے طرابلس کو آزادی دے دی اور اپنی پوری قوت بلقانیوں کے مقابلے میں لگا دی- بلقانیوں کے قدم جہاں جہاں پہنچے انہوں نے مسلمان آبادیوں پر خوفناک ظلم کئے آخر یورپی طاقتوں نے صلح کرائی اور ترکی کے بہت سے یورپی علاقے بلقانی ریاستوں کو دلا دیئے-"(۱۲)

ان الم انگیز واقعات سے عالم اسلام کے دوسرے مسلمانوں کی طرح' مسلمانان برعظیم بھی نہایت ملول اور آزردہ خاطر ہوئے- مسلمانوں کے زعمائے سیاست و ادب نے اٹلی اور ان کے یورپی آقاؤں کے ان مظالم پر قابل داد ردعمل کا اظہار کیا- ان حضرات میں سے مولانا شبلی نعمانی' مولانا محمد علی جوہر' علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خاں' ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اسمائے گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں- علامہ اقبال نے اس زمانے میں جو نظمیں کہیں وہ ان کی اسلامی حمیت' ملی احساس اور حریت پسندی کی لازوال شہادتیں ہیں- ان نظموں نے مسلمانوں کو ایک ولولہ تازہ سے ہمکنار کیا- جناب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے الفاظ میں :

"طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے برعظیم کے مسلمانوں کے جذبات میں جو ہیجان برپا کیا' اقبال نے اسے اپنی نظموں شکوہ' جواب شکوہ' حضور رسالت مآبؐ میں' غرہ

شوال، فاطمہ بنت عبداللہ، محاصرہ ادرنہ اور شمع و شاعر میں سمو کر ان یاس انگیز حالات میں امید کا احساس ابھارا۔"(۱۳)

مولانا ظفر علی خاں نے روزنامہ زمیندار میں اس سلسلے میں ایسی آتشیں تحریریں شائع کیں کہ مغربی بتان استعمار جھلس جھلس گئے۔ پھر وہ شعلہ نوا مقرر بھی تھے۔ ان کی آتش نوائی نے مسلمانوں کے دلوں کی افسردگی کو اشتعال میں بدل دیا۔ مولانا نے اس سلسلہ میں جو نظمیں کہیں ان میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان سے مولانا کے ملی جذبات کی التہاب آفرینی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

مسیحیوں اور مسلموں میں یہ جنگ جس وقت سے ٹھنی ہے
بدن کو دیتی ہے روح دھمکی کہ آ گیا وقت جاں کنی ہے
بتا رہی ہے دراز دستی اطالیہ کی طرابلس پر
کہ آج کشور کشا وہی ہے جسے ذرا مشق رہزنی ہے
ذرہیں حریفان کینہ پرور کہ وار کرنے کو ہیں مسلماں
دعا ہے اسلامیوں کا نیزہ، اثر اسی نیزہ کی انی ہے

(نظم نئی صلیبی جنگ۔ ۱۹۱۱ء)

+++

خدا کا ہو غضب اٹلی پہ نازل   دیا جس نے مسلمانوں کو چرکا
کیا ہے جس نے خون بے گناہاں   لیا ہے جس نے ٹھیکہ شور و شر کا
دیئے ترکوں کو جھوٹے جس نے الزام   بنایا ہے کبوتر جس نے پر کا
گھمنڈ اپنے جہازوں پر ہے جس کو   سبق بھولا ہے جو این المفر کا
لڑے گا کیا مسلمانوں سے اٹلی   تقابل کیا شغال اور شیر نر کا
اڑانے کو ہے ترکی کوئی دم میں   پھریرا نصرت و فتح و ظفر کا
خدا ترکوں کی فرمائے گا امداد   تصدق احمد مرسل کے سر کا

نظم "ترک اور اطالوی"

+++

چمک اے تیغ روما کا نشاں ہے تو مٹانے کو
گرج اے توپ اٹلی کے دھوئیں ہے تو اڑانے کو

یہ چوتھے آسماں پر جا کے عیسیٰ سے کوئی کہہ دے
کہ نکلی آپ کی امت ہے قصر امن ڈھانے کو
تری تعلیم نے ان کو بنایا گرگ مردم در
تجھے اے پوپ دیں پطرس نے جو بھیڑیں چرانے کو

+++

کھیل بچوں کا جسے سمجھا تھا اٹلی نے وہ جنگ
کر رہی ہے قافیہ اس کے جواں مردوں کا تنگ
ہیں ترے بیڑے ہمارے آگے اے اٹلی حباب
ہم ترے ایرو پلینوں کو سمجھتے ہیں پتنگ
جھونک دی اٹلی نے چشم روشن ایماں میں خاک
چڑھ گیا آئینہ انصاف پر یورپ میں زنگ
کیا اسی شائستگی پر ہے مسیحیت کو فخر
کیا یہی تہذیب ہے سرمایہ ناز فرنگ

مولانا کا یہ لسانی اور قلمی جہاد بھی یقیناً ملت افروزی کے لئے کچھ کم نہ تھا لیکن مولانا نے اس پر التفا نہ کی بلکہ انہوں نے ترکوں کی عملی امداد کے لئے فنڈ بھی جمع فرمایا اور خود قسطنطنیہ جا کر ایک لاکھ پانچ ہزار کا چیک محمود شوکت پاشا صدر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیا۔(۱۴)

اس طرح ۱۸-۱۹۱۷ء میں روس اور برطانیہ نے ایران کو آشوب و انتشار سے دوچار کیا تو اس پر بھی حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اپنے رنگ میں موثر اور بھرپور ردعمل ظاہر فرمایا۔ حضرت علامہ نے رجائیت افروز اسلوب میں لکھا۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

اور مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا۔

بے گناہوں کے لہو کی بہہ رہی ہیں ندیاں
خاک ایران خون عصمت سے ہوئی ہے لالہ رنگ
آج ایراں ہے تو کل کابل کی باری آئے گی
گر یہی ہے روسیوں کی چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ

آہ اے انصاف ہم ڈھونڈیں کہاں جا کر تجھے
سینٹ پطرس برگ جب مضراب اور لندن ہو چنگ(۱۵)

اقبال کی شیوا بیانی کا اعتراف

۲۶ جنوری ۱۹۱۲ء کے "زمیندار" میں سید حسن مرتضیٰ شفق عمادپوری (۱۸۷۱-۱۹۴۴ء) کی ایک نظم اس موضوع پر شائع ہوئی کہ ہندوستان میں کوئی شیوا بیان شاعر موجود نہیں- جناب شفق نے لکھا تھا :

جوہر شناس جس کو جواہر سے تول لیں
اب گوہر سخن کا وہ پلہ گراں نہیں
ہیں وہ خم و قدح نہ وہ پیمانہ و سبو
وہ پیر مے فروش کی اونچی دکاں نہیں
اس پر یہ لطف ہے کہ سخن ور ہیں سیکڑوں
ایسا بھی کوئی شہر ہے شاعر جہاں نہیں
پورب کے باکمالوں کی مٹی خراب ہے
دامن پہ ہے یہ داغ کہ اہل زباں نہیں
پچھم کے کچھ ہیں اہل زباں مستند مگر
سب قادر الکلام نہیں خوش بیاں نہیں

مولانا ظفر علی خاں نے اس نظم کا جواب دیا اور علامہ اقبال کی ذات کو اپنے جواب کی محکم ترین دلیل کے طور پر پیش کیا- جناب شفق کی نظم اور مولانا کا جواب "شاعرانہ گفت و شنید" کے عنوان سے "نگارستان" کی زینت ہیں-

جو کچھ کہا جناب شفق نے خدا گواہ
اس میں ہمیں مجال چنان و چنیں نہیں
ہم کو سلیقہ گرچہ نہیں انتقاد کا
ہم گرچہ نکتہ رس نہیں اور نکتہ داں نہیں
لیکن اگر کسی کو ہو یہ ادعا کہ آج
ہندوستاں میں ایک بھی شیوا بیاں نہیں

ہم کو نہیں ہے اس کے عقیدے سے اتفاق
ہم اس کی ایسی ہاں میں ملا سکتے ہاں نہیں
اقبال ہی کو لیجئے گر چاہئے مثال
جو نکتہ چیں کے زعم میں اہل زباں نہیں
وہ کون سی زمین ہے دنیائے فکر میں
اس نے بنا دیا جسے آج آسماں نہیں
ملت کے دل کے واسطے سرمایہ گداز
کیا اس کی دردناک نواریزیاں نہیں
کیا اس کی داستان کی جدت طرازیاں
صرف بقائے سلسلہ پاستاں نہیں
اس کے کلام میں نہیں کیا سوز میر و درد
یا غالب و امیر کی رنگینیاں نہیں
دہلی و لکھنو پہ نہیں حصر شاعری
وہ خطہ کون سا ہے یہ دولت جہاں نہیں(۲۶)

شفاخانہ حجاز

حضرت علامہ کی نظم "شفاخانہ حجاز" کی، جو "بانگ درا" میں شامل ہے، شان نزول بیان کرتے ہوئے حکیم یوسف حسن (مدیر نیرنگ خیال) نے مدیر نقوش جناب محمد طفیل سے فرمایا :

"میں علامہ کی خدمت میں، مہینے میں ایک دو بار ضرور حاضری دیا کرتا تھا۔ میں ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولانا ظفر علی خاں بے حد گھبرائے ہوئے آئے۔ علامہ نے پوچھا۔ خیر باشد؟

خیریت کہاں ہے؟

کیوں؟

"گورنمنٹ نے ایک سرکلر بھیجا ہے کہ ہم اپنی طرف سے پانچ لاکھ روپے دیں گے اور پانچ لاکھ روپیہ مسلمان اکٹھا کریں تاکہ حجاز میں ہسپتال بنوائے جائیں۔ کیونکہ حج کے موقع پر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

"پھر؟"

مولانا پہلے ہی پریشان تھے۔ حد درجہ مضطرب، گلوگیر انداز میں جواب دیا "یہ انگریزوں کی چال ہے۔ جس میں وہ مسلمانوں کو بھی شامل کر کے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ انگریز جہاں ہسپتال یا رفاہی ادارے بنواتے ہیں وہاں پہلے اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ پھر اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے حجاز بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"

علامہ نے فرمایا "معاملہ بے شک سنجیدہ ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں شام کو اپنا چپڑاسی بھیج دیجئے گا۔ میں اسے چار پانچ شعر لکھ دوں گا وہ اپنے اخبار میں چھاپ دیجئے گا۔ پھر نہ کوئی چندہ دے گا نہ ہسپتال بنیں گے نہ انگریز کی چال کامیاب ہو گی۔"

چنانچہ علامہ نے "شفاخانہ حجاز" کے نام سے ایک نظم لکھی جو زمیندار میں چھپی۔ نظم کے چھپنے سے مسلمان خبردار ہو گئے چنانچہ انگریز کی اسکیم دھری رہ گئی۔"(۱۷)

شمع اور شاعر

۱۹۱۲ء میں حضرت علامہ نے اپنی نظم "شمع اور شاعر" انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔ "جب علامہ نظم پڑھنے کے لئے تشریف لائے، اس وقت گوجرانوالہ کے حافظ جھنڈا اپنی پنجابی نظم پڑھ رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی اس جلسے میں موجود تھے مگر وہ حافظ جھنڈا کی پنجابی نظم کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہے تھے چنانچہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو مولانا کے پاس ہی بیٹھے تھے، اردو میں اس پنجابی نظم کے مطالب کی وضاحت کرتے جا رہے تھے۔"(۱۸)

مولانا مہر اس نظم (شمع اور شاعر) کے بارے میں فرماتے ہیں :

"یہ نظم مولانا ظفر علی خاں نے اپنے پریس میں خاص اہتمام سے دس ہزار کی تعداد میں چھپوائی تھی اور آٹھ آنے فی کاپی قیمت رکھی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اس کی فروخت سے جو پانچ ہزار روپیہ وصول ہو گا وہ ڈاکٹر اقبال کو دے کر (انہیں) تبلیغ اسلام کے لیے جاپان بھیجا جائے گا۔"(۱۹)

بروایت حکیم محمد حسن قرشی حضرت علامہ کی اس نظم (شمع اور شاعر) کے متعلق مولانا ظفر علی خاں نے کہا کہ "اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اس نظم کی شکل اختیار کر لیتا۔"(۲۰)

جواب شکوہ

حضرت علامہ کی نظم "جواب شکوہ" کا تعارف کراتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں :

"جواب شکوہ' انجمن کے سالانہ اجلاس کے بجائے ۳۰ نومبر (۱۹۱۲ء) کی ایک شام کو بعد نماز مغرب بیرون موچی دروازہ ایک جلسے میں پڑھا گیا جس کا اہتمام مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا اور جس سے مقصد یہ تھا کہ زمیندار ترکی امدادی فنڈ کے لئے سرمایہ جمع کیا جائے۔ نظم پہلے سے طبع شدہ تھی۔ ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور اس کی ساری آمدنی امدادی فنڈ میں جمع کر دی گئی۔" (۲۱)

اس جلسہ کی خبر' جس میں حضرت علامہ نے اپنی نظم "جواب شکوہ" پڑھی' ۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کے زمیندار میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر کے مطابق :

"۳۰ نومبر کو باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں مسلمانان لاہور کا ساتواں جلسہ زیر صدارت چودھری شہاب الدین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل نہایت رونق و کامیابی سے منعقد (ہوا)۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی نظم "جواب شکوہ" شوق کے کانوں سے سنی گئی اور اس کا ایک ایک صفحہ پچاس پچاس روپے کو خریدا گیا۔ ایڈیٹر زمیندار اور آغا حشر کاشمیری نے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق پر تقریریں کیں اور چار ہزار سے کچھ اوپر روپیہ فراہم ہو گیا۔ یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ مولوی انشاء اللہ خان صاحب ایڈیٹر اخبار "وطن" نے ازراہ قدردانی کلام اقبال' جواب شکوہ کے دو صفحے ایک سو دس روپے کو خریدے۔ یہ دل پسند نظم چار آنے کو دفتر زمیندار لاہور سے مل سکتی ہے۔" (۲۲)

جناب اشرف عطا اس جلسے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال کے نظم پڑھنے سے قبل مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ "ہم لوگ بھی نظمیں کہتے ہیں مگر ڈاکٹر اقبال کی اور ہی بات ہے۔ وہ بھی کبھی نظم کہتے ہیں مگر اس میں جبرئیل کی پرواز کا رنگ ہوتا ہے۔" (۲۳)

۱۹۱۲ء ہی کی ایک اور نظم بعنوان "چند حسرت آفریں حقیقتیں" میں مولانا نے اپنا اور علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

انتخاب ہفت کشور خطہ پنجاب ہے
اس میں کیا کیا نکتہ سنج اور نکتہ در پیدا ہوئے

حاسدان تیرہ باطن کو جلانے کے لیے
تجھ میں اے پنجاب اقبال و ظفر پیدا ہوئے(۲۴)

ہمایوں کی ایک نظم

۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کے "زمیندار" میں حضرت علامہ کا ایک خط مدیر زمیندار کے نام شائع ہوا جس کے ذریعے انہوں نے جسٹس شاہ دین ہمایوں کی ایک نظم "زمیندار" میں اشاعت کی غرض سے ارسال کی۔ اس نظم کا تعارف کراتے ہوئے حضرت علامہ نے لکھا کہ "یہ نظم مولوی صاحب موصوف نے ۱۵ اگست ۱۹۱۲ء کے روز لکھی تھی جب کہ وہ ولایت تشریف لے جا رہے تھے۔ عدن دیکھ کر ان کے قلب میں ان تمام روایات کی یاد تازہ ہو گئی جو اس سرزمین کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور ان اشعار میں ایک نہایت دلفریب طریق میں انہوں نے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں خوابیدہ یا بیدار ہیں۔" اس نظم کا پہلا بند درج ذیل ہے :

نہیں گو لائق توصیف منظر اے عدن تیرا
مگر تو ہے عرب میں اور یہی ہے بانکپن تیرا
مسلماں کی نظر میں پھول ہے خار چمن تیرا
زباں شیریں تری' مرغوب انداز سخن تیرا
پہاڑوں میں ترے غار حرا کا راز پنہاں ہے
کہاں وہ باب عالی ہے کہ تو اک جس کا درباں ہے(۲۵)

مکمل خط اور نظم ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا کا سفر ترکی اور اس کے متعلقات

۱۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو مولانا پیرس اور لندن کے راستے قسطنطنیہ پہنچنے کے لیے بمبئی سے بحری جہاز پر سوار ہوئے اور بحر ہند' بحیرہ قلزم اور بحیرہ روم سے ہوتے ہوئے مارسیلز اور وہاں سے جنوری ۱۹۱۳ء کے پہلے ہفتے پیرس پہنچے۔(۲۶) پیرس سے ۷ جنوری ۱۹۱۳ء کو آپ نے "سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی" کے عنوان سے باون اشعار کی ایک نظم ارسال فرمائی جو ۲۲۔ صفر ۱۳۳۱ھ (مطابق ۳۱ جنوری ۱۹۱۳ء) کو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ یہ نظم مولانا کے شعری مجموعہ نگارستان میں شامل ہے۔

اس نظم میں سمندر سے خطاب کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں :

میں نے دیکھا ہے سینا کی گذرگہ سے تجھے
یہ رہا ہے جس میں تیرا لاجوردی رودبار
ساحل اٹلی کا ادھر، سسلی کے منارے ادھر
وہ فضا سے ہمکلام اور یہ صبا سے ہمکنار

"آبنائے سینا" کے حوالے سے "نگارستان" میں مولانا نے درج ذیل نوٹ لکھا ہے:

"اس آبنائے سینا ہی میں سے گذرتے وقت اقبال نے یہ شعر کہا تھا۔

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

لیکن یہ زمانہ اور تھا۔ اس وقت ہمارے شاعر کو حضور سرورؐ کون و مکاں کے دربار میں اس آبگینہ کی نذر گذرانے کا حسرت اندوز شرف حاصل نہ ہوا تھا جس کی نسبت وہ کہتا ہے۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

آج اگر اس مقام سے اس کا گذر ہوتا تو وہ مازنی کی اولاد و احفاد کے کارناموں کی یاد سے متاثر ہو کر شاید یوں کہتا

جلے رہو وطن مازنی کے میدانو
کہ دور ہی سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں"(۲۷)

مولانا ظفر علی خاں پیرس سے لندن اور وہاں قریباً دو ماہ قیام کرنے کے بعد قسطنطنیہ پہنچے۔ اکابر و اعیان ترکیہ سے ملاقاتیں کیں۔ محمود شوکت پاشا سے ملے اور ایک لاکھ پانچ ہزار کا وہ چیک ان کے حوالے کیا جو آپ ہندوستان سے ترکی کی امداد کے لیے لے گئے تھے۔ جناب پاشا نے اس رقم کی برقی رسید اسی وقت کارپردازان "زمیندار" کے نام لاہور بھیج دی۔(۲۸) ترکی میں مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے سلطان محمد خان خامس سے بھی ملاقات کی اور ان کی خدمت میں نذر بھی پیش کی۔ جناب عبدالحمید مرزا لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا نے اس ملاقات میں علامہ اقبال کی نظم "فاطمہ" کو نشان کر کے بانگ درا اور زمیندار کا کوئی خاص نمبر پیش کیا۔"(۲۹)

مرزا صاحب نے یہ اطلاع جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، مولانا ظفر علی خاں کی تحریر کے حامل ایک ایسے بوسیدہ ورق کی بنا پر دی جو پھٹ چکا تھا۔ اور اس کا صرف ایک حصہ باقی تھا۔

مولانا کی یہ تحریر ۱۸ جون ۱۹۱۳ء کی ہے۔ اس تحریر کا بیشتر حصہ مرزا صاحب نے مولانا ہی کے قلم سے رپورٹ کیا ہے لیکن نذر کے بارے میں مندرجہ بالا اطلاع مرزا صاحب نے اپنے الفاظ میں دی ہے۔ شاید مولانا کی تحریر کا وہ حصہ جس میں یہ اطلاع درج تھی' کاغذ کی بوسیدگی اور دریدگی کی وجہ سے مرزا صاحب سے پڑھا نہ جا سکا اور مرزا صاحب نے مندرجہ بالا اطلاع انکل اور قیاس سے اپنے لفظوں میں درج کر دی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اطلاع کا یہ حصہ درست نہیں ہے کہ نذر کی کشتی میں زمیندار کے شمارہ کے ساتھ بانگ درا بھی پیش کی گئی تھی۔ بانگ درا اس واقعہ کے قریباً گیارہ سال بعد ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ حضرت علامہ کی نظم زمیندار یا کسی اور جریدہ میں شائع ہوئی ہو گی۔ کتاب سے' ممکن ہے مولانا ظفر علی خاں کی اپنی کوئی نثری تصنیف مراد ہو مثال کے طور پر خیابان فارس' معرکہ مذہب و سائنس وغیرہ۔ اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر انصاری نے حکومت ترکیہ کے سامنے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بھی پیش کیا اور اس کے نصابات مرتب کرنے کے لیے حضرت علامہ اقبال کا نام نامی تجویز کیا۔ چنانچہ مولانا نے لکھا :

"مدینہ یونیورسٹی کے قیام کی ایک اور تجویز بھی' جس کا خاکہ' شیخ عبدالعزیز شاویش کے ساتھ مل کر میں نے اور ڈاکٹر انصاری نے مرتب کیا تھا اور جس کے نصاب تعلیم کے لیے ڈاکٹر محمد اقبال کو (جو ابھی سر نہ ہوئے تھے) دعوت دی گئی تھی' اس زمانہ کی ناتمامیوں کی یادگار ہے۔"(۳۰)

وطن کو واپسی

مولانا ظفر علی خاں جولائی ۱۹۱۳ء میں وطن واپس آئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ دہلی اور لاہور میں ان کے استقبالیہ جلوس نکالے گئے۔ جناب اشرف عطا لکھتے ہیں :

"دہلی میں آپ کا جو جلوس نکالا گیا اس میں تین چار لاکھ آدمی شامل تھے۔ لوگوں نے مولانا ظفر علی خاں کی گاڑی ہاتھوں سے کھینچی۔ دو بچے آپ کی گاڑی کے نیچے آ کر کچلے گئے اور ہلاک ہو گئے۔ ایک بچے کی ماں نے کہا کہ اگر ایسے دس بیس بچے بھی ہوں تو میں ظفر علی خاں پر نچھاور کر دوں۔"(۳۱)

مولانا حالی نے اس موقع پر تیئس اشعار کی ایک نظم کہہ کر مولانا ظفر علی خاں کو خراج عقیدت پیش فرمایا۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اے مالک دفتر زمیندار	اے نازش قوم و فخر اقراں
اے صدق و صفا کی زندہ تفسیر	اے شیر دل اے ظفر علی خاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ	اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردی اہل دیں نے آخر	جوہر ترے کر دیے نمایاں
ڈالا یہ تری پکار نے غل	جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غم قوم سے تھے بے حس	چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہزن	جو مال کے اپنے تھے نگہباں
زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت	ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں(۳۲)

اس پس منظر میں لاہور کی اس کلب نے بھی مولانا ظفر علی خاں کو کھانے کی دعوت دی جس کے ممبر علامہ اقبال بھی تھے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں :

"مولانا ظفر علی خاں ترکی سے واپس آئے تو ممبروں کی خواہش ہوئی کہ ان کو کھانے کی دعوت دی جائے۔ سر شفیع کہتے تھے کہ وہ تیز مزاج آدمی ہیں شاید ایسی سیاسی باتیں کہہ دیں جو مناسب نہ ہوں ڈاکٹر صاحب (حضرت علامہ اقبال) نے کہا کہ جب ممبر دعوت دینا چاہتے ہیں تو آپ اختلاف نہ کریں۔ ہم مولوی صاحب کو سمجھا دیں گے کہ وہ ایسی ویسی بات نہ کریں۔ چنانچہ ان کو سمجھا دیا گیا۔ دعوت میں کم و بیش ایک سو اصحاب شریک تھے۔ مولانا تقریر کے لئے اٹھے تو فرمایا "صاحبو! مجھے کہا گیا ہے کہ تیز بات نہ کروں۔" یہ کہہ کر بری طرح انگریزوں پر برستے رہے۔ میں اور ڈاکٹر صاحب بھی پریشان تھے اور سر شفیع بھی۔ مگر چونکہ وہاں کوئی رپورٹر نہ تھا اس لئے بات باہر نہ نکلی۔"(۳۳)

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی دوستانہ گھریلو ملاقاتوں کی شہادت مولانا حامد علی خاں بھی دیتے ہیں۔

"بھائی (مولانا ظفر علی خاں) کے انگلستان اور ترکی کے دورے سے واپسی پر ہم ان کے ساتھ کیشو رام بلڈنگ میں رہنے لگے۔ علامہ وہاں روز آتے گھنٹوں مولانا سے نشست رہتی۔ لیکن پھر علامہ کی طبیعت میں انقلاب پیدا ہوا۔ سب کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔"(۳۴)

اقبال اور ظفر رام گلی میں

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے جناب عبد المجید سالک لکھتے ہیں :

"مولانا ظفر علی خاں (کرم آباد میں) نظر بند کر دیے گئے۔ اس نظر بندی کے دوران میں ان کو دیوانے کتے نے کاٹا۔ وہ بغرض علاج حکومت کی اجازت سے کسولی گئے اور شملہ پہنچ کر اپنے لیے مشروط آزادی کا پروانہ لے آئے۔ زمیندار تو سر مائیکل اوڈوائر کی مہربانی سے بند ہو چکا تھا لیکن رام گلی میں اس کا دفتر موجود تھا۔ مجھے یاد ہے مولانا شملہ سے واپس کرم آباد جاتے ہوئے ایک آدھ دن کے لیے اسی دفتر میں قیام فرما ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ دفتر کی چھت پر مولانا کے چند عقیدت مند اور دوست جمع تھے۔ ڈاکٹر اقبال بھی ملنے کے لیے آ گئے تھے شعر خوانی اور لطیفہ بازی کا ہنگامہ تھا۔ یہیں ڈاکٹر صاحب نے "اسرار خودی" کے وہ چند اشعار ترنم سے سنائے جو اورنگ زیب عالمگیر کی شان میں لکھے گئے تھے۔

شاہ عالمگیر گردوں آستاں اعتبار دودمان گورگاں
درمیان کارزار کفر و دیں ترکش ما را خدنگ آخریں"(۳۵)

"ستارہ صبح" کا زمانہ

مولانا اور علامہ کی باہمی ملاقاتوں کے سلسلے میں سید عبدالواحد کی یہ روایت بھی ہمارے سامنے ہے کہ:

"پہلی جنگ عظیم کے دوران حکومت ہند نے مولانا ظفر علی خاں کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا تھا۔ مگر مولانا حکومت کی اجازت سے اکثر لاہور آیا کرتے تھے اور دوران قیام لاہور میں وہ اپنا بیشتر وقت علامہ کی خدمت میں گزارتے تھے اور ان کی جو گفتگو علامہ سے ہوتی تھی اس کا حال کرم آباد جا کر "ستارہ صبح" میں شائع کرتے تھے جو وہ سنسر کی نگرانی میں کرم آباد سے ایڈٹ کرتے تھے۔"(۳۶)

سید عبدالواحد کا یہ بیان مولانا ظفر علی خاں ہی کی ایک تحریر پر مبنی ہے مولانا "ستارہ صبح" بابت ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کے کالم "جواہر ریزے" میں لکھتے ہیں:

"لاہور آنے کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ گاہے ماہے لسان توحید علامہ اقبال سے نیاز حاصل ہو جاتا ہے اور ان کی حکیمانہ پھلجھڑیاں طبیعت کے انقباض کو جو کثرت کار اور ہجوم افکار کا نتیجہ ہے، مبدل بہ انشراح کر دیتی ہیں۔"(۳۷)

مولانا ظفر علی خاں کی صبح کی سیر تو مشہور ہے ہی۔ اس باضابطہ سیر کے علاوہ بھی وہ کبھی کبھی

احباب کے ساتھ تفریح کے لیے جایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار نواب ذوالفقار علی خاں، علامہ اقبال اور مولانا کو سیر و تفریح کے لیے اپنے ساتھ مقبرہ جہانگیر لے گئے۔ اس سیر کی ایک جھلک مولانا کے بہار آفریں قلم کی وساطت سے ملاحظہ ہو :

"گزشتہ یک شنبہ کے روز آنریبل نواب ذوالفقار علی خاں صاحب کی نیازمند نوازی ہمیں شام کے وقت بطریق تفریح و تفرج مقبرہ جہانگیر میں لے گئی۔ علامہ اقبال بھی ساتھ تھے۔ سرو و شمشاد اور سبزہ و گل کی بہار تو وہی ہے جو یہ چرخ فیروزہ گوں صدیوں پہلے دکھا چکا ہے بلکہ لارڈ کرزن کی فیاضانہ آثار پرستی کے صدقہ میں گلگشت کی فضا شاید پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہے لیکن اس گنبد کو دیکھ کر جس میں جہانگیر ابن اکبر محو آرام ہے، دل میں ہزاروں عبرت اندوز حسرتوں کا ہجوم ہو گیا۔ علامہ اقبال نے اس وقت سوز و گداز کے لہجہ میں مولائے روم کی ایک غزل پڑھی جس کے یہ تین شعر ہمیں وجد میں لے آئے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

بعد مغرب ہم شاہدرہ سے لوٹ کر گھر پہنچے تو یہی اشعار زبان پر جاری تھے ادب اردو نے تقاضا کیا کہ ان مطالب عالیہ پر اس کا بھی کچھ حق ہے۔ طبیعت کو اس مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ چند شعر بستر پر لیٹے ہی لیٹے موزوں ہو گئے جو حاضر ہیں۔" (۳۸)

یہ نظم "بہارستان" میں تصویر آرزو کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کا مطلع درج ذیل ہے۔

میری جاں پر چھائے جاتی ہے فنا کی آرزو
اور زباں پر آئے جاتی ہے بقا کی آرزو (۳۹)

مشترک فی البدیہہ اشعار

نواب سر ذوالفقار علی خان ہی کے سلسلہ میں اقبال و ظفر کی فی البدیہہ گوئی کا ایک واقعہ

حکیم محمد حسن قرشی بیان کرتے ہیں :

"ایک مرتبہ نواب ذوالفقار علی صاحب وزیراعظم پٹیالہ کے اعزاز میں لاہور میں ایک پارٹی دی گئی۔ اس میں علامہ اقبال نے نواب صاحب کے متعلق کہا۔

پٹیالہ روشن است از انوار روئے او
ہندو بہ ذوالفقار علی ناز می کند

نواب صاحب نے فرمایا مجھے زیادہ تر کامیابی سردار جوگندر سنگھ وزیر (ہوم منسٹر) کی امداد کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا :

جوگندر است جوہر و نواب آئینہ
یک سوز می کند و دگر ساز می کند(۴۰)

مولانا ظفر علی خاں کی شاعرانہ حسیات کو اونگھ تو ویسے بھی کبھی نہ آتی تھی لیکن ایسی جاں پرور صحبتیں انہیں بیدار تر رکھتی تھیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت علامہ اور مولانا کے ایک مشترک دوست سید محسن شاہ کی موٹر سے متعلق ہے۔ "چمنستان" میں "محسن شاہ کی موٹر" کے زیر عنوان مولانا لکھتے ہیں :

"نواب نثار علی خاں قزلباش رئیس اعظم لاہور کے چھوٹے بھائی تکمیل علم کے بعد جب لندن سے واپس وطن آئے تو نواب صاحب نے ان کے آنے کی خوشی میں احباب کو نہایت وسیع پیمانہ پر ایک پر تکلف دعوت دی۔ جن احباب کے نام دعوت کے رقعے جاری کیے گئے ان میں علامہ اقبال اور سید محسن شاہ بھی شامل تھے۔ ایک رقعہ میرے نام بھی آیا۔ سید محسن شاہ اپنی موٹر پر آئے۔ اس خیال سے کہ سید صاحب کچھ مولانا شوکت علی تو نہیں ہیں کہ ساری موٹر میں ان کے تن و توش کے سوا اور کسی کی گنجائش نہ نکل سکے' میں نے اور علامہ اقبال نے ان سے کہا کہ اختتام دعوت پر ہم آپ کے ساتھ چلیں گے لیکن جب دعوت ختم ہوئی تو سید صاحب مع موٹر غائب تھے۔ اس پر بے ساختہ میری زبان سے نکلا :

برق پا موٹر ہے محسن شاہ کی واہ کیا موٹر ہے محسن شاہ کی
کر نہیں سکتی ہمارا انتظار بے وفا موٹر ہے محسن شاہ کی
چھینے جاتی ہے دل سرکار کو دلربا موٹر ہے محسن شاہ کی

علامہ اقبال نے یہ اشعار سن کر کہا کہ موٹر کی بے حیائی کے متعلق بھی کچھ کہا ہوتا ایسا کیوں نہیں کہا۔ ع

بے حیا موٹر ہے محسن شاہ کی

میں نے معاً کہا :

غیر سے ہے بلکہ اس کو رسم و راہ   بے حیا موئر ہے محسن شاہ کی
رخ نہیں کرتی ہے تھیٹر کی طرف   پارسا موئر ہے محسن شاہ کی
خود تو محسن شاہ ہیں خاکی نژاد   باد پا موئر ہے محسن شاہ کی(۴۱)

یہ مسائل تصوف

حضرت علامہ اقبال ایک دور میں (جس کا آغاز قیاساً" بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرہ سے ہوتا ہے) اسلام اور تصوف کو باہم متخالف سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مروجہ تصوف کی تعلیمات عجمی فلسفہ پر مبنی ہیں اور انہیں عربی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کی خودی یا انا کو کمزور کرنے والے اسباب میں سے ایک یہ عجمی تصوف بھی ہے اور اس کے اصول و نظریات مسلمانوں کو قوت عمل سے محروم کرنے کا باعث بنے ہیں۔

حضرت علامہ کے یہی خیالات مثنوی اسرار خودی کی اشاعت کا باعث بنے اور جب ۱۹۱۵ء میں پہلی بار یہ مثنوی شائع ہوئی تو علمی و ادبی دنیا میں اس کی تردید و تائید میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس دور میں حضرت علامہ نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین اور خطوط لکھے۔ حضرت علامہ کے نقطۂ نظر کی مخالفت کرنے والوں میں خواجہ حسن نظامی پیش پیش تھے۔ حضرت علامہ نے ایک خط میں خواجہ صاحب کو لکھا :

> "میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"(۴۲)

تصوف کے بعض عقائد و مسائل کے بارے میں حضرت علامہ نے ایک مضمون میں فرمایا :

> "مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح کملاء، مسئلہ وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ، یا دیگر مسائل جن

میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب "انسان کامل" میں کیا ہے۔"(۴۳)

حضرت علامہ کے اس سلسلہ نگارشات میں تصوف اور اسلام، تصوف اور توحید، تصوف اور فلسفہ، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، اور اکابر متصوفین مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی اور منصور حلاج وغیرہم کے بارے میں دلچسپ اور بصیرت افروز نکتے ملتے ہیں۔ تصوف پر ان مباحث کے دوران میں مولانا ظفر علی خاں نے حضرت علامہ کا ساتھ دیا اور خواجہ حسن نظامی اور دیگر معترضین کے جواب میں مضامین اور منظومات کا تانتا لگا دیا۔

۳ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مولانا نے "ستارہ صبح" میں "مارا نص باید نہ فص" کے زیر عنوان لکھا "ابن عربی پر اگر علامہ اقبال نے یا ہمیں نے نکتہ چینی کی ہوتی تو جناب خواجہ حسن نظامی کی طریقت مابی کو ہم پر بگڑنے کا پورا حق حاصل تھا کہ یہ نااہل ان رمزوں کو کیا جانیں۔ اسی طرح اگر علمائے امت کی طرف سے "فصوص الحکم" پر اعتراضات ہوں تو جناب خواجہ صاحب ابرو پر پھر بھی بل ڈال سکتے ہیں اور فرما سکتے ہیں کہ عالم ظاہر جدا ہے اور عالم باطن الگ ہے۔ شریعت کی سطحی آنکھ، طریقت کے عمیق غوامض تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ عتاب ہمارے سر آنکھوں پر۔ لیکن کیا فرمائیں گے جناب خواجہ حسن نظامی خود ان صوفیائے کرام کے باب میں جنھوں نے محی الدین ابن عربی کے عقائد سے علانیہ بیزاری کا اظہار کیا ہے اور ایسے سخت اور درشت الفاظ میں صاحب "فصوص الحکم" کے عقائد پر جرح کی ہے کہ ہم نے تو اس کا دسواں حصہ بھی نہیں لکھا۔ ابن عربی کی تردید کوئی ایسی لغزش نہیں ہے، جو ہمیں سے سرزد ہوئی ہو۔ اس جماعت کے بعض جلیل القدر اراکین بھی جن کے خواجہ حسن نظامی نام لیوا ہیں، یہی خطا کر چکے ہیں۔ ع

این گناہیست کہ در شہر شمانیز کنند"(۴۴)

"ستارہ صبح" کے اسی شمارہ میں متذکرہ بالا مضمون سے قبل یہ اشعار بھی شائع ہوئے۔

کچھ اے حال، والو سمجھے بھی ہو تم
معمائے راز حیات امم کو
سمجھ کر مگر موت کو زندگی تم
تصوف کی پٹی پڑھاتے ہو ہم کو
خدا تم کو شرمائے تم نے بنایا
مرادف الف لام میم اور الم کو
ولایت کو سمجھا رسالت سے افضل
خدا کی جگہ پوجتے ہو صنم کو

یہاں آؤ قرآن تم کو پڑھائیں
لئے پھرتے ہو کیا فصوص الحکم کو(۴۵)

مولانا نے اس بحث کو بہت پھیلا دیا۔ حالانکہ علامہ اس بحث کی تطویل کو نتیجہ خیز نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ۱۱ جنوری ۱۹۱۸ء کو خواجہ حسن نظامی کو لکھا :

"آپ کو معلوم ہے تقریباً دو سال ہوئے میں نے ان اعتراضات کے جواب میں جو آپ نے مثنوی "اسرار خودی" پر کئے تھے' چند مضامین مسائل تصوف پر لکھے تھے جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلہ وحدت الوجود' ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے' قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق "صحو" ہے نہ "سکر" ..... بہرحال جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار "وکیل" میں کیا تھا ان کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے گو ان پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں۔ عوام بلکہ خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لئے موزوں ہیں...... اب جو مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اخبار "ستارہ صبح" میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو بوجہ ان دیرینہ تعلقات کے جو میرے اور ان کے درمیان ہیں' اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دلچسپی ہے' بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ "ستارہ صبح" کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہ نکلی اور نہ میں نے مولوی صاحب موصوف (ظفر علی خاں) کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی ہے بلکہ پرائیویٹ گفتگو میں کئی امور میں' میں نے ان سے اختلاف کیا ہے۔"(۴۶)

انہی خیالات کا اظہار حضرت علامہ نے اپنے مکتوب محررہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء بنام سرکشن پرشاد' شاد میں بھی کیا :

"تصوف پر جو مضامین انہوں (مولانا ظفر علی خاں) نے لکھے یا لکھ رہے ہیں' ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہ میں نے آج تک کوئی مضمون اس بحث پر ان کے اخبار میں لکھا نہ ان کو نہ کسی اور کو لکھنے کی تحریک کی۔ مولوی صاحب سے میرے قدیمی تعلقات ہیں۔ محض اس بنا پر بعض لوگ یہ گمان کر بیٹھے کہ مضامین میری تحریک سے لکھے جاتے ہیں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کے اکثر امور سے مجھے سخت اختلاف ہے اور کئی دفعہ مولوی صاحب سے اس بارے میں مباحثہ بھی ہو چکا ہے۔

خواجہ صاحب (خواجہ حسن نظامی) کو یہی بدظنی تھی مگر کچھ عرصہ کے بعد جب ان کی بدگمانی دور ہو گئی تو انہوں نے مجھے معذرت کا خط لکھا جس کے جواب میں میں نے انہیں مزید یقین دلایا کہ اس بحث سے میرا کوئی تعلق نہیں..... مولوی ظفر علی خاں سے میں نے بارہا کہا یہ بحث نتیجہ خیز نہیں مگر ہر آدمی اپنے خیالات کا بندہ ہے۔ میرے کہنے پر انہوں نے عمل نہیں کیا اس واسطے میں بھی خاموش رہا۔" (۴۷)

حضرت علامہ کے ایک کبوتر کا مرثیہ

حضرت علامہ کو لڑکپن ہی سے کبوتر پالنے کا شوق تھا۔ بعض اہل نقد کا خیال ہے کہ علامت "شاہین" کا اشتقاق اسی مصدر سے ہوا۔ کبوتروں سے اپنے اسی دیرینہ شغف کی بنا پر حضرت علامہ نے ایک بار مدینہ کا ایک کبوتر پالا۔ جس شخص کے لیے مدینہ کی خاک بھی آنکھ کا سرمہ ہو اسے وہاں کے کبوتر سے کتنا پیار ہو گا اس کا اندازہ اہل دل ہی کر سکتے ہیں۔ سوء اتفاق کہ وہ کبوتر ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک بلی کی مشق ستم کا نشانہ بن گیا۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے ۲۲ نومبر کو ایک تعزیتی نظم کہی۔ اس نظم کے تین شعر درج ذیل ہیں مکمل نظم "نگارستان" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

رحمت ہو تیری جان پر اے مرغ نامہ بر
آیا تھا اڑ کے ذروہ بام حرم سے تو
تجھ پر ابوہریرہؓ بھی قربان ہوں کہ تھا
وابستگان دامن فخر الامم سے تو
شاید انہی کی راہ میں تو ہو گیا نثار
گر بچ سکا نہ گربہ کی مشق ستم سے تو (۴۸)

حضرت علامہ آنریری سیکرٹری انجمن حمایت اسلام

۱۹۲۰ء میں حضرت علامہ انجمن حمایت اسلام کے آنریری سیکرٹری منتخب کیے گئے دیگر زعمائے قوم کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں بھی ان کے بطور آنریری سیکرٹری منتخب کیے جانے کے تمنائی اور حامی تھے۔ چنانچہ انجمن کی جنرل کونسل کے ایک اجلاس میں جو ۴ دسمبر ۱۹۱۹ء کی شام کو نواب سر ذوالفقار علیؒ خاں صدر انجمن کی کوٹھی میں منعقد ہوا' سابق آنریری سیکرٹری شیخ عبدالعزیز صاحب سے استعفیٰ لے کر حضرت علامہ کو ان کی جگہ آنریری سیکرٹری بنانے کا متفقہ فیصلہ کر لیا گیا۔ اس

سلسلے میں مسلمانان لاہور کا ایک جلسہ عام ۲۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا- اس جلسہ میں مولانا ظفر علی خاں نے دو قراردادیں پیش کیں جو متفقہ طور پر منظور ہوئیں- دوسری قرارداد میں کہا گیا :

"مسلمانان لاہور کا یہ جلسہ ان سنگین بدعنوانیوں کو جو انجمن حمایت اسلام کی کارفرما جماعت کے بعض افراد سے سرزد ہو کر انجمن کے اغراض و مقاصد کو خطرناک نقصان پہنچا رہی ہیں' نہایت تشویش اور اضطراب کی نظر سے دیکھتا ہے اور بدرجہ مجبوری اپنے اس آخری اختیار کو کام میں لا کر جو انجمن حمایت اسلام کی امانت کے امین اعلیٰ ہونے کے لحاظ سے اس کو حاصل ہے' انجمن کے کارفرماؤں سے مطالبہ کرتا ہے کہ عہدہ داران مجلس نظم و نسق انجمن کے انتخاب آئندہ میں حسب ذیل حضرات کو جن پر قوم کا پورا اعتماد ہے' منتخب کرے-

پریذیڈنٹ نواب ذوالفقار علی خاں

جنرل سیکرٹریان ڈاکٹر شیخ محمد اقبال' حاجی شمس الدین

صدر مجلس انتظامیہ اسلامیہ کالج میاں فضل حسین

چنانچہ اس قرارداد پر غوروخوض اور اس پر عملدرآمد کرنے کے لیے جنرل کونسل کا ایک اجلاس ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء کو نواب ذوالفقار علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ممبران کی واضح تعداد نے شرکت کی- ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کی تحریک اور دیگر ارکان کی تائید سے نواب ذوالفقار علی خاں صدر انجمن منتخب ہوئے- سردار حبیب اللہ خاں بیرسٹر نے علامہ اقبال کا نام عہدہ آنریری سیکرٹری کے لئے پیش کیا- اس تجویز کے مقابلہ میں کوئی اور تجویز پیش نہ ہوئی لہٰذا علامہ اقبال بلامقابلہ آنریری سیکرٹری منتخب ہوئے-"(۴۹)

حضرت علامہ کے اس انتخاب پر قومی حلقوں میں تہنیت اور شکر کے جذبات کا اظہار کیا گیا- مولانا ظفر علی خاں کی نظم "حمایت اسلام لاہور" غالباً اسی دور میں لکھی گئی- انجمن حمایت اسلام کے قیام اور اس کی سابقہ شوکت و عظمت کا ذکر کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں-

پھر یک بیک ہوا گئی پنجاب کی پلٹ
گردش میں آخر آ ہی گیا چرخ چنبری
رجعت پسند ہو گئے ملت کے سنگ راہ
اسلام کی اجڑ گئی کھیتی ہری بھری

سر جھک گیا حمایت اسلام کا وہاں
جھکتا جہاں تھا کفر کا اکلیل سروری
اس وقت ہم کو کوئی سلیمان چاہئے
باطل اگر ہے دیو تو ہے انجمن پری
اے قوم مژدہ ہو کہ سلیماں بھی آ گیا
باطل ہوا اجنہ کا دعوائے خود سری
جبروتیوں نے دین کا ڈنکا بجا دیا
طاغوتیوں کی اب نہ چلے گی فسوں گری
وقت آ گیا کہ ہو علم اسلام کا بلند
اقبال اس انجمن کے بنے ہیں سیکرٹری
نواب ذوالفقار علی خاں ہیں اس کے صدر
کیوں جلوہ ریز اس میں نہ ہو شان حیدری
چشمہ ابل رہا ہے محمدؐ کے نور کا
اب ہم ہیں اور اس میں ہماری شناوری(۵۰)

حمایت اسلام کا پینتیس واں جلسہ

حمایت اسلام کے پینتیسویں سالانہ اجلاس میں، جو ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو شروع ہوا، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں دونوں شریک ہوئے۔ حمایت اسلام کی ایک روداد میں لکھا ہے کہ اس اجلاس کے مقرروں اور شاعروں میں

"ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر، قاضی عبدالمجید صاحب رشید قصوری، مولوی ثناء اللہ ایڈیٹر اہلحدیث امرتسر، مولوی عبدالمجید وکیل لائل پور، خان بہادر شیخ عبدالقادر بیرسٹر، خواجہ دل محمد ایم اے پروفیسر، خان صاحب قلندر علی خاں پبلک پراسیکیوٹر جھنگ، چودھری شہاب الدین پلیڈر میونسپل کمشنر لاہور، منشی غلام قادر صاحب گرامی حیدر آباد دکن، حکیم احمد شجاع بی۔ اے اور مولوی ظفر علی خاں صاحب بی اےؔ مالک "زمیندار" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کی تقریروں نظموں سے حاضرین نے حظ وافی اور بہرہ کافی حاصل کیا۔"(۵۱)

کعبے کو پھر شریف نے بت خانہ کر دیا

شریف مکہ (۱۸۵۴-۱۹۳۱ء) نے پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کر کے اتحادیوں کی حمایت کی تھی- جس کے نتیجے میں اتحادیوں نے اسے حجاز کا اور اس کے بیٹے امیر فیصل کو شام کا حاکم بنا دیا- لیکن ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی امیر فیصل کو دمشق سے نکال دیا گیا- ادھر حجاز میں شریف حسین کی جگہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حکومت قائم ہو گئی- شریف مکہ کی سلطنت عثمانیہ سے غداری کا عالم اسلام کو بہت رنج ہوا- چنانچہ حضرت علامہ نے فرمایا :

آساں ہے اب تو ہندو و مسلم کا اتحاد
کعبے کو پھر شریف نے بت خانہ کر دیا(۵۲)

+++

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش(۵۳)

+++

کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا(۵۴)

+++

متاع قافلہ ما حجازیاں بردند
ولے زباں نہ کشائی کہ یار ما عربی است(۵۵)

اسی طرح مولانا ظفر علی خاں نے شریف مکہ کو "خانہ بر اندازان چمن" میں شمار کیا(۵٦) اور دسمبر ۱۹۲۴ء میں امرتسر کی خلافت کانفرنس میں آپ نے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ

"۱۹۱٦ء میں شریف مکہ نے بغاوت کی اور ترکوں سے علیحدگی اختیار کر کے غیر مسلم دول یورپ کے ساتھ دوستی اور محبت کے رشتے وابستہ کر لئے اور اس طرح اسلام کے منشا اور عام اسلام کی خواہشات کو بے دردی کے ساتھ پامال کر ڈالا-"(۵۷)

تقاریر اور مضامین کے علاوہ مولانا نے منظومات میں بھی شریف مکہ کو خراج تنفر پیش کیا مثلاً آپ نے لکھا :

کچھ بھی گر ہوتا شریف بے شرف کو پاس دیں
جا کے یہ کم بخت ٹکراتا خلافت ہی سے کیوں؟(۵۸)

مولانا کے اس سلسلہ افکار کی ایک نظم کا ذکر کرتے ہوئے جناب زاہد علی خاں نے آپ کا یہ شعر اپنے مقالہ میں درج کیا ہے :

شریف مکہ پر لعنت خدا کی
مسلمانوں سے ظالم نے دغا کی(۵۹)

+++

کیا انقلاب ہے کہ عرب کے شریف بھی
تہذیب مغربی کے پرستار ہو گئے
نصرانیوں سے رشتہ اخوت کا جوڑ کر
عثمانیوں سے بر سر پیکار ہو گئے
قطع رگ خلافت کبریٰ کے واسطے
برطانیہ کے ہاتھ میں تلوار ہو گئے
ناموس کعبہ بیچ کے گو فیصل اور حسین
عقبیٰ کی ذلتوں کے سزاوار ہو گئے
ثمرہ انہیں ملا یہ اضاعوا الصلوۃ کا
مغرب کی لعنتوں میں گرفتار ہو گئے(۶۰)

اقبال و ظفر اور راوی

دسمبر ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے علمی و ادبی مجلّہ "راوی" کا جوبلی نمبر شائع ہوا۔ اس دور کے مدیر راوی جناب محمد صغیر احمد ہاشمی کی خواہش تھی کہ "راوی" کے اس نمبر کے لیے حضرت علامہ کی کوئی تازہ تحریر مل جائے اور انہیں امید تھی کہ ان کی یہ خواہش پوری بھی ہو گی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"اچھلتے کودتے سر کے بل صاحب مذکور (حضرت علامہ) کی خدمت میں پہنچے۔ کس قدر حسرت ناک سانحہ تھا جب کہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارا یہ خیال ایک غلطی پر مبنی تھا۔ نہ ڈاکٹر صاحب نے کوئی وعدہ فرمایا تھا اور نہ ہم سے اس غلطی کا ازالہ ممکن تھا۔ مولانا ظفر الملت تشریف فرما تھے۔ سلسلہ گفتگو اسلام سے "راوی" پر منتقل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پچھلے چالیس سال کے تجربے نے مجھے "نہیں" کہنے کی اخلاقی و روحانی جرات عطا کی ہے۔ اگر روز دس بیس غزلیں لکھا کرتا تو آپ کو بھی

دے سکتا تھا۔ کبھی چھ یا سات مہینے میں حسن اتفاق سے کہنے کا موقع ہوتا ہے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے دستی نسخہ کی التجا کی۔ فرماتے ہیں کہ آپ بت پرستی کیوں سکھاتے ہیں۔ دوسرے میں کاہل بست ہوں چنانچہ آج تک اپنا کلام اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔ مجھے قوت حافظہ پر زور دینا پڑتا ہے..... پروفیسر نکلسن نے پیام مشرق کے چند ترجمے بڑے پایہ کے کئے ہیں آپ ان کو استعمال میں لا سکتے ہیں۔ غرضیکہ بعد عنایت صفحہ جمیلہ پر ڈاکٹر اقبال دستخط کرنے پر راضی ہو گئے۔ "راوی" کا ذکر تو تھا ہی۔ حقہ کا دور چل رہا تھا۔ فی البدیہہ اشعار ہونے لگے۔ مولانا ظفر علی خاں کی طبیعت موزوں تھی۔ دو شعر یاد ہیں۔

یہ کہتی ہے اٹھ اٹھ کے ہر موج راوی
مسلمان و ہندو کا حق ہے مساوی
مسلمان فارغ ہے فکر وطن سے
ہے اک اس کے نزدیک ہندی و جاوی(۶۱)

اقبال کی گائے، دودھوں نہائے

جنوری ۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال کی گائے نے بچھڑا دیا اور مولانا کے گھر اس کی کھیس پہنچی۔ انہی دنوں شیخ عبدالقادر صاحب پنجاب کونسل کے صدارتی انتخاب میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے ۳۲ ووٹوں کے مقابلے میں ۴۱ ووٹ حاصل کر کے کونسل کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ اس پر مولانا ظفر علیخاں نے "علامہ اقبال کی گائے اور پنجاب کونسل کی صدارت" کے زیر عنوان لکھا:

"آج بروز جمعۃ المبارک حضرت علامہ اقبال کی گائے نے بچھڑا دیا اور آپ کے "آقائے نامدار" اعنی میاں علی بخش صاحب جو مدتوں سے آپ کے شریک رنج و راحت چلے آتے ہیں ایک نہایت دیدہ زیب تشت میں گائے کی کھیس بھر کر اس پر اوراق نقرئی لگا کر، پستہ کی ہوائیاں چھڑک کر دفتر زمیندار میں لائے۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی محب عزیز و محترم کی طرف سے کوئی ایسا تحفہ پہنچے تو لانے والے کو انعام دیا جاتا ہے۔ ہم بے سرو سامانوں سے اور تو کیا ہو سکتا، چند اشعار بطور ارمغان محتر میاں علی بخش صاحب کی خدمت میں حاضر ہیں۔ وہ انہیں قبول فرمائیں اور اگر مناسب سمجھیں تو حضرت علامہ کی جناب میں بھی انہیں گنگنا دیں۔

جو اپنی میٹھی کھیس "زمیندار" کو کھلائے
دودھوں نہائے ڈاکٹر اقبال کی وہ گائے
فرہاد لا سکا نہ جسے کوہسار سے
وہ جوئے شیر وادی پنجاب میں بہائے
ہو ناظرین کے لیے سرمایہ سرور
صفراء لونما کی جھلک ہند کو دکھائے
سر لاجپت دھنیں تو کریں رقص مالوی
گوسالہ اس کا وجد میں ہر سامری کو لائے
ڈکرائے مال روڈ پہ جاِ کر علی الصباح
اور نغمہ اتحاد کا لاہور کو سنائے
تھن منہ سے گر لگائے تو امرت برس پڑے
موتی جھڑیں اگر وہ کہیں کان پھڑپھڑائے
چلا رہے ہیں لالہ کہ گوسالہ ہے یہ نحس
کونسل کا صدر آتے ہی جو شیخ کو بنائے"(۶۲)

حضرت علامہ دفتر زمیندار میں

جناب اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی اقبالی بھی تھے اور ظفر علی خانی بھی۔ وہ ان دونوں حضرات کی ایک دلچسپ ملاقات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں :

"جب میں ۱۹۲۵ء میں اردو مرکز لاہور سے وابستہ ہوا تو فرصت کا وقت دفتر زمیندار میں گزرتا تھا۔ وہاں علامہ کبھی کبھی مولانا ظفر علی خاں سے ملنے کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے کمرے میں زمیندار کا ایک ۱۹۱۱ء کا فائل تلاش کر رہا تھا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ یکایک علامہ تشریف لے آئے۔ میں کمرے کے ایک کونے میں فائلوں کے ایک اونچے ڈھیر کے پاس کھڑا فائل دیکھ رہا تھا۔ میں کچھ گھبرایا۔ لیکن جرات کر کے سلام عرض کر دیا۔ علامہ نے سلام کے جواب کے بعد پنجابی میں فرمایا "مولانا نوں کتھے لکو رکھیا اے۔" میں نے پنجابی میں عرض کیا کہ وہ ابھی اٹھ کر ایک لالہ جی کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ علامہ نے فرمایا "ایہہ لال ٹوپی تاں پئی ہوئی اے۔" یہ مولانا کی ترکی ٹوپی کی

طرف اشارہ تھا جو میز پر پڑی تھی- میں نے عرض کیا کہ شاید ننگے سر ہی چلے گئے ہیں (اس زمانے میں شرفا کا ننگے سر بازار میں نکلنا معیوب تھا) علامہ یہ سن کر بیٹھ گئے شاید یہ خیال کیا کہ چونکہ ننگے سر گئے ہیں تو دور نہیں گئے- اتنے میں مولانا اختر علی آ گئے- علامہ کو دیکھ کر سلام عرض کیا اور کڑک کر بابو مولا داد (مینجر زمیندار) کو آواز دی کہ علامہ کو حقہ پیش کرو- ادھر بابو مولا داد نے حقہ بھیجا اور ادھر کھٹ سے مولانا ظفر علی خاں نے کمرے میں قدم رکھا اور علامہ کے پاس بیٹھ گئے- اس دن میں نے پہلی بار آفتاب و ماہتاب کو ایک برج میں جلوہ آرا دیکھا اور علامہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا- اس اثنا میں میں نے فائل تو تلاش کر لیا تھا لیکن فائل لے کر وہیں بیٹھا اس کی ورق گردانی کرتا رہا- میرے کان ان بزرگوں کی باتوں کی طرف تھے جو قومی اور سیاسی امور کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے-"(۶۳)

اقبال و ظفر پر کفر کے فتوے

جناب دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان لاہور بڑے متشدد مولوی تھے- سید نذیر نیازی ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

"مولانا دیدار علی مرحوم بہت بڑے مکفر تھے- ان کی تکفیر سے شاید ہی کوئی شخص بچا ہو- اقبال کافر' ظفر علی کافر' کچلو کافر-"(۶۴)

حضرت علامہ کے خلاف مولوی دیدار علی کے فتوے کی تفصیل مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب ذکر اقبال میں موجود ہے- یہ فتوئ اقبال کی نظم آفتاب (مشمولہ بانگ درا) اور چند متفرق اشعار کی بنیاد پر دیا گیا تھا- اس فتوے پر تبصرہ کرتے ہوئے سالک صاحب لکھتے ہیں :

"اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا- مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی- مولانا سید سلیمان ندوی نے "زمیندار" میں اس جاہلانہ فتوے کی چتھاڑ کر دی..... مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا کیونکہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی' قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان' عاشق رسول' درد مند ملت' حامی دین اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟"(۶۵)

قریب قریب اسی زمانہ (۱۹۲۵ء) میں ڈاکٹر کچلو اور مولانا ظفر علی خاں بھی مولوی دیدار علی

صاحب کے ذوق تکفیر کے نشانہ مشق بنے۔ انہی دنوں سلطان ابن مسعود کی مخالفت کرنے کے لئے "حزب الاحناف" بھی قائم کیا گیا تھا۔ مولوی محمد دین اس کے بانی و معتمد اور مولوی دیدار علی اس کے صدر تھے۔ تکفیر کی گرم بازاری کے سلسلہ میں حزب الاحناف "گراں قدر خدمات" سر انجام دے رہا تھا۔ مولانا ظفر علیخاں کے خلاف فتوئ مولانا کے درج ذیل اشعار کی بنیاد پر دیا گیا:

یہ سچ ہے اس پہ خدا کا چلا نہیں قابو
مگر ہم اس بت کافر کو رام کر لیں گے
بجائے کعبہ خدا آج کل ہے لندن میں
وہیں پہنچ کے ہم اس سے کلام کر لیں گے
جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی
خدا خدا نہ سہی، رام رام کر لیں گے(۶۴)

یہ اشعار مولانا کی نظم "جگر پارے" کے ہیں جو اب "بہارستان" میں شامل ہے۔ مولانا کے خلاف یہ فتوائے کفر ایک کتابچہ موسوم بہ القسورہ علی دوار الحمر الکفرہ علی ظفر رمتہ من کفر کی صورت میں ۱۳۴۳ھ (مطابق ۱۹۲۵ء) میں شائع ہوا تھا۔ شورش کاشمیری فرماتے ہیں:

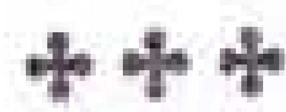
"ڈاکٹر کچلو اور علامہ اقبال تو کفر کی سند حاصل کرنے کے بعد خاموش رہے لیکن ظفر علی خاں کو خاموش کون کر سکتا تھا۔ وہ مرد مجاہد تنہا بدعتی محاذ سے ٹکرا گیا اور نظم و نثر اور تقریر و تحریر سے بدعتیوں کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ بریلوی کفر سازوں نے ظفر علی خاں کے مقابلہ میں آنے کے بجائے خفیہ طریقوں سے خطوط کے ذریعے انہیں قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔"(۶۷)

مولانا ظفر علی خاں نے مولوی دیدار علی، مولانا حامد رضا خان اور دیگر کافر گر مولویوں کے خلاف بہت تند و تیز نظمیں کہیں۔ مختلف نظموں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

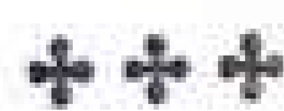
لگ گیا ہاتھ کہیں سے مجھے ان کا فتوئ
دست توحید ہے اور شرک جلی کی داڑھی
پیٹ میں اپنی درازی کو چھپا لیتی ہے
نوربافان بریلی کی تلی کی داڑھی
پال کے آم کی چوسی ہوئی گٹھلی کا ہے صوف
یا کہ ہے قبلۂ دیدار علی کی داڑھی(۶۸)



اوڑھ کر حامد رضا خاں آئے بدعت کا لحاف
ذات ان کی ہے مجدد بات ان کی لام کاف
مانچسٹر کے کفن سازوں سے یہ لایا ہے ادھار
شرک کی انٹی بریلی کا یہ بڈھا نورباف
بیچ میں کھٹمل بھرا گودڑ ہے پھیلایا ہوا
گرچہ آتا ہے نظر اجلا "رضائی" کا غلاف
جب سے پھوٹی ہے بریلی سے کرن تکفیر کی
دید کے قابل ہے اس کا انعکاس و انعطاف
سید احمد خاں پہ سب و شتم کی بارش کہیں
اور کہیں علامہ شبلی کو گالی واشگاف
زندگی اس کی ہے ملت کے لیے پیغام موت
کر رہا ہو جو بجائے کعبہ قبروں کا طواف(۶۹)



کوئی ترکی لے گیا اور کوئی ایراں لے گیا
کوئی دامن لے گیا کوئی گریباں لے گیا
رہ گیا تھا نام باقی اک فقط اسلام کا
وہ بھی ہم سے چھین کر حامد رضا خاں لے گیا(۷۰)



کہی پھبتی بریلی پر یہ کل اک دیوبندی نے
کہ سر میں تیل ڈالا ہے چھچھوندر نے چنبیلی کا
یہ رکھ کر ناک پر انگلی کہا دیدار بانو نے
کہ ہے لاہور میں اب کون ساتھی مجھ اکیلی کا
محمدؐ کے غلاموں پر ہو جاری کفر کا فتویٰ
شریعت کو ہے مشکل بوجھنا آج اس پہیلی کا(۷۱)

اس معرکے میں متعدد ارباب علم و ادب نے مولانا ظفر علی خاں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ میر ولی اللہ نے بھی "حزب الاحناف" کے نام سے ایک نظم کہی جو ان کے مجموعہ کلام "گلبانگ" میں شامل ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دے کے مسلم پہ کفر کا فتویٰ　　آبگینہ ہوا مقابل سنگ
سچ جو پوچھو تو دور ہیں یہ لوگ　　دین اسلام سے کئی فرسنگ
کہتے ہیں اپنے آپ کو احناف　　نام کافور ہے وطن ہے زنگ
بوحنیفہؒ سے ان کو کیا نسبت　　وہ عقاب اور یہ کلاغ و کلنگ
آپ مومن ہیں اور ظفر کافر　　تف بریں عقل و دانش و فرہنگ(۷۲)

لیکن تکفیر و تفسیق کی بدمذاقی سے قطع نظر لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کے متذکرہ بالا متنازع شعر کے مفہوم سے مولانا کے بھائی مولانا حامد علی خاں کو بھی اختلاف تھا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے راقم کو بتایا کہ "مولانا ظفر علی خاں سے انتہائی محبت و عقیدت کے باوجود میں نے بعض اوقات ان سے مودبانہ اختلاف کی ضرورت بھی محسوس کی مثلاً ۱۹۲۰ء میں انہوں نے ایک نظم کہی جو اب "جگر پارے" کے عنوان سے بہارستان کی زینت ہے اس میں ایک شعر یہ ہے :

جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی
خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

مجھے اس شعر سے اختلاف ہوا۔ خود مولانا ظفر علی خاں کا بھی نظریہ وہ نہیں تھا جو اس شعر سے جھلک رہا ہے۔ خدا جانے کس طرح یہ شعر ان کی نوک قلم سے ٹپک گیا۔ بہرحال میں نے اس کے جواب میں لکھا :

نہ رہے گا کچھ جہاں میں نہ رہے اگر مسلماں
جو خدا خدا نہیں ہے تو یہ رام رام کیا ہے؟"(۷۳)

ہمارا خیال یہ ہے کہ مولانا کے ان اشعار میں دراصل انگریزوں کے حامیوں اور موقع پرستوں پر چوٹ کی گئی ہے۔

اقبال اور عدالت عالیہ کی ججی

جناب عبدالمجید سالک لکھتے ہیں :

"جب ۱۹۲۵ء میں سر شادی لال (پنجاب ہائی کورٹ کے) چیف جج تھے، ایک مسلمان جج کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا اور صوبے کی اسلامی انجمنوں، وکیلوں، اخباروں اور عام تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ "ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے، پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لاء کو ان کی بے نظیر قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج

مقرر کیا جائے" تو انہی سر شادی لال نے علامہ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی "ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔" چنانچہ علامہ جج نہ ہو سکے اور ان کی جگہ یو۔ پی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا۔" (۲۷)

پنجاب ہائی کورٹ کی اسلام دشمن پالیسیوں اور سر شادی لال کی سنگٹھنی ذہنیت کے خلاف مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے کئی اداریوں میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ایک جگہ وہ برطانوی قانون کی ستم سامانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ وہ قانون ہے جس نے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ بخشی ٹیک چند جو عدالت ہائے تحتانی میں راج پال (وہ لعین جو ناپاک کتاب "رنگیلا رسول" کا پبلشر اور ناشر تھا) کی پرجوش وکالت کا پورا پورا حق ادا کر کے ہندو بھائی طبقوں میں سنگٹھن کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے ہیں، جناب لالہ شادی لال صاحب کی کوششوں سے بیک کشش قلم عدالت عالیہ کے مستقل جج بنا دیئے گئے ہیں اور یہ گمان غالب ہے کہ جناب لالہ صاحب کے جانشین ہوں گے۔ یہ وہ قانون ہے جس نے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ عدالت عالیہ کے ارکان میں اکثریت ہندوؤں کی ہو جائے اور اس عدالت کا سارا عملہ ماتحت بھی ہندو ہی ہو۔ یہ وہ قانون ہے جس نے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ سر عبدالقادر پر .... "نالائقی" کی علت میں ہمیشہ کے لئے عدالت عالیہ کی رکنیت کا دروازہ بند کر دیا جائے اور سر محمد اقبال کو بھی شاعر ہونے کی پاداش میں قانون دانی سے بے بہرہ اور فیصلہ نویسی کی استعداد سے عاری قرار دے کر اسی سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ یہ وہ قانون ہے جس کو پنجاب بھر میں کوئی بیرسٹر اور وکیل ایسا نظر نہیں آتا جس میں جناب لالہ شادی لال صاحب کی ہم نشینی کا سلیقہ ہو اور اس لئے وہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے کبھی سید عبدالرؤف کو دعوت دیتا ہے اور کبھی مسٹر آغا حیدر کو۔ یہی خرابیاں ہیں جنہوں نے اس ہائی کورٹ کو برطانوی ہائی کورٹ کے بجائے ایک اچھی خاصی ہندو ہائی کورٹ بنا رکھا ہے..... پھر بھی عدالت عالیہ میں اسلام کی نمائندگی ضروری تھی اور لالہ شادی لال جی کے مصالح کے پہلو میں کسی نہ کسی ایسے شخص کا براجمان ہونا ناگزیر تھا جو کام کا نہ سہی نام کا مسلمان تو ہو۔ اسلامی پنجاب کی قانونی نالائقی پر ابدالاباد تک لالہ جی کے ہاتھ سے مہر توثیق ثبت ہو چکی تھی اس لئے آپ کی نظر انتخاب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی طرف اٹھ کر

اپنے ڈھب کے' ایک بزرگ مسٹر آغا حیدر پر پڑی اور آج یہ مقدس بزرگ عدالت عالیہ میں مسلمانوں کے مفاد کی نگہداشت پر مامور ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ اس نگہداشت کے فرض سے آپ کس طرح سبکدوش ہو رہے ہیں۔"(۷۵)

اسی سلسلے میں "مسلم اوٹ لک کا پیغام" کے عنوان سے بہارستان (ص ۵۱۶) میں درج ذیل اشعار ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

عالموں اور صوفیوں کا سیزدہ صد سالہ فرض
دے رہا ہے آج کل انجام "مسلم اوٹ لک"
کہہ رہا ہے سجدہ کرنا ہے تو کر اللہ کو
پر کسی حالت میں شادی لال کے آگے نہ جھک
تیرے آگے ہے رسول اللہ کا نقش قدم
امر بالمعروف سے اور نہی منکر سے نہ رک

مجلس قانون ساز پنجاب کا انتخاب

۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو حضرت علامہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس انتخاب میں ملک محمد دین بیرسٹر حضرت علامہ کے مدمقابل تھے۔ سر محمد شفیع' محرم علی چشتی' نواب ذوالفقار علی خان آف مالیر کوٹلہ ملک محمد دین کی حمایت کر رہے تھے جب کہ ملک میراں بخش گکے زئی' مولانا ظفر علی خاں' غلام مصطفیٰ حیرت اور لال دین قیصر حضرت علامہ کے حامی تھے۔(۷۶)

سید سلیمان ندوی لاہور میں

سید سلیمان ندویؒ ۱۹۲۷ء میں جلسہ انجمن حمایت اسلام میں شریک ہونے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ یہ جلسہ ۱۵ تا ۱۷ اپریل ۱۹۲۷ء اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ سید صاحب کے ورود مسعود سے لاہور کی علمی و ادبی فضا کی رعنائی و زیبائی مضاعف ہو گئی۔ جگہ جگہ محفلیں اور دعوتیں ہوئیں جن میں حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں بھی اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ شریک ہوئے۔ ان محفلوں اور دعوتوں کی کچھ جھلکیاں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی دکھاتے ہیں :

"اسی (۱۵ اپریل کی) شب سید صاحب کی علامہ اقبال کے مکان پر دعوت تھی۔ اس دعوت میں چودھری محمد حسین' مولانا ظفر علی خاں' راقم الحروف' خواجہ سلیم'

مولانا غلام رسول مہر، محمد دین تاثیر اور مولانا عبدالمجید سالک شریک ہوئے تھے۔ یہ دعوت بہت ہی پر تکلف اور کامیاب تھی۔ کافی دیر تک علمی مذاکرہ ہوتا رہا۔ چنانچہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تالیف "تذکرہ" کا ذکر، بحث مکان و زمان اور شعر و شاعری پر بات چیت ہوتی رہی۔ چودھری محمد حسین مرحوم نے بعض نئے مسائل پر گفتگو کی اور پنجاب کی علمی سرگرمیوں کو سراہا گیا۔ آخر میں امام فخر الدین رازی کی کتاب "مباحث شرقیہ" پر اس علمی مجلس کا اختتام ہوا اور ہم سید سلیمان صاحب اور مولانا ظفر علی خاں کو علامہ اقبال کی موٹر میں ان کے مکان پر چھوڑ کر واپس ہوئے۔"(۷۷)

دعوتوں کے اسی تسلسل میں ۱۷ اپریل کو ایک دعوت خواجہ سلیم سابق پروفیسر انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کے مکان پر منعقد ہوئی جس میں سید صاحب اور دیگر اکابر کے علاوہ حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں بھی شریک ہوئے۔ اس زمانے میں حضرات مہر و سالک، زمیندار سے الگ ہو چکے تھے اور ان کا روزنامہ "انقلاب" ۸۔ اپریل سے شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر خواجہ سلیم کے ہاں جو دلچسپ گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی زبانی سنیں :

"مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ اخبار "زمیندار" میں "افکار و حوادث" کے عنوان سے لطائف و حقائق لکھے جاتے تھے جو عام طور پر سالک لکھتے تھے۔ وہ اس عنوان کو اپنے نئے اخبار "انقلاب" میں اختیار کر چکے ہیں۔ تاہم زمیندار میں بھی یہی رسم و روایت کسی اور عنوان سے جاری رہنی چاہیے۔ مہر و سالک اور علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ سب نے اس بحث میں حصہ لیا اور اس موضوع پر لطائف بھی ہوئے۔ آخر میں سید سلیمان ندوی نے ممالک اسلامیہ کے بعض اخبارات اور سب سے بڑھ کر موضوع کو مدنظر رکھ کر ایک عنوان "فکاہات" تجویز کیا جو زمیندار میں آخر تک قائم رہا۔

ضعیف راویوں پر گفتگو ہو رہی تھی کہ علامہ (اقبال) نے بطور تفنن کہا کہ ہمارا راوی (دریائے راوی) بھی اب بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ پھر لطیفہ و لطائف کے ضمن میں سید عبداللہ نے ملا علی بن حسین واعظ کاشفی کی کتاب "لطائف الطوائف" کا ذکر کیا جس پر علامہ نے "لطائف الطوائف" کے الفاظ کو ذومعنی بنا دیا اور کہا کہ ملا کاشفی کو کیا خبر کہ "الطوائف" کیا شے ہے؟ اس پر احباب میں خوب قہقہے لگے۔ یہ پرلطف محفل کھانے کے بعد دیر تک جمی رہی اور اس کے چرچے احباب میں دیر تک رہے۔"(۷۸)

مئی ۲۷ کا ہنگامہ لاہور

تین اور چار مئی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس واقعے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جناب محمد افضل رفیق لکھتے ہیں :

"تحریک خلافت اور ترک موالات کے دوران (میں) ہندو مسلم اتحاد کا مثالی نمونہ منظر عام پر آیا۔ لیکن ان تحریکوں کی ناکامی کے ساتھ فرقہ وارانہ تعصب اور فسادات کا تمام ہندوستان میں ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا..... لاہور میں ۳ مئی ۱۹۲۷ء کو ہندوؤں اور سکھوں کی ایک کثیر تعداد باؤلی صاحب ڈبی بازار میں جمع ہوئی جہاں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ایک مسلمان نے ایک سکھ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا۔ مشتعل ہجوم حویلی کابلی مل میں داخل ہوا اور مسلمانوں پر کرپانوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ اس واقعہ سے سارے شہر میں فساد شروع ہو گیا۔ دوکانیں اور دوسرے کاروبار معطل ہو گئے..... ان فسادات کے دوران (میں) علامہ صاحب مصالحت کرانے اور مظلومین کی امداد میں پیش پیش رہے۔"(۷۹)

ان ہنگاموں کے سلسلے میں انگریزی روزنامہ "ٹریبیون" کے نامہ نگار خصوصی نے حضرت علامہ سے ایک انٹرویو کیا تھا جس کی تفصیلات بعد میں ۱۲ مئی ۱۹۲۷ء کو روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوئی تھیں۔ اس انٹرویو میں حضرت علامہ نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ ۴ مئی کو

"میں نے زمیندار میں پڑھا کہ شام کے پانچ چھے بجے جلسہ عام منعقد ہو گا۔ میں نے "مسلم آؤٹ لک" کے دفتر سے مولانا ظفر علی خاں کو ٹیلی فون کیا اور ان سے کہا کہ جلسہ ہرگز منعقد نہیں ہونا چاہئے چنانچہ انہوں نے میری بات مان لی....... اس کے بعد میں اپنے مکان پر واپس آ گیا۔ یہاں پنڈت سنتانم اور سردار سردول سنگھ کویشر تشریف فرما تھے۔ دونوں حضرات مجھے ملنے آئے تھے۔ کوئی ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ ہم ابھی صورت حالات پر بحث و تمحیص کر رہے تھے کہ خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب تشریف لائے آپ نے فرمایا کہ جنازوں کے ساتھ ماتمی جلوس تیار ہے اور مقتدر اور بااثر مسلمانوں کو ماتمی جلوس میں ضرور شامل ہونا چاہئے تاکہ مجمع کو قابو میں رکھ سکیں۔ میں اور خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب موچی دروازہ کے نزدیک ماتمی جلوس میں شامل ہو گئے۔"(۸۰)

اس ہنگامہ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے جنازوں کو ماتمی جلوس کے ساتھ یونیورسٹی

گراؤنڈ لے جایا گیا جہاں نماز جنازہ ادا کی گئی- اس جلوس اور نماز جنازہ کی روداد جو ۴ مئی ہی کو لکھی گئی تھی' ۶ مئی کے زمیندار میں شائع ہوئی تھی- ۵ مئی کا زمیندار ضبط ہو گیا تھا- روداد ملاحظہ ہو :

"لاہور- ۴ مئی (۴ بج کر ۲۸ منٹ شام) اس وقت شہر میں ہڑتال ہے- دلی دروازہ' چوک وزیر خاں' ڈبی بازار' کسیرہ بازار' بزاز ہٹہ' لوہاری منڈی' چوک جھنڈا میں دکانیں بند ہیں- مسلمان گروہ در گروہ شہر میں ادھر ادھر منڈلا رہے ہیں اور جوش و خروش کا اظہار ہو رہا ہے- آج ایک بجے میوہسپتال سے مسلمان شہیدوں کی لاشیں ان کے ورثا کے سپرد کی گئیں..... جس وقت تینوں جنازے حویلی کابلی مل سے نکلے ہیں تو منظر نہایت رقت انگیز تھا...... جنازوں کے ساتھ کوئی ستر' اسی ہزار بندگان خدا کا ہجوم تھا- جنازے کے ہمراہ حضرت مولانا ظفر علی خاں تھے جو سب سے پہلے جنازے کو کندھا دیئے تشریف لے جا رہے تھے- ان کے علاوہ میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لاء' سر محمد اقبال' شیخ عبدالقادر' مولوی غلام محی الدین قصوری' آنریبل سر محمد شفیع وغیرہ اصحاب بھی ہمراہ تھے- جلوس سرکلر روڈ انارکلی سے گذر کر سیدھا یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا- جلوس نہایت خاموشی سے گزر رہا تھا جس وقت جنازے سیتلا مندر کے قریب پہنچے تو ان پر ساتھ کے مکان سے پتھر پھینکے گئے- اس پر مسلمان مشتعل ہوئے لیکن حضرت مولانا ظفر علی خاں نے ان کے جوش و خروش کو فرو کیا.... (راستے میں بار بار سنگ باری ہوتی رہی حتیٰ کہ میاں عبدالعزیز اور حضرت علامہ اقبال نے جا کر ایک مفسد ہندو کو گرفتار کرایا- تلخیص) .... بعد ازاں جنازے یونیورسٹی گراؤنڈ میں پہنچا دیئے گئے.....مولانا غلام مرشد نے نماز جنازہ پڑھائی اور فرمایا کہ چونکہ تینوں مسلمان شہید ہیں اس لئے ان کے جنازے علیحدہ علیحدہ پڑھنے چاہئیں- تمہید کے طور پر آپ نے فرمایا کہ جنگ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے- حضورؐ سرور کائنات نے شہداء کے جنازوں کی علیحدہ علیحدہ نماز پڑھائی تھی اس لئے اس سیزدہ صد سالہ سنت کو میں آج پھر پورا کرتا ہوں- نماز جنازہ کے بعد علامہ اقبال اور سر محمد شفیع نے صبر و سکون کی تلقین فرمائی اور مسلمانوں نے جس عالی حوصلگی سے شہر میں امن و امان قائم رکھا' اس کے لئے انہیں مبارکباد دی-"(۸۱)

اس واقعہ پر مولانا ظفر علی خاں نے ۶ مئی کے "زمیندار" میں اداریہ میں لکھا :

"فسادات کا اصلی سبب آریہ سماج کی جنگجویانہ اور مصاف آرایانہ روش ہے-

دھرم کا گھونگٹ منہ پر ڈال کر اس نے اپنا (نیم سیاسی) جال ملک کے کونہ کونہ میں بچھا رکھا ہے اور فرقہ وار فسادات کی تہ میں اس کی اشتعال انگیزیاں صاف چھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔"(۸۲)

راجپال ملعون

ایک متعصب اور اسلام دشمن ہندو ناشر راجپال مردود نے غالباً ۱۹۲۵ء میں رسوائے عالم کتاب "رنگیلا رسول" شائع کی تھی۔ اس کتاب کے مصنف کا نام مخفی رکھا گیا تھا۔ سید نور احمد نے لکھا ہے:

"رنگیلا رسول' کتاب کا اصل مصنف کون تھا' اس کے متعلق قیاس آرائیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں دو نام لئے جاتے رہے جن میں ایک ڈی اے وی کالج کے پروفیسر چمپاپتی کا تھا اور دوسرا "پرتاپ" اخبار کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن کا' جس کے راجپال کے ساتھ کاروباری تعلقات بھی تھے اور دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ لیکن غالب قیاس پروفیسر چمپاپتی ہی کے متعلق تھا۔"(۸۳)

جب مسلمانوں کو اس دل آزار کتاب کے مندرجات کی خبر پہنچی تو انہوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ یہ کتاب ضبط ہو گئی اور حکومت نے راجپال کے خلاف مقدمہ چلایا۔ دو اڑھائی سال کے بعد جون ۱۹۲۷ء میں اس مقدمہ کے بارے میں ہائی کورٹ کے ایک متعصب جج کنور دلیپ سنگھ نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا اور راجپال کو بری کر دیا۔ اس پر ۵ جون ۱۹۲۷ء کے روزنامہ "زمیندار" لاہور کے اداریہ میں لکھا گیا:

"رنگیلا رسول کے ناشر مسمی راجپال کو عدالت عالیہ لاہور نے عدالت ابتدائی اور عدالت سیشن کے فیصلوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اور سات کروڑ مسلمانان ہند کے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے بری کر دیا۔ برطانوی انصاف کے ہاتھوں اسلام کی یہ رسوائی اور قانون کی یہ بے بسی ایسی ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے..... ابتدائی عدالت نے راج پال کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی۔ سیشن جج نے بھی اسے بحال رکھا مگر جسٹس دلیپ سنگھ نے اسے بری کر دیا...... بہرحال یہ فیصلہ ہر پہلو سے ایسا ہے کہ مسلمان اسے پڑھیں اور بہ نظر غور پڑھیں۔ اس کے نتائج و عواقب پر حکومت کو توجہ دلائیں۔ اس کے خلاف ہر جگہ جلسے کر کے حکومت کو مجبور کر دیں کہ اگر یہ فیصلہ غلط ہے تو وہ اس کی ترمیم پر متوجہ ہو اور اگر واقعی مسٹر

جسٹس دلیپ سنگھ کے خیال کے مطابق کوئی قانون ایسا موجود نہیں جس سے اس فتنہ کا سدباب ہو سکے تو حکومت کا فرض اولین یہ ہے کہ فوراً ایسے قانون کی تدوین و نفاذ عمل میں لائے۔ کیونکہ اگر مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ کا نظریہ صحیح قرار پایا اور کوئی ایسا قانون وضع نہ ہوا تو معلوم نہیں کہ ستیارتھ پرکاش کی تعلیم کتنے راجپال پیدا کرے اور کتنی تصانیف اس قسم کی بر روئے کار آئیں۔ اگر مسلمانان ہند اس فیصلہ کے خلاف جس سے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی حد درجہ کی توہین متصور ہے، احتجاج کرنے میں تساہل سے کام لیں گے تو وہ یقیناً قیامت میں رسولؐ اللہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

حضرت علامہ اقبال بھی اس موقع پر حمیت اسلامی کا اظہار کرنے کے لیے ایجی ٹیشن کے حامی تھے۔ گفتار اقبال کے مرتب لکھتے ہیں :

"۶ جولائی ۱۹۲۷ء کے "پرتاپ" میں "ڈاکٹر اقبال کا اعلان" کے عنوان سے ایک نوٹ میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس ایجی ٹیشن سے کوئی ہمدردی نہیں جو "مسلم آؤٹ لک" وغیرہ کتاب "رنگیلا رسول" کے متعلق کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے استفسار پر درج ذیل بیان دیا جو انقلاب بابت ۷ جولائی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔" حضرت علامہ کا بیان یہ تھا :

"پرتاپ کے اس اعلان کو دیکھ کر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کا کوئی پرائیویٹ یا پبلک اعلان نہیں کیا۔ نہ کسی آدمی نے مجھ سے آج تک اس ایجی ٹیشن کے متعلق میری رائے دریافت کی۔ اخبار "پرتاپ" میں جو کچھ چھپا ہے، کھلی ہوئی افترا پردازی ہے۔ مسلمان اس ایجی ٹیشن سے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی عزت کا تحفظ چاہتے ہیں اس سعی و کوشش پر مجھے نہ صرف ان سے ہمدردی ہے بلکہ میں ان کو بالکل حق بجانب جانتا ہوں اور اس معاملہ میں کسی قسم کا تساہل روا رکھنے والے کو شقی ازلی تصور کرتا ہوں۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ "مسلم آؤٹ لک" کے مضمون "مستعفی ہو جاؤ" کی اشاعت سے پہلے مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ بانیان مذاہب کی توہین کا سدباب کرنے کے لئے میں ایک قرارداد بھی کونسل کے آئندہ اجلاس میں پیش کرنے والا ہوں۔" (۸۴)

اسلام آزار لٹریچر چھاپنے پر حکومت کی نرم پالیسی کو ایمائے تائید سمجھ کر راجپال نے مارچ یا اپریل ۲۷ء میں ایک اور متعصبانہ اور مفسدانہ کتاب "بلیدان چتراولی" کے نام سے شائع کر

دی۔ اس کتاب میں من گھڑت اطلاعوں اور جعلی تصویروں کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے دشمن ہیں اور بیشتر ہندو اور سکھ زعما کے قتل میں مسلمان ہی مجرم ہوتے ہیں اس لئے ہندوؤں اور سکھوں کو مل کر مسلمانوں کی بیخ کنی کرنی چاہئے۔ اس فساد انگیز کتاب کے خلاف بھی زمیندار نے اپنی کئی اشاعتوں میں اداریے اور شذرے لکھ کر صدائے احتجاج بلند کی اور مسلمانان برعظیم کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔

اسی طرح امرتسر سے نکلنے والے ایک رسالے "ورتمان" بابت ماہ مئی ۱۹۲۷ء میں "سیر دوزخ" کے عنوان سے ایک قابل نفریں مضمون چھاپ کر آقائے ہرجہان کے خلاف دریدہ دہنی کی گئی اور ناپاک لفظوں کے چھروں سے مسلمانوں کے سینے چھیدے گئے۔ مسلمان ان واقعات پر سراپا احتجاج تھے۔

شاہی مسجد میں اقبال کی تقریر

رسالہ "ورتمان" کا مقدمہ امرتسر کی عدالت ضلع سے خود حکومت کی درخواست پر عدالت عالیہ میں منتقل کر دیا گیا۔ "اس مرتبہ مقدمہ کی سماعت واحد جج کے بجائے ڈویژن بنچ کے سپرد کر دی گئی۔ تاکہ قانون کی زیادہ مستند تشریح ہو جائے۔ ڈویژن بنچ کے صدر جسٹس براڈوے تھے۔" (۸۵) اس صورت حال کے پیش نظر بعض اکابر مسلمان بشمول حضرت علامہ، کسی فوری اقدام کے بجائے تھوڑا سا اور صبر کرنے کے حق میں تھے چنانچہ "۱۰ جولائی ۱۹۲۷ء کو مسلمانان لاہور کا ایک جلسہ مجلس خلافت لاہور کے زیر اہتمام تحریک سول نافرمانی کے التوا کے سلسلے میں شاہی مسجد میں منعقد ہوا...... مولانا عبداللہ قصوری صدر جلسہ قرار پائے۔" اس جلسہ میں پہلی تقریر حضرت علامہ نے کی۔ آپ نے فرمایا :

"ورتمان کا مقدمہ امرتسر کی عدالت ضلع سے عدالت عالیہ میں منتقل ہو چکا ہے اور جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے، حکومت کوئی رویہ اختیار نہیں کر سکتی۔ یہ درست ہے کہ جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلہ کے بعد دو تین مثالیں ایسی ہوئیں جن سے یہ ثابت ہوا کہ دریدہ دہنوں کو بے لگام ہو جانے کی جرات ہو گئی ہے۔ پچھلے دنوں یہاں کے "پرتاب" اخبار نے ایک شرمناک مضمون لکھا۔ پھر دہلی کے ایک آریہ نے "سورہ مثل القرآن" لکھ کر شائع کی۔ یہ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ اعدائے اسلام اسی قسم کا اور مصالحہ بھی تیار کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جب تک معین صورت نہ نکل آئے، ان حرکات مذمومہ کا سدباب کرنے کے لئے

حکومت جلد از جلد کوئی کارروائی کرے۔ بعض کہتے ہیں کہ آرڈیننس کا نفاذ ہو، بعض چاہتے ہیں کہ ریگولیشن جاری ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو بات ایک ہی ہے یعنی ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ حکومت عجلت سے کام لے۔

"مقدمہ ورتمان" کو ہائی کورٹ میں منتقل کرنے میں جو کارروائی کی گئی ہے، شاید وہ تاریخ میں پہلی مثال ہے۔ غالباً دو اڑھائی ماہ تک اس کا فیصلہ ہو جائے گا اگر یہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا تو کسی مزید فیصلے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے میری استدعا ہے کہ جب تک یہ فیصلہ صادر نہ ہو جائے کوئی دوسرا طریق کار اختیار نہ کیا جائے۔ (حاضرین کے ایک حصہ نے شور مچا دیا اور آوازیں آنے لگیں۔ "جو کرا رہی ہے گورنمنٹ کرا رہی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے گورنمنٹ کے ایما پر ہو رہا ہے۔")

میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ خاموش ہو بیٹھیں بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کا کوئی طریق کار اختیار نہ کیا جائے جس سے ہمارے اصل مقصد کو نقصان پہنچے۔ میں آپ کو مشورہ دے رہا ہوں، جو میرے خیال میں درست ہے۔ اگر آپ اسے پسند نہیں کرتے تو اس پر عمل نہ کریں (آوازیں۔ "ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ پہلے مسلمانوں کو چھڑاؤ۔ پہلے رضاکاروں کو چھڑاؤ۔") اس پر ڈاکٹر صاحب نے یہ فرما کر تقریر ختم کر دی کہ "میں اس سچے جوش کی قدر کرتا ہوں۔"(۸۶)

حضرت علامہ کی تقریر کے دوران میں بعض لوگوں کا شور مچانا اور اعتراض کرنا حضرت علامہ کے حضور میں سوء ادب تھا چنانچہ جلسہ میں موجود دیگر اکابر نے اسے محسوس کیا اور چودھری افضل حق اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی تقریروں میں معترضین کے اس رویئے کی مذمت کی۔ مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا :

"کیا میں آپ سے یہ عرض نہ کروں کہ آپ نے ڈاکٹر اقبال کے حضور میں گستاخی کی ہے۔ یعنی ان کی تقریر کے دوران میں اعتراض کیا۔ اقبال پکا مسلمان اور سچا عاشق رسول ہے۔ وہ روتا ہے رسول علیہ الصلوۃ والسلام کے عشق میں، وہ روتا ہے اسلام کی محبت میں (آوازیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب سے معذرت چاہتے ہیں۔ یہ گستاخی سی۔ آئی ڈی نے کی تھی۔ کسی مسلمان نے نہیں کی۔)"(۸۷)

مقدمہ "ورتمان" کے سلسلے کی مزید کارروائی کے بارے میں سید نور احمد کا بیان یہ ہے :

"ڈویژن بنچ کے صدر جسٹس براڈوے تھے۔ اس بنچ نے جسٹس دلیپ سنگھ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قرار دیا کہ دفعہ ۱۵۳ الف اس قسم کی تحریروں پر

حاوی ہے۔ اس مقدمہ کے ملزم کو سزا مل گئی لیکن راجپال بری ہو چکا تھا۔ وہ قانون کی اس متلون مزاجی پر ہنستا رہا۔" (۸۸)

علم الدین شہید

برعظیم کے مسلمان اس صورت حال پر غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ سید نور احمد کے الفاظ میں :

"لاہور کا ایک نوجوان علم الدین اس بات کو برداشت نہ کر سکا کہ ایک شخص اتنا بڑا جرم اس جسارت اور دیدہ دلیری کے ساتھ کرے اور قانون کی گرفت سے صاف بچ جائے۔ اس نے خود اپنی جان پر کھیل کر راجپال کو سزا دینے کا تہیہ کیا اور ۹ اپریل ۱۹۲۹ء کو دن کے وقت اس کی دکان پر جا کر وہیں دکان کے اندر اسے خنجر سے ہلاک کر دیا اور خود گرفتار ہو گیا۔" (۸۹)

غازی علم الدین پر مقدمہ چلا اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو صبح سات بجے انہیں میانوالی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ غازی شہید کی نعش کو باوجود مطالبہ کے ورثا کے حوالے نہ کیا گیا بلکہ بغیر نماز جنازہ پڑھے میانوالی ہی میں دفن کر دیا گیا۔ اس پر مسلمانوں میں پھر اضطراب پیدا ہوا۔ اکابر مسلمانوں کی کوششوں سے ۱۴ نومبر ۱۹۲۹ء کی صبح کے سوا پانچ بجے نعش مبارک ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے میاں میر سٹیشن پر لائی گئی۔ وہاں سے اسے چوبرجی کے قریب پریڈ گراؤنڈ میں لایا گیا۔ اور نماز جنازہ کے بعد اسی روز تدفین عمل میں آئی۔

نعش مبارک کی میانوالی سے لاہور منتقلی' نماز جنازہ اور تدفین کے مراحل میں دیگر اکابر کے علاوہ حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں بھی پیش پیش رہے۔ اس سلسلے میں ۱۷ نومبر ۲۹ء کے زمیندار میں شائع شدہ ایک رپورٹ سے چند اقتباسات نذر قارئین ہیں۔

"نعش مبارک میاں میر ریلوے سٹیشن سے چوبرجی کے قریب پہنچائی گئی۔ سر میاں محمد شفیع بالقابہ' ڈاکٹر سر اقبال' انجمن اسلامیہ کے عہدہ دار' خان بہادر ملک محمد حسین صدر بلدیہ' مولوی غلام محی الدین ناظم انجمن حمایت اسلام' مولانا غلام رسول مہر' مولانا عبدالمجید سالک' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین' خواجہ دل محمد اور دیگر ارکان بلدیہ وہاں موجود تھے۔ سرکاری آدمیوں نے نعش ان کے حوالے کر کے ان سے رسید لے لی۔ یہ حضرات پونچھ ہاؤس کے قریب کھڑے تھے۔ یہاں سے میت اٹھا کر پریڈ گراؤنڈ میں لائی گئی اور نہایت احترام کے ساتھ جنازہ رکھ دیا گیا۔

ٹھیک آٹھ بجے آقائے ظُفر علی خاں' آقائے اختر علی خاں اور ملک لال دین صاحب قیصر شہر کا چکر لگا کر بریڈ گراؤنڈ (جنازہ گاہ) میں پہنچے۔ شہر میں مسلمانوں کی دکانیں بند تھیں اور لوگ ٹمٹموں' تانگوں' لاریوں اور موٹروں میں سوار ہو کر جنازہ گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہزارہا فرزندان توحید تسبیحیں پڑھتے ہوئے پیدل بھی جا رہے تھے سڑکوں پر چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا مگر پیدل اور سواریوں پر جانے والوں کی تعداد اس قدر تھی کہ ایک مرتبہ کا چھڑکاؤ بہت دیر تک گردوغبار کو دبائے رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا..... قلم میں قدرت نہیں کہ اس نظارے کی تصویر کھینچ سکے جو نماز جنازہ کے وقت لاہور کی آنکھوں نے دیکھا۔ نماز مولانا قاری شمس الدین صاحب بخاری خطیب جامع مسجد وزیر خاں نے پڑھائی۔ تابوت سے لے کر مشرقی حد نگاہ تک آدمیوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور جنازہ گاہ سے میانی صاحب کے قبرستان تک انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے۔ بہت ہی محتاط اور معتدل اندازہ لگانے والے اس اجتماع کو دو لاکھ سے اوپر قرار دیتے ہیں اور ہم بھی اس میں کوئی تصرف کرنا نہیں چاہتے......

نماز جنازہ سے پہلے ماسٹر محمد بخش صاحب مسلم نے کلام اللہ شریف کا ایک رکوع تلاوت فرمایا اور ہجوم کو پرامن رہنے کی تلقین کی۔ جب صفیں درست کی جا رہی تھی تو آقائے ظفر علی خاں نے پندرہ پندرہ صفوں کے بعد ایک صف کے عرض میں دو دو مکبر کھڑے کر دیئے تاکہ تکبیر کی آواز آخر تک پہنچ سکے۔ نماز جب ختم ہو چکی تو دفعتاً" ایک آواز بلند ہوئی کہ جنازہ اٹھایا جائے......

حالت اس وقت یہ تھی کہ ہر مسلمان جنازے کے قریب پہنچ کر اسے کندھا دینے کے لئے بیتاب تھا۔ لاکھوں مسلمانوں کی یہ بے تابی ایک خوفناک اقدامی حرکت کی شکل میں نمودار ہوئی جس نے سارے نظم اور ساری ترتیب کو بکھیر کر رکھ دیا۔ قریب تھا کہ بیسیوں مسلمان اس خوفناک ریلے میں دب کر ہمیشہ کے لئے آغوش فنا میں سو جائیں۔ خود آقائے ظفر علی خاں مرتے مرتے بچے اور بصد مشکل ہانپتے کانپتے کشتی لڑتے ہوئے پیچھے ایک مقام پر جا کر کھڑے ہوئے۔ سر محمد شفیع' ڈاکٹر محمد اقبال' خلیفہ شجاع الدین اور دوسرے حضرات کی بھی یہی گت بنی اور وہ اس گرداب نشور میں سے بمشکل تمام جان سلامت لے کر باہر نکلے۔ (مولانا ظفر علی خاں نے ایک تقریر کے ذریعے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ جنازہ کی محفوظ روانگی کے لئے نظم و ضبط

کا مظاہرہ کریں۔ اور اس سلسلے میں انتظامات کئے۔ تلخیص)..... اب پورے امن' پورے نظام اور پوری ترتیب کے ساتھ یہ جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں کے تیار کردہ راستے پر سب سے آگے سر شفیع' سر اقبال' میاں عبدالعزیز' خلیفہ شجاع الدین' خواجہ دل محمد اور دوسرے اکابر تھے۔ اس شان سے یہ عدیم النظیر جلوس روانہ ہوا۔ رضاکاروں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ بجز چار نعروں کے اور کوئی نعرہ نہ لگایا جائے یعنی

۱۔ نعرہ تکبیر ۲۔ اسلام زندہ باد

۳۔ غازی علم الدین زندہ باد ۴۔ آزاد ہندوستان زندہ باد

چنانچہ آخر تک یہی فلک شگاف نعرے فضا میں گونجتے رہے۔ جنہیں لاکھوں انسانوں نے سنا اور دہرایا اور نئی زندگی پائی۔"(۵۰)

فلسطین

اپنی اسلام دشمن پالیسی کے عین مطابق برطانیہ اور فرانس بیسویں صدی کے آغاز میں بھی عالم اسلام کے درپے تھے۔ انہوں نے عالم اسلام کے اتحاد اور قوت کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سازش' رشوت' مکر و فریب' جھوٹ اور استعمار کے حربوں سے کام لے کر انہوں نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ عراق اور شام کو ترکی کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ پھر شام کے وسیع علاقے کو شام' لبنان اور فلسطین تین حصوں میں بانٹ دیا اور فلسطین میں یہودی سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سیاسی قزاقی میں صیہونی اور صلیبی قوتیں ایک دوسرے کی حلیف و معاون تھیں۔ سارا عالم اسلام اس صورت حالات سے تشویش و اضطراب میں مبتلا تھا۔ برعظیم کے دیگر مسلم اکابر کی طرح حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں بھی ان واقعات پر اپنے دردمندانہ ردعمل کا اظہار کر رہے تھے۔

حضرت علامہ نے اپنے اس دور کے مکاتیب اور بیانات میں تقسیم فلسطین کے منصوبے کی سخت مخالفت کی۔ اپنے بیانات میں اور مس فارقو ہرسن کے نام اپنے خطوط میں حضرت علامہ نے فلسطین کے بارے میں اپنے خیالات کا مفصل اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا کہ "مجھے قوی امید ہے کہ برطانوی ارباب سیاست عربوں سے اپنی فی الواقع دشمنی سے باز آئیں گے اور ان کے وطن کو بحال کر دیں گے۔" آپ نے خبردار کیا کہ یہ مسئلہ صرف فلسطین کا نہیں ہے بلکہ پوری اسلامی دنیا اس سے سخت متاثر ہو رہی ہے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ یہ مسئلہ یہودیوں کا نہیں ہے۔

یروشلم میں حضرت عمر فاروقؓ کے ورود مسعود سے تیرہ سو سال قبل یہودی فلسطین سے اپنی مرضی سے ترک سکونت کر گئے تھے۔ حضرت علامہ نے مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) کو بھی مجرم ٹھہرایا۔ آپ نے لکھا کہ اسلامی ایشیا کی نظر میں جمعیت اقوام دراصل ایک اینگلو فرنچ ادارہ ہے جو کمزور مسلمان حکومتوں کے علاقوں کو آپس میں تقسیم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ حضرت علامہ نے مشرق کی اپنی جمعیت اقوام کی تشکیل کا تصور بھی پیش فرمایا۔(۹۱)

اسی طرح وائسرائے ہند کے نام حضرت علامہ نے ۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو فلسطین کی صورت حال کے بارے میں ایک برقیہ ارسال کیا جس میں کہا گیا کہ

> "فلسطین کی صورت حالات نے مسلمانان ہند میں زبردست ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ نائب وزیر نو آبادیات کی تقریر نے مسلمانوں کے شبہات کو زیادہ عمیق بنا دیا ہے کہ برطانیہ کی یہ پالیسی ہے کہ عربوں کے مفاد کے خلاف عمل پیرا ہو کر فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت قائم کر دی جائے۔ نائب وزیر نو آبادیات نے برطانیہ کی جو پالیسی بیان کی ہے وہ صریحاً مخالفانہ ہے۔ فلسطین میں حال ہی میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں' وہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ فوراً تحقیقات کی جائے اور فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ جلد از جلد روک دیا جائے۔ برطانیہ کے بہترین مفاد کا اقتضا یہ ہے کہ "اعلان بالفور" کو واپس لے لیا جائے۔"(۹۲)

حضرت علامہ کے ان افکار و نظریات کا اظہار ان کے اردو اور فارسی کلام میں بھی جا بہ جا ہوا ہے۔ مثلاً

جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکان جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

+++

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا

+++

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن
دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

+++

طہراں ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

انہی خیالات و جذبات کا اظہار مولانا ظفر علی خاں نے بھی اپنی نظم و نثر میں فرمایا۔ مثلاً ان کی ایک نظم "غازیان فلسطین" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رسن سازان مغرب سے یہ کہہ دو
کہ گذری حد سے رسی کی درازی
کہاں تک قدس کی تخریب کا شوق
کہاں تک یہ پرانی خاکبازی
کہاں تک فکر اصلاح قبائل
کہاں تک یہ انوکھی حیلہ سازی
حمایت تا بکے صیہونیوں کی
کہاں تک یہ یہودیت نوازی
بدل سکتی نہیں' فطرت عرب کی
نئی تہذیب کی افسوں طرازی
روش موجودہ اپنی ترک کیجے
اگر ہے دعویٰ مسلم نوازی(۹۳)

۱۹ جولائی ۱۹۳۷ء کو تقسیم فلسطین کے منصوبے کی بارے میں مولانا نے فرمایا۔

لندن کے کمشن کی سفارش سے پریشاں
سب شیخ فلسطین ہیں اور شاب فلسطین
ساماں ہیں نئی جنگ صلیبی کے نمودار
خنجر بکف اٹھنے کو ہیں اعراب فلسطین
کھیتے ہیں جسے مل کے یہود اور نصاریٰ
ہے تاک میں اس ناؤ کی گرداب فلسطین(۹۴)

۸ نومبر ۱۹۳۶ء کو زمیندار کا فلسطین نمبر بھی شائع ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی ملت دوستی

کی بنا پر انہیں ۱۹۳۸ء میں کونسل آف آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں ایک ہفت رکنی "فلسطین کمیٹی" کا ممبر بھی بنایا گیا تھا۔ اس وفد کا مقصد اس امر پر غور کرنا تھا کہ مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں ایک وفد بیرون ملک خصوصاً فلسطین اور انگلستان بھیجا جائے اور فلسطین کے معاملے میں حکومت برطانیہ پر موثر دباؤ ڈالا جائے۔ مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس ۳۰-۳۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو دہلی میں قائداعظمؒ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔(۹۵)

کشمیر

کشمیر مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کا خطہ تھا اور ہے۔ لیکن انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں یہ خطہ پچاس لاکھ روپے کے عوض گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح کشمیر اور کشمیری مسلمانوں پر جبراً ہندو راج مسلط کر دیا گیا۔ مسلمانان کشمیر اسی وقت سے حصول آزادی کے لیے کوشاں ہیں لیکن افسوس کہ بھارت اور اس کی سرپرست بعض عالمی طاقتوں کی استعمار گستری نے اب تک کشمیر کو غلامی کے چنگل میں دبوچ رکھا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں کشمیر کے حالات نہایت ابتر تھے۔ اس دور کے حالات پر جناب محمد حمزہ فاروقی یوں روشنی ڈالتے ہیں :

"ریاست کا مہاراجہ ہری سنگھ ڈوگرا تھا اور اس کے دور میں مسلمانوں پر ملازمتوں اور باعزت روزگار کے دروازے بند تھے۔ انہیں مذہبی اور سیاسی آزادی میسر نہ تھی۔ ڈوگروں کے دور میں مسلسل قحط کی بنا پر کشمیر کے مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہجرت کر کے پنجاب اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں آباد ہو گئی۔ کشمیریوں کے قدیم فنون اور صنعتیں برباد ہو رہی تھیں۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کے مقابلے میں ہندوؤں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ملازمتیں میسر تھیں۔ صناع مسلمانوں کی مجبوری' تبدیل مذہب پر قید و بند کی سزائیں' ذبح بقر کی عمومی ممانعت' ناقابل برداشت ٹیکسوں کے بوجھ..... ۲۱ جون ۱۹۳۱ء کو سری نگر میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں امروہہ کے ایک مسلمان عبدالقدیر نے زوردار تقریر کی۔ ریاستی حکام نے عبدالقدیر کو گرفتار کر لیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو عبدالقدیر کا مقدمہ سری نگر جیل میں پیش ہوا۔ کارروائی سننے کے لئے ہزاروں مسلمان جیل کے دروازے پر جمع ہو گئے اور اندر جانے کی کوشش کرنے لگے۔ پولیس نے گولی چلا دی جس سے ۲۱ مسلمان شہید اور سیکڑوں زخمی ہو گئے۔ اس پر زبردست فساد ہوا۔ ریاستی حکام بھوکے بھیڑیوں کے مانند مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔

سیکڑوں مسلمان جن میں شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس بھی شامل تھے' داخل زنداں کر دیئے گئے۔ سری نگر اور کشمیر کے دیگر شہروں میں کئی روز ہڑتال رہی اور مختلف شہروں میں مسلمانوں کے جلوس نکلتے رہے۔"(۹۶)

کشمیر کے معاملات سے حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کو اجتماعی حوالے سے بھی دلچسپی تھی اور ذاتی حوالے سے بھی۔ حضرت علامہ کے اجداد سپرو گوت کے کشمیری پنڈت تھے۔ جناب جاوید اقبال زندہ رود (جلد اول) میں لکھتے ہیں :

"ایک قلمی رجسٹری شدہ دستاویز میں اقبال نے اپنی قومیت سپرو (کشمیری پنڈت) تحریر کی ہے۔ انہوں نے اپنے والد سے سن رکھا تھا کہ ان کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ گوت ان کی سپرو ہے اور ان کے جد اعلیٰ جنہوں نے اسلام قبول کیا بابا لول حج یا لولی حاجی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔"

مولانا ظفر علی خاں نے ۲ جولائی ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید اور تشکیل نو کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

"مجھے کشمیر سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میرے والد محترم اپنی عمر کا ایک حصہ کشمیر میں بسر کر چکے ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ کشمیر کے چپے چپے پر پھر چکا ہوں۔" (۹۷)

چنانچہ ڈوگرہ شاہی مظالم کے خلاف اور مسلمانان کشمیر کی تحریک حریت اور معاشی و معاشرتی بہبود کے حق میں دونوں اکابر مسلسل آواز اٹھاتے رہے۔ کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک آل انڈیا کشمیر کانفرنس بیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے سے کام کر رہی تھی۔ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو اس کی جگہ فیرویو (Fair View) شملہ میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود قادیانی اور سیکرٹری عبدالرحیم درد قادیانی تھے۔ اس کمیٹی کے قادیانی ارکان نے کشمیر کمیٹی کو قادیانیت کی تبلیغ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تو مسلمان کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کی شمولیت کے خلاف ہو گئے۔ ۷ مئی ۱۹۳۳ء کو بشیر الدین محمود نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی جگہ عارضی طور پر علامہ اقبال کمیٹی کے صدر اور ملک برکت علی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ بعد میں ۲ جولائی ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید اور تشکیل نو ہوئی اور علامہ اقبال کمیٹی کے مستقل صدر بنائے گئے۔ ۱۹۳۳ء ہی میں قادیانیوں نے اس کمیٹی کے متوازی "تحریک کشمیر" کا آغاز کیا اور حضرت علامہ کو اس کی صدارت کی پیشکش کی لیکن حضرت علامہ نے ۲ اکتوبر ۳۳ء کے ایک بیان کے ذریعے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

یہ دور کشمیری مسلمانوں کے لئے بہت صبر آزما تھا- ان کی تحریک حریت کو کچلنے کے لیے ڈوگرہ حکمران ہر طرح کے جبر و ستم کو روا رکھے ہوئے تھے- اس صورت حالات میں حضرت علامہ نے ۷ جون ۱۹۳۳ء کو بطور صدر آل انڈیا کشمیر کمیٹی ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا :

"میں کشمیر کی کسی سیاسی جماعت کی بلاوجہ حمایت نہیں کرنا چاہتا لیکن دونوں جماعتوں کے لیڈروں کی گرفتاری' لوگوں پر دروں کی بارش اور عورتوں اور بچوں پر گولی چلانا اور لاٹھی چارج ایسے واقعات ہیں جو کشمیر کو پھر ان مصیبتوں میں ڈال دیں گے جن سے کرنل کالون (وزیراعظم ریاست کشمیر) نے اپنی حکمت عملی سے نجات دلائی تھی-"(۹۸)

حضرت علامہ کے خطوط بنام سید نعیم الحق وکیل (پٹنہ) سے بھی کشمیر کے معاملات میں حضرت علامہ کے اضطراب اور کرب کا اظہار ہوتا ہے-

۲۲ فروری ۱۹۳۴ء کو آپ نے وائسرائے کے نام تار دیا :

"کشمیر سے نہایت خوفناک اطلاعات موصول ہو رہی ہیں- بلا امتیاز بید زنی کی جا رہی ہے اور گولی چلائی جاتی ہے- صورت حال کا اقتضا یہ ہے کہ ہز ایکسی لینسی فوری طور پر توجہ فرمائیں ورنہ انتہائی افسوسناک' نتائج کا اندیشہ ہے-"(۹۹)

۳ مارچ ۱۹۳۴ء کو حضرت علامہ نے مجلس اقوام کے نام اور اخبار "لندن ٹائمز" کو ذیل کا برقی پیغام ارسال فرمایا :

"حکومت کشمیر سیاسی ایجی ٹیٹروں کو وحشیانہ سزائے بید زنی دے رہی ہے- میں اپیل کرتا ہوں کہ اس انسانیت سوز سزا کے خلاف آواز اٹھایئے-"(۱۰۰)

اسی طرح اپنی شاعری میں بھی حضرت علامہ نے متعدد مقامات پر کشمیر اور اس کے مسائل کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے-

جاوید نامہ فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی- جناب یوسف سلیم چشتی شرح جاوید نامہ کے ایک فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں :

"واضح ہو کہ علامہ اقبال نے یہ کتاب ۳۱-۱۹۳۰ء میں لکھی تھی جب کشمیری مسلمان آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور مرحوم اس زمانہ میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے- مجھے یاد ہے کہ اس زمانہ میں آئے دن علامہ کی کوٹھی پر "کشمیر کمیٹی" کے جلسے ہوتے رہتے تھے-"(۱۰۱)

جاوید نامہ میں اقبال کشمیر کے بادشاہ شاب الدین (م ۷۷۵ ھ) کو یوں یاد کرتے ہیں-

عمرہا گل رخت بربست و کشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد

اور پھر فرنگیوں کی کشمیر فروشی پر کس کرب سے کہتے ہیں۔

باد صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوی
دہقان و کشت و جوی و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند(۱۰۲)

"ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے تحت جو انیس نظمیں ارمغان حجاز کے حصہ اردو میں شامل ہیں، وہ حقیقت میں حریت آموزی اور استعمار شکنی کے مظہر ہیں۔ بقول جناب یوسف سلیم چشتی "ملا زادہ ضیغم ایک فرضی نام ہے۔ ضیغم شیر کو کہتے ہیں مراد اس سے یہ ہے کہ اقبال کشمیریوں میں شیروں کی صفات پیدا کرنی چاہتے ہیں۔"(۱۰۳) ان جاں تاب نظموں کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دین بندہ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادی لولاب

+ + +

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر

+ + +

چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمان کشمیری

+ + +

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

+ + +

مولانا ظفر علی خاں بھی اپنے انداز میں کشمیر کے مسائل پر اظہار خیال فرماتے رہے مثلاً ۱۳ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شاہی مسجد کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

"ریاست کشمیر کے حکام نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ کشمیر کا مسلمان ایسا اونٹ ہے کہ جس پر جبر و استبداد کے تنکوں کا پہاڑ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے وہ اسے باسانی اٹھا لے گا۔ لیکن ان کا یہ تجربہ غلط ثابت ہوا بلکہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے برطانوی افواج کے لئے مداخلت کا موقع بہم پہنچایا۔"(۱۰۴)

اسی طرح ۱۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو مولانا نے فرمایا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ یہ خطہ ہے کالوں کا وطن
آپ کہتے ہیں کہ کشمیر ہے گھر گورے کا
سر ہری سنگھ سمجھ لیں کہ اکھڑنا ہے محال
جم گیا آ کے یہاں پاؤں اگر گورے کا
اسی اللہ کے بندے کو مسلماں سمجھو
ڈوگرے کا ہو جسے خوف نہ ڈر گورے کا(۱۰۵)

۲ جولائی ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید اور تشکیل نو کے لیے مسلمانوں کا ایک جلسہ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں میاں عبدالعزیز کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا :

"ہم ان واقعات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ کشمیر میں ایک پتلا دبلا ڈوگرہ ایک موٹے تازے مسلمان کو بید سے مارتا تھا اور مسلمان اس کے سامنے بچے کی طرح بلبلا کر روتا تھا۔ میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن اب مظالم سے تنگ آ کر وہاں کے مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کی اور ہمت مردانہ کے ساتھ ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ وہ اپنے حقوق اور جائز مطالبات کے لیے سربکف میدان میں نکل آئے ہیں۔"

اس موقع پر مولانا نے درج ذیل قرارداد بھی پیش کی جس کی تائید مولوی محمد الدین فوق ، اور قرارداد منظور ہو گئی۔

"مسلمانان لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ کشمیر کے افسوس ناک حالات حاضرہ کو بہ نگاہ اضطراب دیکھتا ہے جس کی بنا پر بلا امتیاز کشمیر کے لیڈروں اور ان کے رفقاء کو اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا ہے کہ اس طریق عمل سے مختلف اسلامی طبقوں میں صلح و

آشتی پیدا ہو گی- اس جلسہ کی پختہ رائے یہ ہے کہ موجودہ قابل افسوس حالات کو رو براہ لانے کے لئے شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے اور ریاست بھر میں جس قدر مقدمات گذشتہ فسادات کشمیر کے' زیر سماعت ہیں ان کو واپس لے لیا جائے-"(۱۰۶)

۹ فروری ۱۹۳۴ء کو مولانا نے لکھا۔

ہر طرف ہنگامہ پھر برپا ہے دار و گیر کا
ہو رہا ہے پھر ہرا زخم کہن کشمیر کا
ہے خطا اتنی کہ کیوں کرتے ہیں حق اپنا طلب
ہیں یہ ساری سختیاں خمیازہ اس تقصیر کا
بادشہ بے مہر ہے اور بے نیاز اس کا وزیر
شکوہ کس سے کیجئے پھوٹی ہوئی تقدیر کا
ایک لے دے کر خدا باقی ہے جس کے عرش پر
حق ہے کچھ کشمیریوں کے نالہ شب گیر کا(۱۰۷)

۲۳ جولائی ۱۹۳۹ء کو مولانا نے ایک نظم بعنوان "گاندھی جی کا عزم کشمیر" لکھی- اس میں فرماتے ہیں۔

ترکش سے نکالا ہے اہنسا کے نیا تیر
اور آئے ہیں اس تیر کی زد میں نئے نخچیر
پاتے ہی ہزارہ کے مشاغل سے فراغت
سنتا ہوں کہ گاندھی جی ہوئے عازم کشمیر
کشمیر کے جنگل میں وڑوکا ہے جو برسوں
اس شیر کو روباہ بنانے کی ہے تدبیر
توحید کے فرزند سے جا کر کوئی کہہ دے
قائم تجھے رکھنی ہے گر اسلاف کی توقیر
گھر سے نکل آ رکھ کے ہتھیلی پہ سر اپنا
اور کھینچ دے پھر معرکہ بدر کی تصویر
چلنا ہے تو چل جادۂ شاہ دوسرا پر
کرنی ہے تو کر پیروی سنت شبیرؓ(۱۰۸)

۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء کو زمیندار کا کشمیر نمبر بھی شائع ہوا۔

قادیانیت

قادیانیت یا مرزائیت کے لیے بعض مسلم اکابر نے جن میں خود حضرت علامہ اقبال بھی شامل ہیں' احمدیت کی اصطلاح سہواً استعمال کی ہے اور یہ بات غلامان احمدؐ مختار کے لیے دل آزاری کا باعث بنتی رہی ہے۔ محمدزم یا محمدیت کی طرح احمدزم یا احمدیت کی اصطلاح بھی اسلام کی متبادل قرار نہیں دی جا سکتی۔ مستشرقین کی وضع کردہ ان اصطلاحات سے کسی و ضعی مذہب کا تصور ابھرتا ہے لیکن ان اصطلاحات کو مجبوراً استعمال کرنا بھی پڑے تو پھر محمدی یا احمدی کا اطلاق رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والوں ہی پر ہو گا۔ عقیدہ ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے لہٰذا کوئی ایسا شخص احمدی یا محمدی کہلانے کا حق نہیں رکھتا جو "لا نبی بعدی" پر ایمان نہ رکھتا ہو اور شرک فی النبوۃ کا مرتکب ہو۔ محمدؐ کی طرح احمدؐ بھی خاتم النبیین رسول ہاشمی کا اسم ذاتی ہے اور غلامان رسول ہاشمی احمدی کہلانے میں فخرو شرف محسوس کرتے ہیں جبکہ متنبی قادیان کا اصل نام غلام احمد تھا اور اس نے غلامی احمدؐ کو اپنے لیے ناکافی اور ناشایان شان سمجھتے ہوئے کمال عیاری اور غداری سے خود احمد بن جانے کا دعویٰ کیا۔ غلام احمد کی امت و ذریت کو غلام احمدی کہلانا چاہئے نہ کہ احمدی۔ حضرت اسد ملتانی نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔

نسبت ہمیں ہے احمدؐ مختار سے اسد
ہم احمدی تو ہیں پہ غلام احمدی نہیں

متنبی قادیان نے اواخر عمر میں اپنی نبوت کا اعلان ایسے مبہم اور ملفوف انداز میں کیا کہ عوام تو کیا خواص اہل اسلام بھی ایک مدت تک اس کے خبث نیت سے پوری طرح باخبر نہ ہو سکے۔ جہاں تک حضرت علامہ اقبال کا تعلق ہے وہ بھی متعدد دیگر اکابر اسلام کی طرح ایک مدت تک مرزا غلام احمد قادیانی کی علمی اور معاشرتی خدمات کے معترف رہے لیکن اس کے دعوائے نبوت سے کاملا" آگاہ ہونے میں انہیں شاید کچھ دیر لگی۔ تاہم یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت علامہ ختم نبوت کے ہمیشہ قائل بلکہ مبلغ رہے اور خاتم النبیین کے بعد کسی نبوت کو خواہ وہ ظلی یا بروزی ہی کیوں نہ ہو' ماننے کے بارے میں تو وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے سترہویں سالانہ جلسہ میں نظم بعنوان "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" پڑھی' اس کے بند نہم کا ایک شعر یہ تھا۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نور شمع عرفاں کردہ ای

اس شعر کے پہلے مصرع کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

"یہ ۱۹۰۲ء کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے بروزیت کی بنا پر ہوئی۔ یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوت ہے۔ خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔"(۱۰۹)

جناب اعجاز احمد نے 'مظلوم اقبال' (مطبوعہ ۱۹۸۵ء) میں اور جناب شیخ عبدالماجد نے 'اقبال اور احمدیت' (مطبوعہ اپریل ۱۹۹۱ء) میں اقبال اور قادیانیت کے بارے میں سنگین مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سارا غصہ اس بات پر ہے کہ اقبال ایک عرصہ تک مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت سے حسن ظن رکھنے کے باوجود مسلمان کیوں رہے اور خود قادیانی کیوں نہ ہو گئے اور بیسیویں صدی کے تیسرے عشرے میں قادیاں شکنی کے مرتکب کیوں ہوئے۔ معترضین جدید کو خوب معلوم ہے کہ اقبال ان اعتراضات کا مسکت جواب پہلے ہی دے چکے ہیں۔ حضرت علامہ نے قادیانیوں کی تحریک کے بارے میں لکھا تھا :

I have no hesitation in admitting that about a quarter of a century ago I had hopes of good results following from this movement.... I became suspicious of the movement when the claim of a new prophethood, superior even to the prophethood of the founder of Islam, was definitely put forward and the Muslim world was declared Kafir.(۱۱۰)

حضرت علامہ کے اس بیان کا ترجمہ درج ذیل ہے :

"مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی.... ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ـــــ بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ـــــ کا حتمی طور پر دعویٰ کیا گیا اور تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیا گیا۔"

حضرت علامہ اقبال' متنبی قادیاں کے دعویٰ نبوت ہی کو باطل سمجھتے تھے "بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت" کا جملہ تو محض ایک جملہ معترضہ تھا اور اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ قادیانی نبوت کا کریلا نیم چڑھا بھی ہے۔ لیکن جناب اعجاز احمد بحث کو غلط رخ دینے کے لیے اسی جملہ معترضہ کو ہی بنیاد بنا کر یوں رواں ہوئے ہیں :

"بانی سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا نہ کوئی احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو سرکار دو عالم سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قرآن کریم خاتم النبین کہا گیا ہے اور انہیں خاتم النبین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزو ایمان ہے۔"(۱۱۱)

گویا جناب اعجاز احمد اور شیخ عبدالماجد صاحبان کے نزدیک مرزائے قادیان نبی تو ہے لیکن تم النبین سے برتر نبی نہیں ہے۔ حضرت علامہ اقبال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے عد کسی نبوت کے قائل نہ تھے اور انہوں نے ظلی اور بروزی نبوت اور ختم نبوت کی قادیانی ویلوں کو بھی اپنے مضامین اور بیانات میں بہ دلائل رد کیا۔ علامہ اقبال کی یہ تحریریں جناب طیف احمد شیروانی کی مرتب کردہ کتابوں "حرف اقبال" اور "سپیچز، رائٹنگز اینڈ سٹیٹ منٹس آف قبال" اور دیگر کتب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

قادیانیوں کے بارے میں حضرت علامہ کو ابتداً یقیناً کچھ غلط فہمیاں تھیں لیکن بعد میں وہ دور ہو گئیں۔ اس بات کا اعتراف خود حضرت علامہ نے بھی فرمایا ہے :

"اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"(۱۱۲)

تاہم حضرت علامہ نے مرزائے قادیان کے دعویٰ نبوت کی کبھی تائید و تصدیق نہیں کی۔ اس سلسلے میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ مئی ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں حضرت علامہ کی ایک نظم بعنوان "خط منظوم —— پیغام بیعت کے جواب میں" شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چالیس اشعار تھے۔ جن میں سے صرف تیرہ اشعار "عقل و دل" کے عنوان سے بانگ درا میں شامل ہیں۔ باقی اشعار "عقل و دل" ہی کے زیر عنوان مولانا غلام رسول مہر کی مرتب کردہ "سرد رفتہ" میں شامل ہیں۔ اس نظم پر مولانا مہر نے ذیل کا نوٹ دیا ہے :

"یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ پیغام کس طرف سے آیا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ یہ پیغام قادیانی جماعت کی طرف سے ملا تھا۔ اس کی جانب کچھ اشارے خود نظم میں ہیں۔ ایک قابل غور امر یہ ہے کہ اس خط کے جواب میں اسی بحر اور اسی زمین میں ایک نظم سید حامد شاہ نے لکھی تھی جو قادیانی جماعت کے ممتاز رکن تھے۔ اس کا آخری شعر یہ تھا

کیوں نہ ہو خاک پا مرا اقبال
حامد نائب خدا ہوں میں"(۱۱۳)

حضرت علامہ کی اس نظم اور اس پر مولانا مہر کے نوٹ کے بارے میں جناب بشیر احمد ڈار اپنی مرتب کردہ کتاب "اقبال اور احمدیت" میں فرماتے ہیں :

"میرا خیال ہے کہ (مولانا مہر کا اخذ کردہ) یہ نتیجہ بالکل قطعی ہے کہ یہ پیغام (بیعت کا) اسی جماعت کی طرف سے تھا۔ اس نظم میں اقبالؒ نے جماعت احمدیہ کے متعلق مجمل طور پر وہی بات کہی جو انہوں نے ان کے خلاف اپنے پہلے بیان "قادیانی اور جمہور مسلمان" (۱۹۳۴ء) میں تفصیل سے کہی تھی۔ یعنی اس جماعت نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کر کے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

پھر امیر جماعت کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مخالفین کی موت کی پیش گوئی کرتے ہیں اور جب وہ مرجاتے ہیں تو ان پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

مرگ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں"(۱۱۴)

۱۳ نومبر ۱۹۱۵ء کو حضرت علامہ نے ایک قادیانی ہفت روزہ "پیغام صلح" کے ایڈیٹر کے نام خط لکھا اور ان کلمات کی تردید کی جو کسی قادیانی نے قادیانیوں کی حمایت میں حضرت علامہ سے منسوب کیے تھے۔ حضرت علامہ نے لکھا :

"اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلعم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو' وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔"

مدیر پیغام صلح کے نام حضرت علامہ کا متذکرہ بالا خط کلیات مکاتیب اقبال جلد اول مرتبہ سید مظفر حسین برنی کے صفحات ۴۲۹ تا ۴۳۱ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں قادیانی جماعت کے بارے میں حضرت علامہ کا موقف یہ تھا :

"جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار

مستلزم کفر ہو، وہ خارج از اسلام ہو گا۔ اگر قادیان جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" (۱۱۵)

۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو حضرت علامہ نے مرزائے قادیان اور اس کی جماعت کے بارے میں چودھری محمد احسن صاحب کو ایک خط میں لکھا :

"میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی تعلق نہیں.... اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے کئی طریق ہیں۔ میرے عقیدہ ناقص میں جو طریق مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ زمانہ حال کی طبائع کے لیے موزوں نہیں۔" (۱۱۶)

مادر انسانیت حضرت حوا کے بارے میں متنبی قادیان کا کیا عقیدہ تھا اور اس عقیدے کے بارے میں حضرت علامہ اقبال کی کیا رائے تھی، یہ حکایت مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں :

"راوی کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال کو "تحفہ گولڑویہ" مصنفہ متنبی قادیان کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی گئی جس میں اس مفتری علی اللہ نے قرآن کریم کی آیات کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حوا نے شیطان کی قائم مقام بن کر آدم کو جنت سے نکال دیا اور علامہ ممدوح سے استفسار کیا گیا کہ ایسے عقیدہ رکھنے والے شخص کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے تو انہوں نے فرمایا :

"یہ عقیدہ مسلمانوں کا تو نہیں البتہ عیسائی ضرور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ رہے مرزا غلام احمد قادیانی سو تعجب ہے کہ عورت ذات کے ساتھ ان کے تعلقات کی عمر بھر کی نوعیت نے کس طرح گوارا کیا کہ حضرت حوا کو ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا جائے اور یوں بھی کسی شریف النفس انسان کا جذبہ مروت و فتوت صنف نازک پر ایسے رکیک حملہ کی تاب نہیں لا سکتا۔"

اسی انداز میں چند باتیں علامہ اقبال کی زبان سے جناب مرزائے قادیانی آنجہانی کے صاحبزادہ بلند اقبال کی نسبت بھی صادر ہوئیں جو اس وقت ذہن سے اتر گئی ہیں۔" (۱۱۷)

بعض قادیانی تک بند موقع بہ موقع حضرت علامہ اقبال کے خلاف دریدہ دہنی کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک ایسے ہی صاحب نے جو بقول مولانا ظفر علی خاں "میر قاسم علی کی دو ورقی

کی رعایت سے" فاروق تخلص کرتے تھے، حضرت علامہ کی تخفیف اور تضحیک اور اپنے مردود عقائد کی اشاعت کی غرض سے ایک ہزل کہی۔ اس ہزل کے دو شعر یہ تھے۔

دیکھنی ہو عہد نو میں گر وہی شان و شکوہ
قادیاں میں، پھر مسلمانوں کی، بیداری بھی دیکھ
چھوڑ دے شکوے، مسیح پاک کو اقبال مان
اک نظر فاروق کی یہ گرم گفتاری بھی دیکھ

مولانا ظفر علی خاں کو یہ ہزل جناب احمد ندیم قاسمی نے (جو اس زمانے میں پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی کہلاتے تھے اور بہاولپور میں کالج کے طالب علم تھے) بہاولپور سے اطلاعاً ارسال کی تھی۔ مولانا نے اپنے اخبارات میں اس پر فکاہات کا زعفران زار سجایا۔ پہلے تو نثر میں اس ہرزہ سرا کی خبر لی اور لکھا "علامہ اقبال نے اگر اردو سے، تعلق توڑ کر فارسی سے رشتہ جوڑ نہ لیا ہوتا اور قادیاں کے ماعروں کی پھکوڑیات کا جواب دینا ان کے لیے باعث عار و ننگ نہ ہوتا وہ یقیناً اس نظم کا جواب یوں دیتے۔" اس کے بعد آٹھ اشعار کی ایک نظم کہی ہے جس کے تین شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

کاٹنا مقصود ہے اسلام کا جس سے شجر
قادیاں کے لندنی ہاتھوں میں وہ آری بھی دیکھ
مشی فی النوم اور اس کے فلسفہ پر کر نظر
قادیاں کے نازنینوں کی طرحداری بھی دیکھ
سن لے اپنے کان سے "الفضل" کی گالی گلوچ
لکھنؤ شرما گیا جس سے وہ بھٹیاری بھی دیکھ(۱۱۸)

۲ جولائی ۱۹۳۳ء کی رات کو باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا :

"مجھے سیاسی انجمنوں میں قادیانیوں کی شمولیت پر مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں اگرچہ میں ان کے عقائد کو غلط سمجھتا ہوں۔"(۱۱۹)

کشمیر کمیٹی سے مرزا بشیر الدین محمود کے مستعفی ہونے کے بعد قادیانیوں نے "تحریک کشمیر" کے نام سے ایک متوازی ادارہ قائم کیا اور حضرت علامہ کو اس کی صدارت کی پیش کش کی تو حضرت علامہ نے ۲۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا :

"میرے خط سے اخبارات کے بعض اہل قلم اصحاب نے جو اغلباً" قادیانی ہیں یہ غلط

مطلب اخذ کیا ہے کہ اصولی طور پر مجھے پیش کردہ صدارت کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لہٰذا میں جلد از جلد یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈہ کرنا ہے۔"(۱۲۰)

اور ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد تو حضرت علامہ نے میرزائیت کے خلاف نظم و نثر میں بھرپور انداز میں قلم اٹھایا۔ شیخ عبدالماجد مصنف "اقبال اور احمدیت" کو اصرار ہے کہ اقبال ۱۹۳۵ء کے بعد قادیانی جماعت کے خلاف ہوئے جب انہیں چودھری سر ظفراللہ خاں کے مقابلے میں وائسرائے ہند کی کونسل میں رکنیت حاصل نہ ہو سکی۔ حالانکہ مندرجہ بالا شواہد سے ثابت ہے کہ اقبال اپنے عقیدہ ختم نبوت کا اعلان موقع بہ موقع عمر بھر کرتے رہے اور وہ قادیانی نبوت کے کبھی قائل نہیں رہے۔

اختصار کی غرض سے میں نے اقبال اور قادیانیت کی بحث کو ۱۹۳۵ء سے قبل تک محدود رکھا ہے۔ ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد جو کچھ حضرت علامہ نے قادیانیت کے خلاف لکھا یا فرمایا' اس سے آگاہی کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

i) حرف اقبال مرتبہ شاملو (لطیف احمد شیروانی)

ii) انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار

iii) سپیچز' رائٹنگز اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ لطیف احمد شیروانی

iv) ڈسکورسز آف اقبال مرتبہ شاہد حسین رزاقی

v) تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال' مرتبہ سید عبدالواحد

vi) اقبال اور احمدیت مرتبہ بشیر احمد ڈار

قادیانیت کے بارے میں حضرت علامہ کی بعض نظمیں بھی بہت اہم اور چشم کشا ہیں قادیانی شریعت میں جہاد و قتال کی تعلیمات پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔ اس ضمن میں حضرت علامہ ایک نظم بعنوان "جہاد" (مشمولہ ضرب کلیم) میں فرماتے ہیں۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر؟

+++

اسی طرح ذیل کے اشعار میں بھی قادیانیت ہی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

+++

ہے کس کی یہ جرات کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدہ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

+++

ہندی مسلمان

غدارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر
پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر
آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں و کم ماندہ دریں کشمکش اندر،

مولانا ظفر علی خاں، جیسا کہ پہلے گزارش کی گئی، فتنہ قادیان کے استیصال کے لئے پیش پیش رہنے والے مسلم اکابر میں سے تھے۔ "ارمغان قادیان" کے ایک مضمون بعنوان "علامہ اقبال اور مسئلہ ختم نبوت" میں وہ خود فرماتے ہیں :

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، قادیانیت کا یہ خطرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا اور میری ساری عمر اس ہولناک فتنہ کا مقابلہ کرنے میں گزری ہے مسلمانوں نے اول اول قادیانی خطرہ کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ علمائے امت نے اتنا ضرور کیا کہ جس طرح غلام احمد قادیانی نے ان کو اور باقی تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا، اسی طرح انہوں نے بھی اس پر اور اس کی امت قلیل الانفار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا یا اس کے مایہ ناز مسئلہ ممات مسیح پر اس کے ساتھ اور اس کے اتباع و اعوان کے ساتھ ہنگامہ خیز مناظرے کر لئے۔ لیکن زہر کا یہ تریاق کچھ بہت زیادہ سود مند ثابت نہ ہوا اور میرزائیوں کا پروپیگنڈا اس مذہبی رواداری کے سایہ میں جس کا حکومت وقت کو ادعا ہے، پروان چڑھتا رہا۔

آخر میرے شوروغل اور میرے رفقاء کی ہائے و ہو نے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھولیں اور جب حکومت نے میرزائیت کی پیٹھ پر علی الاعلان تھپکیاں دینی شروع کیں تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ جس فتنہ سے انہیں پالا پڑا ہے، وہ کس قدر ہولناک ہے۔ میں پہلے دن سے پکار رہا ہوں کہ فرقہ ضالہ مرزائیہ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں شب و روز مصروف ہے، ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو بلکہ سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کی طرح اس فرقہ کا شمار بھی سرکاری کاغذوں میں ایک جداگانہ اقلیت کے طور پر ہونا چاہیے۔"

مولانا نے اپنے اس مضمون کے آخر میں تاریخ تحریر ۹ مئی ۱۹۳۵ء درج کی ہے۔ اسی مضمون میں انہوں نے حضرت علامہ کے قادیاں شکن بیان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے، حضرت علامہ کو ان الفاظ میں خراج تہنیت پیش کیا :

"خدا بھلا کرے علامہ اقبال کا جن کے حکیمانہ بیان نے ان ساری حقیقتوں کو بہ کمال شرح و بسط الم نشرح کر کے مسلمانان ہند کی ایک ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی جس کا صلہ انہیں حضور سرورؐ کون و مکاں کی ختم المرسلینی ہی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔" (ارمغان قادیان۔ طبع اول)

اور اب ارمغان قادیاں کی ایک مختصر نظم بھی نذر قارئین کرام ہے۔

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجے ابن جوزی سے
نکوکاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلا ہے
یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمانوں کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے
پلی ہے مغربی تہذیب کے آغوش عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیمبر بھی رسیلا ہے
نصاریٰ کی رضا جوئی ہے مقصد اس نبوت کا
اور ابطال جہاد انجاح مقصد کا وسیلا ہے
بیاس اور اس کی موجیں آئے دن کرتی ہیں غمازی
کہ پوتا قادیاں کے رب اکبر کا رنگیلا ہے

"ارمغان قادیان" کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ کارواں لاہور نے جناب نظیر لودھیانوی مرحوم سے مرتب کرا کے شائع کیا تھا۔ افسوس ہے اس ایڈیشن میں نثر کے وہ آٹھ مضامین شامل نہیں کیے گئے جو پہلے ایڈیشن میں شامل تھے۔ پھر موضوع زیر بحث کے بارے میں مولانا کی متعدد تحریریں ایسی ہیں جو اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں بھی شامل نہیں کی جا سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کا نیا ایڈیشن حسن تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔

شفاء الملک کے اعزاز میں چائے

۲۷ جنوری ۱۹۳۴ء کو لاہور میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی گئی۔ اس تقریب میں حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں دونوں شریک ہوئے۔ اس تقریب کی مختصر کارروائی روزنامہ انقلاب میں ۲۸ جنوری ۱۹۳۴ء کو ذیل کے الفاظ میں شائع ہوئی تھی :

[لاہور۔ ۲۷ جنوری۔ آج شام کے ساڑھے چار بجے مولانا غلام رسول نے سیشل ہوٹل میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی۔ یہ تقریب حکیم صاحب کو حکومت برطانیہ کی طرف سے خطاب ملنے کی خوشی میں دی گئی تھی۔ اس دعوت میں علامہ اقبال' شمس العلما مولانا سید ممتاز علی' سر فیروز خان نون' سر سکندر حیات خان' نواب احمد یار خان دولتانہ' خان بہادر حاجی رحیم بخش' سالک (مولانا عبدالمجید)' شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ' مولانا سید حبیب اور دیگر معززین نے

شرکت کی۔ چائے کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے مختصر تقریر کی۔ آپ نے فرمایا "حکومت نے حکیم فقیر محمد صاحب کو اور مولانا سید ممتاز علی صاحب کو خطاب دے کر کمال علم و فن کا صحیح اعتراف کیا ہے۔ مولانا پہلے بھی شمس العلماء تھے اور حکیم صاحب بھی شفاء الملک تھے بلکہ جالینوس وقت تھے۔" اس تقریر کے بعد یہ پر لطف صحبت اختتام کو پہنچی۔)(۲۱)

حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ

انجمن حمایت اسلام کا ۵۱ واں سالانہ جلسہ ۱۰ تا ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء (جمعتہ المبارک سے اتوار تک) منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں دیگر قومی و ملی اکابر کے علاوہ حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں بھی شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے روزنامہ انقلاب کے اداریہ نگار نے لکھا :

"اس سال انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس اللہ کے فضل اور کارکنوں کی ہمت کے باعث بہت کامیاب رہا... پروگرام بھی بہت اچھا تھا کیونکہ اس میں حضرت علامہ اقبال' ڈاکٹر کچلو' مولانا ظفر علی خاں' مولانا عبدالحق (ترقی اردو) حضرت حفیظ جالندھری' علامہ مبشرا لطرازی' پروفیسر ہادی حسن' مولانا احمد علی' مولانا غلام مرشد اور متعدد دیگر بزرگان ملت کے اسمائے گرامی درج تھے اور ان سب حضرات نے مسلمانوں کو اپنے خیالات سے مستفیض فرمایا۔"(۲۲)

انجمن اردو پنجاب

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے اتحاد و فکر و عمل کی ایک روشن شہادت . انجمن اردو پنجاب لاہور کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ انجمن اردو پنجاب کا قیام ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو میاں بشیر احمد کی کوٹھی "المنظر" (۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور) میں عمل میں لایا گیا۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد پنجاب میں اردو کی تنظیم و ترقی اور ہندی اردو تنازع میں اردو کا دفاع تھا۔ انجمن اردو پنجاب کے تیسرے اجلاس میں جو ۱۳ مئی ۳۶ء کو ساڑھے پانچ بجے سہ پہر "المنظر" میں منعقد ہوا' انجمن کے مختلف عہدہ داروں کا تقرر عمل میں آیا۔ پانچ سروں کو اس انجمن کا سرپرست بنایا گیا یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال' سرتیج بہادر سپرو' سر اکبر حیدری' سر راس مسعود اور سر عبدالقادر اس انجمن کے سرپرست قرار پائے۔ صدر انجمن پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

مقرر ہوئے- نائب صدور کی فہرست میں مولانا ظفر علی خاں' ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر' خواجہ دل محمد' پروفیسر محمد دین تاثیر اور سید حبیب کے اسمائے گرامی شامل تھے- سیکرٹری میاں بشیر احمد کو بنایا گیا- جائنٹ سیکرٹری کے لیے جناب خلیفہ عبدالحکیم کا نام تجویز ہوا- دو اسسٹنٹ سیکرٹری بنانے کا فیصلہ ہوا لیکن صرف ایک نام تجویز کیا گیا یعنی (مولانا) حامد علی خاں دوسرے اسسٹنٹ سیکرٹری کے نام کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی- اس انجمن کے چھ شعبے قائم کیے گئے اور ہر شعبہ کو الگ الگ ناظم کی نظامت میں کام کرنے کا اختیار دیا گیا-(۱۲۳) غالباً اکتوبر ۱۹۳۶ء سے جناب حفیظ ہوشیار پوری ایم اے نے انجمن اردو کے اسسٹنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا- اور انہوں نے انجمن اردو کی مختصر زندگی کے اواخر (مئی ۳۷ء) تک انجمن کے شاندار علمی و ادبی اجلاسوں کی مفصل روداديں شایان شان انداز میں لکھیں اور موقر اخبارات و جرائد میں شائع کرائیں- غالباً حضرت علامہ انجمن اردو کے کسی اجلاس میں شریک نہ ہو سکے لیکن انجمن کے لئے یہ اعزاز کچھ کم نہ تھا کہ حضرت علامہ اس کے سرپرست اول تھے- مولانا ظفر علی خاں بھی انجمن اردو کے شاید صرف ایک اجلاس میں شریک ہو سکے یہ اجلاس ۲۱ نومبر ۱۹۳۶ء کی شام کو "المنظر" میں منعقد ہوا تھا- روزنامہ "انقلاب" بابت ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کی رپورٹ کے مطابق :

"اس اجلاس میں لاہور کے مشہور ادباء و شعراء اور معززین نے شرکت کی- راجہ نرندر ناتھ صاحب نے صدارت کے فرائض انجام دیے- معززین میں بیگم شاہنواز' بیگم امتیاز علی تاج' بیگم بشیر احمد' مسٹر منوہر لال' علامہ (عبداللہ) یوسف علی' مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر جسٹس میاں عبدالرشید کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں- حسن اتفاق سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے آنریری سیکرٹری کاکا کالیکر لاہور تشریف لائے ہوئے تھے- انہیں چار بجے کے قریب ہی بلا لیا گیا تھا چنانچہ انہوں نے مولانا ظفر علی خاں' میاں صاحب اور چند دیگر حضرات کے ساتھ اردو ہندی جھگڑے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی اور واپس چلے گئے- افطار کے وقت میاں صاحب نے حاضرین کو چائے کی دعوت دی اس کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی-"

اس اجلاس کی متذکرہ بالا رپورٹ مطبوعہ انقلاب کے مطابق اس اجلاس میں مولانا ظفر علی خاں نے دو نظمیں سنائیں- مولانا کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک' پروفیسر حمید احمد خاں' حکیم احمد شجاع' پروفیسر فیاض محمود' پنڈت ہری چند اختر' میاں بشیر احمد' جناب احسان بن دانش' خلیفہ عبدالحکیم' اور ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے اس اجلاس میں اپنی نگارشات پیش کیں-(۱۲۴) انجمن اردو پنجاب نے پنجاب میں اردو کے فروغ و ترقی کے لیے گراں بہا خدمات انجام دیں اور اس

کے اجلاسوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں جاوداں نقوش مرتسم کیے لیکن افسوس یہ انجمن شعلہ مستعجل ثابت ہوئی۔

مولانا ظفر علی خاں مرکزی اسمبلی میں

۱۹۳۷ء میں خالد لطیف گابا کے رکن پنجاب اسمبلی منتخب ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں ان کی نشست خالی ہو گئی تھی۔ اس نشست کے لئے مولانا ظفر علی خاں کا نام اسلامی حلقوں کی طرف سے متفقہ امیدوار کے طور پر پیش ہوا لیکن کانگرس نے ان کے مقابلہ میں خان بہادر میاں چراغ الدین کے بیٹے میاں عبدالعزیز کو اپنے امیدوار کے طور پر کھڑا کر دیا۔ ارائیں برادری کے میاں افتخار الدین کانگرس کے ہمنوا اور میاں عبدالعزیز کے مددگار تھے لیکن "پنجاب کی ساری ارائیں برادری نے متفقہ طور پر مولانا ظفر علی خاں کی امداد کا وعدہ کیا اور کانگرس کے فریب خوردہ لیڈروں کو معلوم ہو گیا کہ وہ قبائلی عصبیت کے نام سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق کا بیج نہیں بو سکیں گے۔ ادھر علامہ اقبال نے خان بہادر میاں چراغ الدین کو بار بار پیغام بھیجا کہ خدارا اپنے صاحبزادہ کو سمجھایئے کہ ہندوؤں کا آلہ کار نہ بنے۔ میاں چراغ دین بڑے ہوش مند بزرگ تھے انہوں نے فوراً ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عمل کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ رسمی طور پر چند آدمیوں کا ایک بورڈ بنا دیجئے' جو مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کے معاملے میں ثالث بالخیر بن کر فیصلہ کرا دے... چنانچہ علامہ اقبال نے ملک برکت علی' میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء اور بیگم شاہ نواز پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جس نے اپنا فیصلہ مولانا ظفر علی خاں کے حق میں صادر کیا اور وہی انجام کار بلامقابلہ منتخب ہو گئے۔"(۱۳۵)بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی "مولانا ظفر علی خاں ۲۳ اگست ۱۹۳۷ء کو سنٹرل اسمبلی ہند دہلی میں بحیثیت ممبر شامل ہوئے اور اگست ۱۹۴۷ء تک اس کے ممبر رہے۔"(۱۳۶)

باہمی مشاورت

حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں کی باہمی مشاورت کی متعدد مثالیں پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ چند مزید مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

(i) مولانا ظفر علی خاں کی صحافتی زندگی کے ابتدائی مراحل میں مولوی انشاء اللہ خاں مدیر "وطن" نے مولانا کو دعوت دی کہ آؤ مل کر کام کریں۔ جناب عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں کہ "مولانا نے علامہ اقبال سے اس تجویز کا ذکر کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ کسی کو اپنے ساتھ

شریک نہ کریں کیونکہ اس سے بعد میں مشکلات پیش آئیں گی۔" (۱۲۷)

(ii) ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو حضرت علامہ نے جن سات اکابر کو (جنہیں برعظیم کے آسمان دین و ادب کا سبع سیارہ کہنا چاہیے) ایک نہایت ضروری امر میں مشورہ کے لیے اپنے اقبال خانے پر دعوت دی۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔ (۱۲۸)

(iii) اسی طرح مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۳۱ء میں اس امر کے تصفیہ کے لیے کہ مسلمان مشترکہ طور پر جداگانہ یا مخلوط طریق انتخاب میں سے کس کو اپنائیں' جن دس اصحاب کو (کہ انہیں برعظیم کی سیاسیات کا عشرہ مبشرہ کہنا چاہئے) لاہور آنے کی دعوت دی' ان میں حضرت علامہ اقبال کا نام نامی بھی شامل تھا۔ (۱۲۹)

(iv) اسی سلسلہ واقعات میں اکابر ملت کی اس متحدہ اپیل کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو یوم النبیؐ کے بارے میں ہفت روزہ "حمایت اسلام" لاہور کی جلد ۶ شمارہ ۲۷ بابت ۲ جولائی ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ اس متحدہ اپیل کو شائع کرانے والوں میں دیگر اکابر کے علاوہ حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔ اس اپیل کا متن درج ذیل ہے :

> "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کا آفتاب ساڑھے تیرہ سو سال گزرنے پر بھی نصف النہار پر ہے اور انشاء اللہ تاقیامت زوال پذیر نہ ہو گا۔ ہمارے سلف صالحین نے تبلیغ اسلام میں اپنا خون اور پسینہ ایک کر دیا تھا اور ہر زمانے کے ذرائع تبلیغ کو حد شریعت کے اندر رہ کر استعمال کیا تھا۔ آؤ ہم سب مل کر موجودہ زمانے کے موثر اور مفید ذریعہ تبلیغ کو اختیار کریں اور اس فرض تبلیغ کو ادا کریں جو ہمارے ہادی اور تمام عالم کے محسن کامل نے "بلغوا عنی" فرما کر ہم پر عائد کر دیا ہے۔ ہماری استدعا ہے کہ تمام ہندوستان کے طول و عرض میں سیرۃ النبیؐ کی اشاعت کے لیے ایک ہی دن تبلیغی جلسے کیے جائیں۔ ایسے جلسے جو حضورؐ کی رفعت قدر کے شایان شان ہوں اور جنہیں دنیا محسوس کر سکے۔ چونکہ ان جلسوں کو ۱۲ ربیع الاول سے طبعی مناسبت ہے کہ یہ تاریخ تمام مبلغین وحی کے سردارؐ اور دنیا کے مبلغ اکبرؐ کے پیدا ہونے اور فرائض تبلیغ ادا کر کے رحلت فرمانے کی تاریخ ہے' اس واسطے یہ تبلیغی جلسے ۱۲ ربیع الاول کو کیے جائیں اور تمام شہروں میں انتظام کے لیے معزز لوگوں کی سیرت کمیٹیاں بنا دی جائیں۔ اس دن تمام فرزندان اسلام علم اسلام کے نیچے جمع ہو کر یہ اقرار کریں کہ ہم اسوہ رسولؐ کی پیروی کریں گے اور ہماری نماز' قربانی' زندگی' اور موت اللہ کے لیے وقف ہو گی۔" (۱۳۰)

اجرائے زمیندار اور اقبال

جناب محمد الدین فوق نے اپنی کتاب اخبار نویسوں کے حالات میں بتایا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں اپنے والد محترم مولانا سراج الدین احمد خاں کی وفات کے بعد دسمبر ۱۹۰۹ء میں زمیندار کے مدیر بنے۔ اس وقت زمیندار ہفت روزہ تھا اور کرم آباد سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کو مئی ۱۹۱۱ء سے لاہور سے شائع کرنا شروع کیا۔ اور ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے اسے روزانہ کر دیا۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی 'روایات اقبال' میں لکھتے ہیں :

"مولوی ظفر علی خاں صاحب حیدر آباد سے تشریف لائے تو ان کا ارادہ تھا کہ وہ کرم آباد سے ایک اخبار نکالیں۔ مگر جب انہوں نے ڈاکٹر صاحب (حضرت علامہ اقبال) سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ کرم آباد میں اخبار چلنا مشکل ہے اس لیے آپ اسے لاہور میں لے آئیے اور یہیں کام کیجئے۔ مولوی صاحب مان گئے اور چند دن بعد ان کا اخبار زمیندار لاہور سے چھپنا شروع ہو گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب زمیندار کے لیے ہر روز ایک نظم لکھتے تھے اور انہیں نظموں کی وجہ سے اخبار بکا بھی کرتا تھا۔" (۱۳۱)

چغتائی صاحب کے اس ارشاد کے بعض پہلو محل نظر ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولانا ظفر علی خاں نے کرم آباد سے کوئی نیا اخبار نکالنے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ اخبار زمیندار کرم آباد سے پہلے سے جاری تھا۔ سراج الدین احمد خاں کی وفات کی وجہ سے صرف اس کی ادارت میں تبدیلی آئی۔ پھر چغتائی صاحب کا یہ تاثر دینا بھی بے رحمانہ مبالغہ آرائی کے ذیل میں آتا ہے کہ زمیندار صرف حضرت علامہ کی نظموں کی وجہ سے بکتا تھا۔ زمیندار کی اشاعت بڑھانے میں حضرت علامہ کی نظموں کا یقیناً اہم حصہ ہے مگر زمیندار کی اشاعت کو فروغ دینے میں بنیادی کردار خود مولانا ظفر علی خاں کی انقلابی شخصیت اور ان کے ولولہ آفریں قلم کا ہے۔

بہرحال یہ بات مسلمہ ہے کہ اخبار "زمیندار" سے حضرت علامہ کو ہمیشہ ہمدردی رہی اور سیاسی اختلافات کے ایک مختصر عرصہ کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ زمیندار کے قلمی معاون بھی رہے۔ جب یہ اخبار اپنی حریت آموزی اور خرمن استعمار پر شعلہ فشانی کے باعث زیر عتاب آ جاتا اور جرمانہ یا بندش یا پریس کی ضبطی وغیرہ جیسی سزاؤں سے نوازا جاتا تو حضرت علامہ کو اس کا بہت دکھ ہوتا اور جب یہ اخبار شورش کاشمیری کے الفاظ میں ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے نیا جنم لیتا تو حضرت علامہ اس پر اظہار مسرت فرماتے۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں "زمیندار" تیسری بار جاری ہوا تو

مولانا نے اس کے تین نمبر حضرت علامہ کو بھجوائے۔ اس زمانہ میں مولانا نے زمیندار اخبار کی ایک کمپنی بنائی تھی اور مسلمانوں سے اس کے حصص خریدنے کی اپیل کی تھی تاکہ اخبار کو زیادہ مستحکم اور منظم طور پر چلایا جا سکے۔ مولانا نے اس کمپنی کے لیے ایک تعارفی نظم بھی ارشاد فرمائی تھی جس کے تین شعر درج ذیل ہیں۔

بنی ہے زمیندار کی کمپنی
مدینہ کی سرکار کی کمپنی
مسلمان کیوں ہوں نہ اس میں شریک
یہ ہے ان کے اخبار کی کمپنی
طلسم غلامی کو دے گی یہ توڑ
یہ ہے سارے احرار کی کمپنی(۱۳۲)

اس سلسلے میں حضرت علامہ نے مولانا کو ۲۶ جون ۱۹۳۲ء کو ذیل کا مکتوب تحریر فرمایا :

"ڈیئر مولانا ظفر علی خاں۔ السلام علیکم۔ "زمیندار" کے تین نمبر جو آپ نے بہ کمال عنایت ارسال فرمائے تھے، مجھے مل گئے ہیں۔ اس عنایت کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ زمیندار کے اجرائے مکرر سے ملک کے ادب، صحافت اور سیاسیات میں مزید اضافہ ہو گا۔ جو تجویز آپ نے اس کی بنیاد کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے اختیار کی ہے، میں اس کی کامیابی کے لیے دست بدعا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ مخلص محمد اقبال۔"(۱۳۳)

اسی طرح ۱۹۳۳ء میں یہ اخبار تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں عارضی طور پر بند رہنے کے بعد پھر جاری ہوا تو حضرت علامہ نے ۸ جولائی ۱۹۳۳ء کو مولانا ظفر علی خاں کو یہ خط لکھا :

"ڈیئر مولانا ظفر علی خاں۔ السلام علیکم۔ زمیندار کی حیات ثانیہ مبارک ہو۔ امید ہے کہ گزشتہ تجربہ نے آپ کو موجودہ حالت اور اس کے مقتضیات کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد دی ہو گی۔ میں آپ کے لئے دست بدعا ہوں۔ محمد اقبال۔"(۱۳۴)

کلام اقبال کی اشاعت اور ان کی تصانیف کا خیر مقدم

کلام اقبال کی اشاعت و ترویج میں بھی مولانا ظفر علی خاں معاصر ارباب صحافت سے پیچھے نہ تھے۔ ان کے جاری کردہ جرائد و اخبارات میں حضرت علامہ کا کلام وقفوں وقفوں سے برابر شائع ہوتا رہا۔ چنانچہ دکن ریویو، پنجاب ریویو، ستارہ صبح، اور زمیندار کے صفحات کلام اقبال کی تجلیوں

سے جگمگاتے نظر آتے ہیں- مثال کے طور پر دکن ریویو میں ان کی درج ذیل تخلیقات شائع ہوئیں-

(i) مارچ ۱۹۰۴ء کے شمارہ میں حضرت علامہ کی مشہور نظم "رخصت اے بزم جہاں" شائع ہوئی- ترمیم و انتخاب کے بعد اب یہ نظم بانگ درا میں شامل ہے-(۱۳۵)

(ii) اگست ۱۹۰۴ء کے شمارہ میں وہ غزل شائع ہوئی جس کا مطلع ہے-

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی' بستی کے یارب رہنے والے ہیں

حضرت علامہ کی یہ غزل مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اس کے تتبع میں پچیس اشعار کی ایک غزل کہہ ڈالی جو دکن ریویو کے شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی- جناب شاد کی اس غزل پر مولانا ظفر علی خاں نے ادارتی نوٹ دیتے ہوئے لکھا :

"اگست کے دکن ریویو میں ہمارے دوست مکرم پروفیسر اقبال کی جو غزل شائع ہوئی تھی' اس کی بلاغت و لطافت ارباب ذوق پر ظاہر ہوئی ہو گی- پچھلے دنوں جب ہمیں ایوان وزارت میں حاضر ہو کر ہز ایکسی لینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد بالقابہم کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوا تو جناب وزارت ماب نے فرمایا کہ غزل اقبال' جناب ممدوح کو اس قدر پسند آئی کہ آپ نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی-"

جناب شاد کی متذکرہ غزل کا مطلع درج ذیل ہے-

یہ سب دیر و حرم کے لوگ اپنے دیکھے بھالے ہیں
عدم آباد اک بستی ہے واں کے رہنے والے ہیں
(نقوش شمارہ نمبر ۱۴۰- مضمون بعنوان دکن ریویو از جناب اکبر حیدری کشمیری)

(iii) نومبر دسمبر ۱۹۰۴ء کے دکن ریویو میں حضرت علامہ کی نظم "موج دریا" ارباب ادب کی نظر افروزی کا باعث بنی- اس نظم کا پہلا شعر یہ ہے-

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بے تاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے

(iv) ستمبر تا دسمبر ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں ان کی وہ مشہور غزل زینت اوراق بنی جس کا مطلع ہے-

مثال پرتو مے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں(۱۳۶)

پنجاب ریویو کے شمارہ مارچ و اپریل ۱۹۱۱ء (شمارہ ۸-۹) میں حضرت علامہ کی مشہور نظم "شکوہ" شائع ہوئی۔ اسی جریدہ کے بارہویں شمارہ میں حضرت علامہ کی ایک ناتمام نظم کے چند اشعار شائع ہوئے۔(۱۳۷) مثنوی رموز بے خودی کے بعض اشعار مع ترجمہ و تفسیر ستارہ صبح میں شائع ہوئے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔ اسی طرح روزنامہ 'زمیندار' میں بھی وقتاً" فوقتاً" حضرت علامہ کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی تھیں۔ مثلاً پیام مشرق کی وہ غزل جس کا مطلع درج ذیل ہے' ۳ اپریل ۱۹۲۴ء کے زمیندار میں اشاعت پذیر ہوئی۔

سر خوش از بادہ تو خم شکنے نیست کہ نیست
مست لعلین تو شیریں سخنے نیست کہ نیست

۱۴ جولائی ۲۴ء کے زمیندار میں زبور عجم کی ذیل کے مطلع والی غزل شائع ہوئی۔

غزل سرا و نواہائے رفتہ باز آور
بہ ایں فسردہ دلاں حرف دلنواز آور

۱۳ مارچ ۱۹۲۷ء کے زمیندار میں وہ نظم نظر نواز ہوئی جو اب زبور میں نیا چناں کن یا چنیں' کے ترجیعی ٹکڑے کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔

اسی طرح "پنجاب ریویو" اور "ستارہ صبح" میں حضرت علامہ کے بعض نہایت اہم نثری مضامین اور مکاتیب بھی شائع ہوئے۔ مثلاً ان کا مضمون "رسول اللہ صلعم فن شعر کے مبصر کی حیثیت میں" ستارہ صبح کے ۸ اگست ۱۹۱۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اور زمیندار میں مطبوعہ حضرت علامہ کے بیانات و مراسلات وغیرہ کی فہرست تو خاصی طویل ہے۔ اس کی بعض جھلکیاں "گفتار اقبال" مرتبہ جناب محمد رفیق افضل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت علامہ اپنی تخلیقات اور بالخصوص منظوم تخلیقات کو اخبارات و جرائد میں اشاعت کی عام اجازت دینے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اس سلسلہ میں باقاعدہ مقدمہ بازی پر بھی اتر آتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اور ان کے جاری کردہ جرائد و اخبارات نے حضرت علامہ کی تصانیف کو بھی بڑے فراخ دلانہ اور بہجت آگیں انداز میں خوش آمدید کہا۔ مثلاً "اسرار خودی" شائع ہوئی تو "زمیندار" میں اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ مبصر (نامعلوم) نے لکھا :

"مدعائے اسلام یہی ہے کہ ہر مسلمان اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے اثر سے آگاہ ہو۔ ان سے کام لینا سیکھے اور ان ثغور و حدود کے اندر رہ کر کام کرے جو قانون قدرت و قرآن مجید نے مقرر کر دیے ہیں۔ یہی چیز تھی جس کو ہم اب تک بھولے ہوئے تھے اور اسی بھول جانے کا نتیجہ ہمارا

موجودہ تنزل و انحطاط ہے اور یہی بھولا ہوا سبق ہے جسے ڈاکٹر اقبال نے اپنی فارسی مثنوی اسرار خودی کے ذریعہ سے ہم کو پھر یاد دلایا ہے۔ ہم نے اس مثنوی پر مفصل تبصرہ کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کے حقائق و معارف اتنے وسیع ہیں کہ حق تبصرہ ادا ہو سکتا ہی نہیں... غرض یہ کہ یہ کتاب قرآن کریم کی سچی اور اصلی تفسیر ہے اور ہم اس سے زائد اس پاک ترین مثنوی کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کی حقیقی تعلیم کی یہ ایک مقدس شرح ہے جس کا پڑھنا اور جس پر عمل کرنا ہر ایک انسان کا سب سے پہلا فرض ہونا چاہئے۔"(۳۸) اور مثنوی "رموز بے خودی" کا خیر مقدم کرتے ہوئے "ستارہ صبح" کے ۱۷ اپریل ۱۹۱۸ء کے شمارہ میں لکھا گیا :

> "لسان توحید' ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شاعرانہ سرگرمیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کا سلسلہ مدت مدید سے جاری ہے.... ڈاکٹر اقبال کو مبدء فیاض سے جو نکتہ رس و نکتہ سنج طبیعت اور جو فلسفیانہ و شاعرانہ دماغ عطا ہوا ہے' اگر سچ پوچھئے تو ابھی دنیا نے اس کی اس حد تک قدر و منزلت نہیں کی جس کا وہ حقیقت میں مستحق ہے۔ اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کے اردو ترانے دربار عام سے شہرت و قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں لیکن اب کچھ عرصہ سے علامہ ممدوح کی توجہ فارسی کی طرف منعطف ہوئی ہے اور اس میدان میں بھی آپ نے تخیل کے زبردست تازیانوں سے سمند فکر کو جیسے جیسے کاوے دیئے ہیں' ان کا اعتراف ہندوستانی تو کیا بڑے بڑے ماہر و مشاق ایرانی شہ سواروں کو بھی کرنا پڑے گا۔"

پیام مشرق کا بسیط تعارف جناب چودھری محمد حسین کے قلم سے زمیندار کے تین شماروں (۱۷' ۱۹' ۲۱- مارچ ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا۔ اسی طرح مولانا اور ان کے جرائد و اخبارات نے حضرت علامہ کی دیگر تصانیف کا بھی پر جوش خیرمقدم کیا۔ اگر کسی وجہ سے حضرت علامہ کی کسی تازہ وارد تصنیف کے بارے میں اپنی کثرت مشاغل کے سبب مولانا خود نہ لکھ سکتے تو کسی اور اہل نظر کو اس شرف اندوزی کی دعوت دیتے اور پھر ان تحریروں کو زمیندار میں چھاپ دیتے۔ بعض اوقات وہ حضرت علامہ کی تازہ تصنیف سے کوئی منتخب نظم یا غزل ہی شائع کر دیا کرتے تھے اور یہ گویا اس تازہ تصنیف کا اشتہار ہوتا تھا۔

نگارشات اقبال کے تراجم

مولانا ظفر علی خاں اردو' فارسی اور انگریزی زبانوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ اپنی اس زبردست استعداد سے کام لے کر انہوں نے ترجمہ کے باب میں بعض زندہ جاوید یادگاریں چھوڑی

ہیں مثلاً انہوں نے لارڈ کرزن کی ایک کتاب Persia and the Persian question کی پہلی جلد کا ترجمہ "خیابان فارس" کے نام سے کیا تھا۔ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر (۱۸۱۱ - ۱۸۸۲ء) کی کتاب A History of the Conflict between Religion and Science کا ترجمہ "معرکہ مذہب و سائنس" کے نام سے کیا۔ رڈیارڈ کپلنگ (۱۸۶۵-۱۹۳۶ء) کی تصنیف The Jungle Book کو "جنگل میں منگل" کا روپ دیا۔ رائیڈر ہیگرڈ کے ناول The people of the mist کا "سیر ظلمات" کے نام سے ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ بھی مولانا نے کئی مترجمانہ کارنامے سرانجام دیے اور ایک بلند پایہ مترجم کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا۔ چنانچہ آپ کو حضرت علامہ کی بعض تحریروں کے تراجم کرنے کا بھی موقع ملا اور ان کے یہ تراجم دنیائے ادب میں مقبول و معتبر ٹھہرائے گئے۔ مثلاً انہوں نے حضرت علامہ کے ایک انگریزی مقالے "مسلم کمیونٹی" کا ترجمہ بعنوان "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کیا تھا۔ اس ترجمہ کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں :

> "اسی سال (۱۹۱۰ء) دسمبر میں انہوں (علامہ اقبال) نے ایک انگریزی مقالہ بعنوان "مسلم کمیونٹی" ایم اے او کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں پڑھا۔ بعد میں اس کے بیشتر حصہ کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے اردو میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان کے تحت کیا۔"(۱۳۹)

یہ ترجمہ سب سے پہلے غالباً پنجاب ریویو کے شمارہ مارچ و اپریل ۱۹۱۱ء (نمبر ۸-۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس ترجمہ کے بارے میں جناب محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں :

> "مئی ۱۹۱۱ء میں برکت علی ہال لاہور میں یہ ترجمہ ایک عام جلسے میں سنایا گیا۔ یہ جلسہ محض اسی لیکچر کو سنانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے خود ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا۔ علامہ اقبال بھی جلسہ میں شریک تھے۔"(۱۴۰)

۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خاں نے حضرت علامہ کے بعض فارسی اشعار کے ترجمہ و تفسیر سے اپنے جریدہ "ستارہ صبح" کی آب و تاب بڑھانے کا اہتمام کیا۔ یہ تراجم ضمیمہ کتاب میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ ان تراجم میں مولانا نے اشعار کے لفظی ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ روح شعر کو بیان کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے۔

حضرت علامہ اقبال کی طرف سے مولانا کی اعلیٰ مترجمانہ صلاحیت کے استحسان کی ایک شہادت علامہ کے انگریزی مقالہ "اجتہاد فی الاسلام" سے متعلق ہے۔ یہ مقالہ حضرت علامہ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ہال اسلامیہ کالج لاہور میں سر شیخ عبدالقادر کے زیر صدارت پڑھا تھا۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی بھی اس محفل میں شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

"مضمون کے اختتام پر صدر جلسہ شیخ عبدالقادر نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ اقبال کا یہ علمی کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مولوی ظفر علی خاں نے فرمایا کہ یہ مضمون اردو زبان میں منتقل ہونا چاہئے جس پر علامہ نے فوراً کہا کہ میں بہ طیب خاطر اس کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ مولانا ظفر علی صاحب خود اس کے ترجمہ کی زحمت فرمائیں کیونکہ وہی اس کا بہتر ترجمہ کر سکتے ہیں۔" (۱۴۱)

حضرت علامہ مولانا ظفر علی خاں کے اسلوب ترجمہ کو کتنا پسند کرتے تھے اس کا کچھ اندازہ سید نذیر نیازی کے نام حضرت علامہ کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جن میں حضرت علامہ کے مضمون "اسلام اور احمدزم" کے ترجمہ کا ذکر ہے۔ حضرت علامہ نے ۳ فروری ۱۹۳۶ء کو نیازی صاحب کو لکھا :

"آپ نے لکھا تھا کہ ترجمہ اسلام اور احمد زم تیار ہو گیا ہے۔ مہربانی کر کے جلد مطلع کریں کب شائع ہو گا۔ اگر آپ سے نہیں ہو سکا تو بعض احباب یہ کہتے ہیں کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب سے کرایا جائے۔" (۱۴۲)

اور ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو آپ نے اس سلسلہ میں جناب نیازی کو پھر لکھا :

"معلوم ہوتا ہے انجمن خدام الدین سے آپ نے اسلام اور احمد زم کا ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں لی۔ وہ شاکی ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ مولوی ظفر علی خاں سے اس کا ترجمہ کروا کر اسے مفت شائع کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ ان سے ضرور دریافت کر لینا چاہئے تھا... انجمن سے آپ کو ضرور فیصلہ کر لینا چاہئے کیونکہ اگر انہوں نے اردو ترجمہ مفت شائع کر دیا تو آپ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔" (۱۴۳)

نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقبال اور ظفر

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں دونوں عشق رسول کے سرمایہ دار تھے اور دونوں حضرات نے نعت نبیؐ میں قابل رشک شاہکار یادگار چھوڑے ہیں۔ اس مقدس اشتراک فکر و عمل میں دونوں صاحبان کو ایک دوسرے کی عظمتوں کا احساس اور اعتراف بھی تھا۔ حضرت علامہ کے عشق رسولؐ اور ان کی ملی خدمات کا اعتراف مولانا نے متعدد مواقع پر فرمایا۔ مولانا کی نعت نگاری کے بارے میں حضرت علامہ کی رائے کا اظہار سید بادشاہ حسین کے بیان کردہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ حضرت علامہ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں :

"شعر و ادب کی باتیں ہوتی رہیں۔ موجودہ رجحان کا ذکر بھی چھڑا۔ نعت گوئی کا قصہ

چھیڑا۔ میں نے عرض کیا "آپ کی نعت اور منقبت خصوصاً فارسی میں مجھے بے حد پسند ہے۔" وہ دفعتاً" گنگنانے لگے پھر بہ آواز بلند ایک نعت سنائی۔ وہ مجسم تاثر تھے اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ کس قدر عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یکایک پڑھنا بند کر دیا اور کہنے لگے "تمہیں نعت سننے کا شوق ہے تو چلو میرے ساتھ۔ تمہیں نعت سناؤں۔ ایسی کہ دل خوش ہو جائے۔" جلدی سے کپڑے پہنے اور مجھے ساتھ لے کر باہر نکلے۔ میں حیران تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ راستہ میں خود ہی بتایا کہ "نعت کا بادشاہ تو ظفر علی خاں ہے اس سے سنیں گے۔" مولانا ظفر علی خاں کے پاس پہنچے اور فوراً ہی نعت پڑھنے کی فرمائش کی۔ وہ سنانے لگے۔ ایک کے بعد دوسری۔ ویسے تو ظفر علی خاں بھی متاثر تھے لیکن علامہ اقبال پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ آنکھوں میں آنسو تیرتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔"(۱۴۴)

اقبال کی وفات

اقبالؒ کی وفات کے وقت مولانا مسلم لیگ کے ایک اجلاس کے سلسلہ میں کلکتہ میں تھے۔ وہیں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ نظم کہی۔

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صف ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا
سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کو ابھرنا
ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہی درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا
ملت کو نئی زندگی اقبال نے بخشی
ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا(۱۴۵)

۱۸ اپریل ۱۹۴۰ء کو سٹی مسلم لیگ سیالکوٹ کے جلسہ میں فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے۔

اقبال جس کا نام ہے وردِ زبانِ خلق
نازاں ہے اس کی ذات پہ خاکِ سیالکوٹ

اس کا کلام زندہ جاوید ہو گیا
ہر زمزمہ نے اس کے لگائی جگر پہ چوٹ(۱۴۶)

اقبال کی رائے ظفر علی خاں کے بارے میں

مولانا ظفر علی خاں اور حضرت علامہ کی آراء ایک دوسرے کے بارے میں پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں۔ مولانا کے بارے میں حضرت علامہ کی چند دیگر آرا بھی ملاحظہ ہوں۔ آپ مولانا کی علمی و ادبی اور دینی و ملی خدمات کے ہمیشہ مداح رہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام ۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء کے خط میں حضرت علامہ نے لکھا :

"مولوی ظفر علی خاں حیدر آباد طلب کر لیے گئے۔ آج میں نے اخبار میں دیکھا کہ وہ وہاں پہنچ گئے۔ نہایت قابل آدمی ہیں اور ان کا ذہن مثل برق کے تیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی علمی قابلیت سے ریاست کو بہت فائدہ ہو گا۔"(۱۴۷)

۲۹ جنوری ۱۹۳۶ء کو انہوں نے روزنامہ احسان لاہور کے ظفر علی خاں نمبر کے لیے درج ذیل پیغام دیا :

"میرے نزدیک مولانا ظفر علی خاں ایک غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ ان کی ہمت بلند ہے اور ان کا قلم اپنی روانی میں بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں۔ یوں تو سارا ہندوستان ان سے متاثر ہوا ہے لیکن پنجاب کے مسلمانوں پر ان کا خصوصیت سے احسان ہے کیونکہ مذہبی ادبی اور سیاسی اعتبار سے انہوں نے اس صوبے کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔"(۱۴۸)

جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مولانا کے بارے میں حضرت علامہ کی درج ذیل رائے بلاحوالہ درج کی ہے :

"ظفر علی خاں کے قلم میں مصطفیٰ کمال کی تلوار کا بانک پن ہے۔ انہوں نے مسلمانان پنجاب کو نیند سے جھنجھوڑنے میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔"(۱۴۹)

اقبال سے فیض یابی

مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کی شخصیات اور ان کے افکار و رجحانات کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ دونوں اکابر میں فکر و عمل کے اعتبار سے غیر معمولی ہم آہنگی اور یکجہتی پائی جاتی تھی۔ علمی و ادبی، دینی و ملی ٖطور سیاسی و عمرانی امور میں دونوں حضرات

متفق المیال تھے۔ دونوں اکابر نے نظم و نثر دونوں کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور ان کی تخلیقی طبائع کی جودت و ثروت سے شاعری اور نثرنگاری دونوں یکساں طور پر مالا مال ہوئیں۔

اصناف سخن کے لحاظ سے حضرت علامہ کی توجہ نظم اور غزل دونوں پر یکساں رہی اور ان کے یہاں نظموں میں ہیئت کا تنوع مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مولانا نے غزل برائے نام کہی اگرچہ ان کی نظموں میں تغزل کی کمی نہیں۔ دونوں اکابر کے پیرایہ ہائے اظہار انفرادی شان رکھتے ہیں لیکن دونوں اکابر کے منفرد اسالیب میں بعض اشتراکات کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً بلند آہنگی، جوش بیان، جلال و شکوہ، حسین و بدیع تراکیب، معنی افروز تلمیحات وغیرہ خصوصیات کلام دونوں حضرات کے یہاں پائی جاتی ہیں مجموعی تاثر کے اعتبار سے، جہاں تک فکر و فلسفہ کا تعلق ہے، حضرت علامہ مولانا ظفر علی خاں کے شریک غالب معلوم ہوتے ہیں اور بیان و اظہار کے اسالیب کی رو سے دیکھیں تو بھی حضرت علامہ کا سٹائل نسبتاً زیادہ مقطع زیادہ خوش رنگ اور زیادہ جاذب دل و نگاہ ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہو گا کہ اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود حضرت مولانا کا طرز بیان کہیں کہیں حضرت علامہ کے اسلوب بیان کا زیر بار احسان بھی ہوتا نظر آتا ہے یعنی بعض اوقات مولانا، حضرت علامہ کے وضع کردہ پیرایہ ہائے بیان میں اپنی بات کہتے نظر آتے ہیں۔ تاہم انہیں حضرت اقبال کا پیرو نہیں کہا جا سکتا۔ فکر و فن میں پیروی اقبال کے "خطرات" سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ چنانچہ جناب عبدالکریم ثمر مرحوم کے مجموعہ کلام "کاخ بلند" پر رائے دیتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا :

> "ثمر نے شیشہ نظم میں بادہ اقبال بھی انڈیلنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ شراب اس درجہ تند و تیز واقع ہوئی ہے کہ یہ نازک شیشہ اسے آغوش میں نہیں لے سکتا....
> کیونکہ اقبال کی راہ پر چلنا ہر راہرو کا کام نہیں ہے۔ اس وادی میں تو رہبر بھی گمراہ ہو جایا کرتے ہیں۔"(۱۵۰)

بہرحال حضرت علامہ سے حضرت مولانا کی عارضی اور برائے نام اثر پذیری کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں :

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور مولانا اس اقبالی پیرایہ بیان کو اپنے مفہوم کے ابلاغ کے لیے یوں برتتے ہیں :

ان تین خداؤں میں بڑا سب سے ہے پٹرول
کرتے ہیں جسے سجدہ زمانے کے سلاطین(۱۵۱)

یا مثلاً حضرت علامہ اپنی نظم "طلوع اسلام" میں فرماتے ہیں :

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اور حضرت مولانا اپنی ایک نظم "لمحات" میں لکھتے ہیں :

عجب کیا ہے کہ شردھانند بھی اک دن مسلماں ہو
لہو اسلام کا ٹپکے اگر کافر کا دل چیریں(۱۵۲)

حضرت علامہ کی نظم "جواب شکوہ" کا مشہور شعر ہے :

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اور حضرت مولانا اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں :

سید ہو یا پٹھان ہو مرزا ہو یا بلوچ
دیں سے بھی کچھ لگاؤ ہے اس بات کو تو سوچ(۱۵۳)

یا مثلاً جمعیت اقوام پر حضرت علامہ نے "کفن دزد" کی ترکیب کا اطلاق فرمایا تھا :

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اور مولانا استعمار کوش مغربیوں کو "کفن چور" کے نام سے یاد فرماتے ہیں :

مشرق میں غریبوں کی نہیں کوئی رہی گور
سر پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں مغرب کے کفن چور(۱۵۴)

یا مثلاً اقبال شیعہ اور سنی کی افتراق پسندی کو ہوا دینے والوں کے لیے "گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ" کی ترکیب اپنے ایک شعر میں لاتے ہیں :

اے کہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اور مولانا بھی اس ترکیب سے کام لیتے ہیں

گرفتاران بوبکرؓ و علیؓ اچھی طرح سن لیں
کہ ان کی چپقلش نے کام غیروں کا نکالا ہے(۱۵۵)

تاہم اس معاملے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں حضرات اپنے اپنے طور پر شیخ عطارؒ سے مستفید ہوئے ہیں

ز نادانی دل پر جہل و پر مکر
گرفتار علیؓ ماندی و بوبکرؓ

لیکن حضرت علامہ سے حضرت مولانا کی فیض یابی کی یہ چند مثالیں غیر شعوری استفادہ یا محض فکری و وجدانی ہم رنگی کی شہادتیں ہیں۔ چونکہ دونوں اکابر ملت اسلامیہ کے مایہ ناز فرزند تھے' برعظیم میں دین' سیاست' ادب اور عمرانیات وغیرہ کے شعبوں میں قائدانہ مناصب پر فائز تھے اور ملی و قومی زندگی کے اکثر مرحلوں اور محاذوں پر دونوں ہم موقف اور ہم ہدف بھی تھے' اس لیے دونوں کے یہاں فکری و وجدانی ہم رنگی کا ظہور ایک فطری بات تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مزاج' طریق کار' علمی' پیشہ ورانہ اور معاشرتی پس منظر اور تخلیقی رویوں کے امتیاز نے دونوں حضرات کے اسلوب بیان یا سٹائل کو انفرادیت یا جداگانہ تشخص سے بھی مشرف کیا تھا۔ دونوں اکابر کے منفرد اسالیب نے اپنے اپنے دائروں میں اپنے معاصرین کو متاثر ہی نہیں مائل بہ تقلید بھی کیا۔ یوں دونوں حضرات اپنے جدا جدا' دبستانوں کے بانی قرار دیئے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کے مابین فکری اور عملی اشتراک و اتحاد کی یہ تابناک شہادتیں ہماری ملی و قومی تاریخ کا سرمایہ نازش بھی ہیں اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے قندیل ہدایت بھی! پاکستان کے قیام و استحکام کے حوالے سے بھی دونوں زعماء کا اشتراک فکر و عمل ہماری ملی سیاسیات کا ایک دلنواز منظر نامہ ہے لیکن یہ کہانی ایک الگ باب میں کہی جا رہی ہے کیونکہ اس کہانی کی اہمیت' طوالت اور یکتائی کا تقاضا بھی یہی ہے۔

حوالے اور حواشی

۱- ماہنامہ دلگداز- شمارہ بابت مارچ ۱۹۰۴ء

۲- جناب عابد رضا بیدار نے اپنی کتاب "اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار" میں اس نظم کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام "پروانہ و شمع" درج کیا ہے- یہ سہو قلم ہے- "پروانہ و شمع" کے عنوان سے جو نظم دکن ریویو کے شمارہ مارچ ۱۹۰۴ء میں چھپی ہے وہ نادر کاکوروی کا نتیجہ فکر ہے- حضرت علامہ کی نظم "رخصت اے بزم جہاں" ہی کے عنوان سے شائع ہوئی تھی-

۳- مازنی- اٹلی کا حریت دوست رہنما جوزف میزنی (۱۸۰۵- ۱۸۷۲ء) جس نے ملک و قوم کے لیے قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور قید خانے ہی میں فوت ہوا-

۴- سید نذیر نیازی دانائے راز اقبال اکادمی طبع ثانی ۱۹۸۸ء ص ۱۳۸

۵- دکن ریویو بابت فروری ۱۹۰۹ء ادارتی شذرہ-

۶- مولانا غلام رسول مہر- اقبالیات مہر مرتب امجد سلیم علوی مہر سنز' لیمینڈ مسلم ٹاؤن لاہور ص ۱۰- ۱۱-

۷- مولانا ظفر علی خاں- بہارستان مکتبہ کارواں- س -ن- ص ۴۸۵

۸- چٹان- اقبال نمبر- بابت ۲۵- اپریل ۱۹۳۹ء

۹- غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری (مرتبین) سرود رفتہ- شیخ غلام علی اینڈ سنز- ۱۹۵۹ء- ص ۲۳۵- ۲۳۶

۱۰- ایضاً- ص ۲۳۶

۱۱- مولانا غلام رسول مہر- مطالب بانگ درا شیخ غلام علی اینڈ سنز- ۱۹۷۶ء ص ۲۴۸

۱۲- مولانا غلام رسول مہر مختصر تاریخ اسلام شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۸ء- ص ۳۱۲

۱۳- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اقبال ایک مطالعہ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۷ء- ص ۴۷

۱۴- ڈاکٹر صادق حسین- لاہور (مرتب) انمول موتی حصہ دوم س- ن- ص ۵۶

۱۵- بہارستان- ص ۱۹۴

۱۶- مولانا ظفر علی خاں- نگارستان مکتبہ کارواں- س ن ص ۳۶ تا ۳۸

۱۷- محمد طفیل- مکرم- ادارہ فروغ اردو- لاہور ۱۹۸۶ء ص ۱۶۲- ۱۶۳

۱۸- ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی- اقبال کی صحبت میں مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء- ص ۷۶' ۷۷

۱۹- مطالب بانگ درا- ص ۲۳۴- نیز اقبالیات مہر ص ۱۲

۲۰- اقدام- ۱۶- مئی ۱۹۵۴ء- مضمون حکیم محمد حسن قرشی

۲۱- دانائے راز- ص ۲۳۵- ۲۳۶

۲۲- روزنامہ زمیندار- ۳- دسمبر ۱۹۱۲ء

۲۳- اشرف عطا مولانا ظفر علی خاں ص ۴۳ لیکن جناب اشرف عطا کی یہ اطلاع درست معلوم نہیں

ہوتی کہ جلسہ مذکور کی صدارت مولانا ظفر علی خاں نے فرمائی تھی۔ اس ضمن میں روزنامہ زمیندار کی فراہم کردہ اطلاع زیادہ معتبر سمجھی جانی چاہیے۔

۲۴۔ بہارستان۔ ص ۴۵۷

۲۵۔ روزنامہ زمیندار۔ لاہور۔ بابت ۲۹۔ نومبر ۱۹۱۲ء

۲۶۔ انمول موتی۔ حصہ دوم۔ ص ۴۶

۲۷۔ نگارستان۔ ص ۴۷

۲۸۔ انمول موتی حصہ دوم۔ ص ۵۶

۲۹۔ زمیندار۔ جوبلی نمبر ۱۹۵۳ء۔ ص ۳۷

۳۰۔ انمول موتی۔ حصہ دوم ص ۶۰

۳۱۔ اشرف عطا مولانا ظفر علی خان ص ۵۵ نیز مولانا ظفر علی خاں۔ احوال و آثار از ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۶ء ص ۱۰۴

۳۲۔ پروفیسر حمید احمد خان (مرتب) ارمغان حالی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۶۰۔ ۲۶۱

۳۳۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی روایات اقبال مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۱۳۔ ۱۱۴

۳۴۔ رحیم بخش شاہین اوراق گم گشتہ۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔ ص ۳۵۴

۳۵۔ عبدالمجید سالک یاران کہن مکتبہ چٹان لاہور س۔ ن۔ ص ۷۱

۳۶۔ مقالات اقبال۔ سید عبدالواحد معینی۔ شیخ محمد اشرف۔ لاہور مئی ۱۹۶۳ء۔ ص۔ ع

۳۷۔ ستارہ صبح۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء

۳۸۔ ستارہ صبح ۱۵۔ نومبر ۱۹۱۷ء

۳۹۔ بہارستان ص ۴۶۹

۴۰۔ روزنامہ آفاق۔ ۲۔ دسمبر ۱۹۵۶ء

۴۱۔ چمنستان۔ از مولانا ظفر علی خاں۔ مکتبہ کارواں۔ س ن ص ۸۳، ۸۴

۴۲۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۷۳

۴۳۔ عبدالغفار شکیل۔ اقبال کے نثری افکار۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔ ۱۹۷۷ء۔ ص ۹۴

۴۴۔ ستارہ صبح بابت ۳۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ بشیر احمد ڈار انوار اقبال۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۸۴۔ ۱۸۵

۴۷۔ شیخ عطاء اللہ ایم اے۔ مرتب۔ اقبال نامہ حصہ دوم۔ شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء۔ ص ۱۸۹ تا ۱۹۱

۴۸۔ ستارہ صبح۔ ۲۴ نومبر ۱۹۱۷ء۔ نیز نگارستان ص ۶۱۔ باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی میں اس نظم کو سہوا" علامہ اقبال کی تخلیق قرار دیا گیا ہے۔

۴۹۔ محمد حنیف شاہد ایم اے اقبال اور انجمن حمایت اسلام ناشر کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور۔

۱۹۷۶ء- ص ۵۴ تا ۵۶

۵۰- بہارستان ص ۴۳۹- ۴۴۰

۵۱- ہفت روزہ حمایت اسلام- بابت ۱۷- نومبر ۱۹۳۸ء

۵۲- سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی (مرتبین) باقیات اقبال آئینہ ادب- لاہور- ۱۹۷۸ء- ص ۳۶۸

۵۳- کلیات اقبال اردو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور- ۱۹۸۶ء ص ۲۵۷

۵۴- ایضاً ص ۲۹۱

۵۵- کلیات اقبال فارسی- شیخ غلام علی اینڈ سنز- مئی ۸۵ ص ۳۳۵

۵۶- ظفر علی خاں مولانا' روح معانی- مکتبہ زمیندار لاہور ۱۳۳۹ھ ص ۴۷

۵۷- پیغام حیات- مولانا ظفر علی خاں کا خطبہ صدارت- منصور سٹیم پریس لاہور س- ن- ص ۶۴

۵۸- مولانا ظفر علی خاں حبسیات منصور سٹیم پریس ۱۹۳۶ء- ص ۹۲

۵۹- زاہد علی خاں- مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری-مقالہ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری- لاہور

۶۰- حبسیات-- ص' ۴۷

۶۱- راوی- جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۲۴ء

۶۲- زمیندار- ۱۹ جنوری ۱۹۲۵ء- شیخ سے مراد شیخ عبدالقادر صاحب صدر مجلس وضع آئین و قوانین پنجاب ہیں-

۶۳- پروفیسر صابر کلوروی- اقبال کے ہم نشیں مکتبہ خلیل لاہور ۱۹۸۵ء- ص ۴۴

۶۴- اقبال کے حضور- اقبال اکادمی پاکستان- لاہور- ۱۹۸۱ء- ص ۲۵۹

۶۵- عبدالمجید سالک ذکر اقبال- بزم اقبال لاہور س ن- ص ۱۲۷ تا ۱۳۰

۶۶- **القسورہ علی دوار الحمر الکفرہ علی ظفر رستہ من کفر** مکرر اشاعت دسمبر ۱۹۸۲ء انجمن ارشاد المسلمین لاہور ص ۵-

۶۷- چٹان- ۳- دسمبر ۱۹۶۲ء

۶۸- بہارستان ص ۵۱۸

۶۹- ایضاً ص ۵۱۴

۷۰- اشرف عطا مولانا ظفر علی خاں ص ۱۹۴

۷۱- ایضاً ص ۱۹۵

۷۲- میر ولی اللہ- گلبانگ- دارالاشاعت بادہ تاب ایبٹ آباد ص ۸۷' ۸۸

۷۳- بروایت مولانا حامد علی خان- لاہور

۷۴- ذکر اقبال- ص ۱۲۷

۷۵- ڈاکٹر صادق حسین لاہور- انمول موتی حصہ اول ص ۱۶۶ تا ۱۷۳

۷۶- یاد ایام- میاں امیر الدین- کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۸۳ء- ص ۴۸، ۴۹- میاں صاحب نے سال انتخاب ۱۹۲۷ درج کیا ہے- جب کہ جناب پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے مطابق حضرت علامہ ۲۳- نومبر ۱۹۲۶ء کو مجلس، قانون ساز پنجاب کے رکن منتخب ہوئے- (نقوش اقبال نمبر- ستمبر ۱۹۷۷ء)

۷۷- اقبال کی صحبت میں- ص ۲۰۹، ۲۱۰-

۷۸- ایضاً ص ۲۱۱

۷۹- محمد رفیق افضل گفتار اقبال ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور- جنوری ۱۹۶۹ء- ص ۲۸، ۲۹

۸۰- ایضاً- ص ۳۱، ۳۲

۸۱- روزنامہ زمیندار- ۶- مئی ۱۹۲۷ء- ص ۳

۸۲- ایضاً- ص ۲

۸۳- سید نور احمد- مارشل لا سے مارشل لا تک- دارالکتاب- ریٹی گن روڈ لاہور سال اشاعت ندارد-

۸۴- گفتار اقبال ص ۳۸

۸۵- مارشل لا سے مارشل لا تک ص ۱۱۳

۸۶- گفتار اقبال ص ۴۵- ۴۶

۸۷- گفتار اقبال ص ۴۷

۸۸- ۸۹- مارشل لا سے مارشل لا تک- ص ۱۱۳

۹۰- روزنامہ زمیندار- ۱۷- نومبر ۱۹۲۹ء- ص ۶

۹۱- تفصیل کے لیے دیکھیں لطیف احمد شروانی "سپیچز" رائٹنگز اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال- اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۷۷- ص ۲۴۴ تا ۲۴۸

۹۲- گفتار اقبال- ص ۱۷۹

۹۳- چمنستان ص ۶۶

۹۴- چمنستان ص ۷۹

۹۵- Foundations of pakistan vol III صفحہ ۲۷۰، ۲۷۱

۹۶- محمد حمزہ فاروقی- اقبال کا سیاسی سفر- بزم اقبال لاہور- جون ۱۹۹۲ء ص ۳۶۳- ۳۶۵

۹۷- زمیندار ۱۰- جولائی ۱۹۳۲ء

۹۸- شاملو (لطیف احمد شیروانی)- مرتب- حرف اقبال- المنار اکادمی لاہور نومبر ۱۹۴۵ء ص ۲۱۹

۹۹- گفتار اقبال ص ۱۸۲

۱۰۰- ایضاً ص ۱۸۲- ۱۸۳

۱۰۱- یوسف سلیم چشتی شرح جاوید نامہ- اکتوبر ۵۶- ص ۱۰۴۲- ۱۰۴۳
۱۰۲- کلیات اقبال فارسی ص ۷۵۰
۱۰۳- یوسف سلیم چشتی شرح ارمغان حجاز (حصہ اردو) بار سوم- س- ن- ص ۱۵۱
۱۰۴- مولانا ظفر علی خاں احوال و آثار- ص ۱۷۸ بحوالہ زمیندار ۱۷ ستمبر ۱۹۳۱ء
۱۰۵- نگارستان- ص ۸۳
۱۰۶- روزنامہ زمیندار- ۱۰' جولائی ۱۹۳۳ء
۱۰۷- نگارستان- ص ۱۰۵- ۱۰۶
۱۰۸- چمنستان- ص ۱۵۲
۱۰۹- سرود رفتہ- بار اول ۱۹۵۹ء- ص ۳۷
۱۱۰- S.Abdul Vahid. Thoughts and reflections of Iqbal. 1973. Page 297
۱۱۱- اعجاز احمد- مظلوم اقبال- مطبوعہ شیخ شوکت علی پرنٹرز- کراچی- ۱۹۸۵ء ص ۲۰۸
۱۱۲- حرف اقبال- ص ۱۳۲
۱۱۳- سرود رفتہ ص ۱۰۳
۱۱۴- بشیر احمد ڈار اقبال اور احمدیت- ص ۱۰- ۱۱
۱۱۵- ایضاً ص ۱۷-
۱۱۶- محمد عبداللہ قریشی روح مکاتیب اقبال- ص ۴۴۰
۱۱۷- زمیندار- ۶- جولائی ۱۹۳۲ء
۱۱۸- زمیندار- ۲۲- ستمبر ۱۹۳۲ء
۱۱۹- روزنامہ زمیندار- ۱۰- جولائی ۱۹۳۳ء
۱۲۰- حرف اقبال- ص ۲۲۴- ۲۲۵
۱۲۱- محمد حمزہ فاروقی حیات اقبال کے مخفی گوشے- مارچ ۱۹۸۸ء ص ۲۶۱-
۱۲۲- ایضاً ص ۱۵۹- ۱۶۰-
۱۲۳- انجمن اردو پنجاب کے بارے میں یہ تمام معلومات انجمن کے ایک رجسٹر مرتبہ میاں بشیر احمد سے حاصل ہوئیں- یہ رجسٹر اور انجمن کے بارے میں دیگر مطبوعہ رودادیں جناب مکرم خلیل الرحمن داؤدی صاحب کے کتب خانے کی زینت ہیں-
۱۲۴- روزنامہ انقلاب لاہور بابت ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء
۱۲۵- اقبال کے آخری دو سال- ایڈیشن ۱۹۷۸ء- ص ۳۹۳ تا ۳۹۶
۱۲۶- مولانا ظفر علی خاں- احوال و آثار ص ۲۱۸
۱۲۷- عبدالسلام خورشید صحافت پاکستان و ہند میں مجلس ترقی ادب لاہور- جون ۱۹۶۳ء ص ۳۵۰- ۳۵۱
۱۲۸- انوار اقبال- ص ۹۳

۱۲۹- زمیندار- ۲۴- اپریل ۱۹۳۱ء مکاتیب کے مکمل متن کے لیے دیکھیں ضمیمہ کتاب۔
۱۳۰- مضمون نادرات اقبال- مرتبہ قاضی افضل حق قرشی- مشمولہ' اقبالیات کی مختلف جہتیں- مرتبہ یونس جاوید- بزم اقبال- لاہور جنوری ۱۹۸۸ء- ص ۱۶۰- ۱۶۱-
۱۳۱- روایات اقبال ص ۷۸-۷۹
۱۳۲- زمیندار ۷- جولائی ۱۹۳۲ء
۱۳۳- زمیندار ۲۹- جون ۱۹۳۲ء
۱۳۴- زمیندار ۱۰- جولائی ۱۹۳۳ء
۱۳۵- اس نظم "رخصت اے بزم جہاں" کے بارے میں جناب عابد رضا بیدار لکھتے ہیں کہ دکن ریویو کے "مارچ نمبر (۱۹۰۴ء) میں اقبال کی ایک نظم پروانہ و شمع' کے عنوان سے شامل ہے- یہ ۲۷ اشعار پر مشتمل ہے- بانگ درا میں اصلاح کے بعد یہ نظم رخصت اے بزم جہاں' کے نام سے آئی اور اس میں صرف ۲۱ شعر رہ گئے- (اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار- شائع کردہ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز- ۱۹۶۹ء- ص ۱۳۴)- واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ کی نظم مذکورہ بالا شمارہ دکن ریویو میں "رخصت اے بزم جہاں" ہی کے عنوان سے شائع ہوئی تھی- پروانہ و شمع' کے عنوان سے اسی مارچ نمبر میں جناب نادر کاکوروی کی نظم اشاعت پذیر ہوئی تھی-
۱۳۶- مثال پرتو مے..... حضرت علامہ کی یہ غزل دکن ریویو کے کس شمارہ میں شائع ہوئی- اس امر کے تعین میں جناب ڈاکٹر صدیق جاوید کے خیال کی تائید کرتے ہوئے جناب عابد رضا بیدار نے انہیں ایک مکتوب محررہ ۲۹- اکتوبر ۱۹۹۱ء کو لکھا-
"یہ بات صحیح ہے کہ ستمبر اکتوبر' نومبر' دسمبر ۱۹۰۵ء کا رسالہ مشترک طور سے شائع ہوا-"
۱۳۷- چٹان لاہور بابت ۲۷- اگست ۱۹۶۲ء- نادم سیتا پوری کا مضمون بعنوان "مولانا ظفر علی خاں کا ایک ادبی ماہنامہ-"
۱۳۸- روزنامہ زمیندار- ۱۶- نومبر ۱۹۱۵ء
۱۳۹- زندہ رود ص ۱۸۸
۱۴۰- سیرت اقبال ص ۱۵۴
۱۴۱- اقبال کی صحبت میں- ص ۳۰۳' ۳۰۴
۱۴۲- مکتوبات اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی ص ۳۱۷' ۳۱۸
۱۴۳- ایضاً- ص ۳۲۰- ۳۲۱
۱۴۴- اقبال کے ہم نشیں- ص ۱۳۱
۱۴۵- چمنستان ص ۱۱۰
۱۴۶- ایضاً ص ۱۶۶
۱۴۷- سید مظفر حسین برنی (مرتب) کلیات مکاتیب اقبال جلد اول- اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۰۷-

نیز اقبال بنام شاد مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔ بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۸۶ء ص ۲۴۴۔

۱۴۸۔ اشرف عطا۔ مرتب۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص ۷

۱۴۹۔ ظفر علی خاں ادیب و شاعر ص ۱۱۵

۱۵۰۔ حکیم عبدالکریم ثمر۔ کاخ بلند تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔ ۱۹۳۵ء ص ۹۔ ۱۰

۱۵۱۔ چمنستان۔ نسخہ کارواں۔ ص ۳۰

۱۵۲۔ حبسیات ص ۳۵

۱۵۳۔ چمنستان۔ ص ۲۸

۱۵۴۔ ایضاً۔ ص ۳۶

۱۵۵۔ ایضاً ص ۷۵

باب دوم

تحریک آزادی اور اقبال و ظفر
(کانگرس سے اتحاد و اختلاف)

اظہار توحید و اسلامیت

حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے اشتراک فکر و عمل کا سعادت آگیں اظہار آزادی کی تحریک اور قیام پاکستان کے سلسلے میں بھی ہوا۔ یہ روشن باب اپنی اہمیت اور تفصیل طلبی کے پیش نظر علیحدہ طور پر پیش کیے جانے کا متقاضی ہے۔

اسلام پاکستان کی اساس ہے اور اقبال و ظفر دونوں شاعران اسلام تھے۔ یہ دونوں حضرات حمیت انتساب اسلامی گھرانوں کے چشم و چراغ تھے اور دونوں کی تربیت دیندارانہ اور ایمان پرور ماحول میں ہوئی تھی اس لیے اسلام کے لیے محبت اور شیفتگی دونوں حضرات کا سرمایہ امتیاز تھا۔ حرف نگاری اور نواپیرائی کے آغاز سے لے کر تحریر و تقریر کے آخری لمحوں تک دونوں حضرات اسلام اور شعائر اسلام سے اپنی شیفتگی اور جاں بستگی کا برملا اظہار کرتے رہے۔ دونوں حضرات نے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے پہلے لکھنا شروع کیا اور ان کا اظہار توحید و اسلامیت اسی دور سے محسوب ہونا چاہیے۔ فروری ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے اجلاس میں حضرت علامہ اقبال نے جو نظم 'فلاح قوم' کے عنوان سے پڑھی اس کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں
ملے گا منزل مقصود کا پتہ ہم کو
خدا کا شکر ہے جس نے دیے یہ راہ نموں

کچھ ان میں شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے
ہماری قوم پہ یا رب وہ پھونک دے افسوں(۱)

کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں لفظ قوم محدود معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تاہم قومیت کا یہ محدود تصور بھی اپنے متعدد قرائن سے اسلامیت کے وسیع تصور سے وابستہ ضرور نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے یہ نظم کشمیری مسلمانوں کی ایک انجمن کے لیے لکھی گئی اور نظم کا دعائیہ اور مناجاتی پیرایہ شاعر کے روشن اسلامی پس منظر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے اور اس کے بعد تو اسلام سے شیفتگی کے شواہد کلام اقبال سے مسلسل ملتے ہیں مثلاً ۱۹۰۱ء میں انھوں نے لکھا۔

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے(۲)

۱۹۰۲ء میں فرمایا۔

چاہیے ہر کام میں -ہو دین کی خدمت- کا پاس
حضرت مدفون یثرب کا یہی پیغام ہے(۳)

نیز۔

اے کہ حرف اطلبوا لوکان بالسین گفتہ ای
گوہر حکمت بہ تار جان امت سفتہ ای
اے کہ بر دلہا رموز عشق آساں کردہ ای
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای
اے کہ صد طور است پیدا از نشان پائے تو
خاک یثرب را تجلی گاہ عرفاں کردہ ای
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نور شمع عرفاں کردہ ای
اے کہ ہمنام خدا باب دیار علم تو
امیے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای
ہاں دعا کن بہرما اے مایہ ایمان ما
پر شود از گوہر حکمت سر دامان ما(۴)

مثالیں کہاں تک نقل کی جائیں۔ غرض یہ کہ حضرت علامہ کا سارا کلام ان کے ایمان و اسلام کا ترجمان ہے۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خاں بھی اپنی تحریر و تقریر کے آغاز ہی سے اپنے وابستہ دین حنیف ہونے کا اور اپنے قومی و ملی شعور کا اعلان کر رہے تھے چنانچہ انھوں نے ایک بار اپنے زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں سرسید احمد خاں کی مدح میں فارسی قصیدہ پڑھتے ہوئے فرمایا۔

ریاض قوم آب از اشک ہائے چشم او گیرد
فلک چشم تو گاہے دیدہ است ایں باغبانی را(۵)

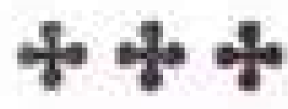
اسی طرح مولانا نے ۱۹۰۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس کے اجلاس سوم میں نظم پڑھتے ہوئے فرمایا۔

اے خوشا بخت کہ مدراس میں اسلام پہ آج
پرچم فضل و ہنر مروحہ جنباں ہے بہ ناز
غلغلہ آج ہے برپا اس اخوت کا یہاں
تھا کبھی جس کے لیے شہرۂ آفاق حجاز
اے خدائے دو جہاں کاشف اسرار غیوب
جس سے مخفی نہیں انسان کے دل کا کوئی راز
قوت اگلی سی عطا کر تو مسلمانوں کو
اور کر بار دگر ان پہ در حکمت باز
علم آئینہ اگر ہو تو سکندر ہم ہوں
ہوں مسلمان جو محمود تو ہو علم ایاز

(بہارستان ص ۴۳۴)

دسمبر ۱۹۰۳ء میں محمڈن کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ایک نظم میں مولانا نے پارسیوں اور برہمنوں سے خود کو متمیز کرتے ہوئے اپنی قومی انفرادیت اور حمیت کی لازوال شہادت یوں دی۔

پارسی و برہمن ہی نہیں منعم یہاں
ہم پہ بھی وا ہے ترے فیض کا در بمبئی
امت احمدؐ کی آج بنتی ہے تو دستگیر
ہو گئی تجھ پر حرام نار سقر بمبئی



چاہیے دنیا کے ساتھ قوم کو دیں بھی ضرور
خانہ بے سقف میں رہتے نہیں ذی شعور
علم وہ بے سود ہے دیں سے ہوا جو الگ
عقل وہ بیکار ہے آ گیا جس میں فتور
بادہ سائنس کے خم ہیں لنڈھانے عبث
نشہ توحید میں گر نہ ہوئی قوم چور
کپلر و نیوٹن کے گر سیکھ کے کیا فائدہ
مصطفوی راز سے جب رہے ادراک دور
امت ختم رسل سب میں سرافراز تھی
دل میں رہا دین کے جوش کا جب تک وفور(٦)

مولانا ظفر علی خاں بھی حین حیات تک اسلامی اور ملی موضوعات کے نور سے اپنے قلم کو فروزاں کرتے رہے۔

نشید حریت

علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں دونوں روح آزادی کے ہمزاد تھے۔ جب ان حضرات نے شعور کی آنکھ کھولی' ہندوستان برطانوی استعمار کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ سیاست دان' شاعر' ادیب' مدیر سب انگریزی حکومت کی برکات گنانے میں مصروف تھے۔ ہاں کہیں کہیں سے کوئی صدائے حریت بھی سنائی دے جاتی تھی۔ مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنی نگارشات میں جہاں تہاں اپنی حریت دوستی کا اظہار کیا ہے۔ ان شدید اور استعمار پرور حالات میں بھی حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں نے حریت و آزادی کے ترانے الاپے۔ مثلاً علامہ نے اپنی نظم 'صدائے درد' میں باہمی نفاق و ناچاقی کا رونا رویا ہے۔ ظاہر ہے ان کی نظر میں یہی باہمی افتراق آزادی وطن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ علامہ کی یہ نظم جون ١٩٠٢ء میں 'مخزن' میں شائع ہوئی تھی۔

سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

اور ۱۹۰۳ء میں آپ فرما رہے تھے۔

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے
جس کے ہر قطرہ میں تاثیر ہو یک رنگی کی
ہاں بتا دے وہ مئے ہوش ربا کون سی ہے؟

فروری ۱۹۰۷ء میں ان کی نظم 'پرندے کی فریاد' شائع ہوئی۔ یہ بھی دراصل محکوم و غلام ہندوستان کی فریاد کا ایک پیرایہ تھا اور پھر حضرت اقبال ہی نے تو فرمایا تھا۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

+++

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

+++

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

+++

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت لے نذر قباد و جم کرد
آدم از خوے غلامی ز سگاں خوار ترست
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

+++

اسی طرح مولانا ظفر علی خاں بھی اپنی قوم کی غلامی اور زوال و انحطاط پر کڑھ رہے تھے اکتوبر ۱۹۰۳ء کی ایک نظم میں وہ قوم کا مقابلہ یورپ سے کر کے اپنی قوم کو مائل بہ اصلاح ہونے کا درس دیتے ہیں۔

اے فلک قوم حزیں پر سنگ باری کے لیے
تجھ کو ہر روز اک نیا سنگ فلاخن چاہیے
چاہیے یورپ کو شور بوق و کوس علم و فضل
ہم کو سارنگی کی دوں دوں اور تن تن چاہیے
چاہیے غیروں کو ہمت اور ہمیں دوں ہمتی
استقامت ان کو اور ہم کو تلون چاہیے(۷)

۱۹۱۱ء میں بلقان اور طرابلس کی جنگوں کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خاں نے لکھا:

مسیحیوں اور مسلموں میں یہ جنگ جس وقت سے ٹھنی ہے
بدن کو دیتی ہے روح دھمکی کہ آ گیا وقت جانکنی ہے
بتا رہی ہے دراز دستی اطالیہ کی طرابلس پر
کہ آج کشور کشا وہی ہے جسے ذرا مشق رہزنی ہے
ہوا ہے ایماں جہاں سے رخصت اٹھا ہے انصاف کا جنازہ
جہاں میں چھا جائے گا اندھیرا یہی جو یورپ کی روشنی ہے
رہی سہی راستی کا جلوہ ہے ایک انگلینڈ میں نمایاں
مصیبتوں کے سیاہ بادل سے اک فقط یہ کرن چھنی ہے (۸)

آخری شعر سے تاج برطانیہ سے وفاداری کا اشارہ ملتا ہے۔ دراصل اس زمانے میں بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں کا سیاسی موقف یہ تھا کہ تاج برطانیہ سے وفاداری کا اظہار کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور رعایتیں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء سے پہلے ایک عرصہ تک جناب محبوب علی خاں آصف فرماں روائے حیدر آباد دکن کا یہ شعر زمیندار کا نوشتہ پیشانی بنتا رہا۔

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار (۹)

حضرت علامہ اقبال کی منظومات 'پنجاب کا جواب' (۱۹۱۸ء) اور قطعہ (۱۹۱۸ء) وغیرہ کو بھی اس دور کی اسی اجتماعی حکمت عملی کے سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیے 'پنجاب کا جواب' نظم بقول مرتبین باقیات اقبال "پہلی جنگ عظیم کے دوران سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر لکھی اور ۱۹۱۸ء کے ایک شاعرہ میں پڑھی گئی جو جنگی تشہیرات کے سلسلے میں ہوا تھا"(۱۰) اس نظم کا پہلا بند یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اے تاجدار خطہ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند

ہنگامہ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

تاہم تاج برطانیہ کی وفاداری کا جوا بھی مولانا ظفر علی خاں نے غالباً ۱۹۲۰ء میں اور علامہ اقبال نے ۱۹۱۸ء ہی میں اتار پھینکا تھا۔

جنگ طرابلس ہی کے دنوں میں مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی اور استعمار کوش یورپ اور اس کی تہذیب کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

آسماں سے ابن مریم آج اتر آئیں اگر
دیکھ کر اخلاق روما بے گماں رہ جائیں دنگ
مدعا یہ ہے کہ مٹ جائے مسلمانوں کا نام
واسطے اس کے تراشے جا رہے ہیں عذر لنگ
ناتواں وقف لکد کوب توانا ہو گئے
چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو نگلے جاتے ہیں نہنگ
کیا اسی شائستگی پر ہے مسیحیت کو ناز
کیا یہی تہذیب ہے سرمایہ ناز فرنگ
آہ اے انصاف ہم ڈھونڈیں کہاں جا کر تجھے
سینٹ پطرس برگ جب مضراب اور لندن ہو چنگ
اب بھی سر ایڈورڈ کاش اپنا طریقہ دیں بدل
ہو گر انگلستاں کا ان کو کچھ بھی پاس نام و ننگ(۱۱)

اور اسی نظم میں ہندوستان کی صورت حالات کا نقشہ اور ہندو مسلم اتحاد کا عزم یوں ظاہر کرتے ہیں۔

یونہی مسلم اور ہنود اس دیس میں مل جائیں گے
مل گئیں پریاگ میں جس طرح جمنا اور گنگ

اتحاد اس ملک کا مشکل نہیں ہے جس میں ہو
ایک تہذیب ایک بولی ایک صورت ایک رنگ
ناخنوں سے گوشت ہو سکتا نہیں ہرگز جدا
چھوٹ سکتا ہی نہیں ہے چولی اور دامن کا سنگ

حضرت علامہ طلوع مولانا کے ہندو مسلم اتحاد کے ان عزائم و دواعی کو بھی اعلان آزادی ہی سمجھا جانا چاہیے۔ اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں کے نشید آزادی کی ایک دو تانیں اور بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ۲۳۔ مئی ۱۹۲۰ء کو انہوں نے لکھا۔

یہ مانا ہم کبھی جس بزم کی مسند کی زینت تھے
اب اس پر ڈٹ کے باصد کروفر اغیار بیٹھے ہیں
مگر اسلام ہارے یہ نہ ممکن تھا نہ ممکن ہے
غلط سمجھا ہے یورپ ہم یہ بازی ہار بیٹھے ہیں(۱۲)

۱۹۲۹ء میں آپ نے یہ اعلان کیا۔

نچائیں گے اسے تگنی کا ہم ناچ
کرے گا رقص ہو کر جان بل مست
ہلا دیں گے مسیحیت کی بنیاد
اگر اس بات پر جائیں گے تل مست
"الٰہی خانہ انگریز گر جا"
مچائیں گے لب دریا یہ غل مست(۱۳)

اور ۱۹۳۶ء میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

پہلو میں ہو دل، دل میں ہو یقیں سر پر ہو کفن کف میں ہو سناں
جب جمع یہ اجزا ہوتے ہیں بنتا ہے قوام آزادی کا
انگورہ سے لے کر کابل تک مخلوق خدا آزاد ہوئی
دہلی کی خطا کیا ہے کہ یہاں چھلکا نہیں جام آزادی کا
تاریخ وطن کی جانب سے پیغام کوئی انگریز کو دے
آتا ہوا تم بھی دیکھو گے سورج لب بام آزادی کا
دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا(۱۴)

غرض استعمار دشمنی اور حریت آموزی کے باب میں حضرت اقبال اور مولانا ظفر علی خاں دونوں زعما ہمیشہ ہم فکر اور ہم نفس رہے اور اس سلسلے میں ان کی ہم آہنگی حسن و خیر کے متعدد لازوال ابواب کی امین ہے۔

انتخابات ــــ مخلوط یا جداگانہ

آزادی ہند اور قیام پاکستان کے سفر میں ایسے بھی مراحل آئے جن میں قائدین ملت اسلامیہ آپس میں اتحاد و اشتراک کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ دراصل وہ دور ہی ایسا پر آشوب' غبار گستر اور حواس ربا تھا کہ اسلام کے بیشتر مبارزوں سے ان کا ہدف اوجھل ہو گیا تھا اور وہ نادانستہ اپنی ہی افواج کے خلاف داد شجاعت دے رہے تھے۔ چنانچہ بعض مواقع پر حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے طریق فکر و عمل میں بھی اختلافات ظاہر ہوئے۔ مثال کے طور پر طریق نیابت' سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ کے معاملات میں یہ اکابر ہم فکر اور ہم آواز نہ تھے۔ ان مباحث کو اختلافات کے باب میں بیان کیا جانا چاہیے تھا لیکن موضوع کی مناسبت سے انہیں یہیں پیش کیا جا رہا ہے۔

برعظیم کی تاریخ میں بیسویں صدی کے پہلے چار عشروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ بحث بہت اہم رہی کہ انتخابات مخلوط ہوں یا جداگانہ۔ اس بحث کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں:

"اگرچہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال سے زائد اس برصغیر (برعظیم؟) پر حکمرانی کی لیکن حکمران ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو قبول اسلام پر مجبور نہ کیا اور اس طرح ان کی اقلیت' اکثریت میں تبدیل نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب برصغیر میں پارلیمانی اداروں کے قیام کی باتیں سننے میں آئیں تو مسلمانوں کو اپنے اقلیت میں ہونے کا شدید احساس ہوا۔ اقلیت چونکہ ہمیشہ اپنے حقوق کے تحفظ کے بارے میں بہت حساس ہوا کرتی ہے' اس لیے جب جمہوریت اور جمہوری اداروں کے قیام کے لیے کوششیں تیز تر ہوتی گئیں تو مسلمانوں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو گورنر جنرل لارڈ منٹو (Lord Minto) سے شملہ میں ملاقات کر کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کو یہ حق مل گیا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔ ان کے نزدیک جداگانہ انتخاب کا مطالبہ منظور کر کے گویا انگریز حکومت نے تسلیم کر لیا کہ

ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں۔ ہندوؤں کو یہی حقیقت بہت چبھتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے اس حق کے خلاف زبردست مہم چلائی اور جب تک ہندوستانی سیاست میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کو اہمیت حاصل رہی' ہندو اس کی مخالفت کو اپنا دھرم سمجھتے رہے۔ صرف لکھنؤ پیکٹ (۱۹۱۶ء) میں انہوں نے غلطی سے' مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جداگانہ انتخاب نے مسلمانوں میں قومی شعور پیدا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔"(۱۵)

طریق نیابت کے اس قضیئے میں قائداعظم کے موقف کی وضاحت بھی پروفیسر احمد سعید نے بہت خوش اسلوبی سے کی ہے۔ فرماتے ہیں :

"قائداعظم محمد علی جناح اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں "ہندو مسلم اتحاد" کے زبردست حامی تھے۔ ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ بھی آپ ہی کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ جداگانہ انتخاب کے بارے میں قائداعظم کی رائے تھی کہ یہ فی نفسہ کوئی مقصود نہیں بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے اگر ہندو مسلمانوں کے دیگر اہم مطالبات ــــ مثلاً سندھ کی بمبئی سے علیحدگی' سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا اجرا' مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی' اور پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی ــــ تسلیم کرلیں تو مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کی خاطر جداگانہ انتخاب کے بجائے مخلوط انتخاب کو قبول کر لینا چاہیے۔ قائداعظم کی رائے میں جداگانہ یا مخلوط انتخاب کو فرقہ وار مسئلے کے حل (کی راہ) میں چٹان نہیں بننا چاہیے۔ قائداعظم کا کہنا تھا کہ چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس لیے ان کو بجا طور پر اپنے حقوق کے تحفظ کے متعلق خوف لاحق ہے لیکن اگر ایک مرتبہ دستور اساسی نافذ ہو جائے اور مسلمانوں کا عدم اعتماد اور خوف دور کر دیا جائے تو مسلمان خود بخود جداگانہ انتخاب کو ترک کر دیں گے۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے قائداعظم نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو ہندو مسلمان اتحاد کی خاطر دہلی مسلم تجاویز' پیش کیں جن کے تحت مسلمان جداگانہ انتخاب اس صورت میں چھوڑنے پر آمادہ تھے اگر ان کے باقی مطالبات تسلیم کر لیے جائیں۔"(۱۶)

علامہ اقبال ہمیشہ جداگانہ انتخاب کے حق میں رہے۔ یکم مئی ۱۹۲۷ء کو برکت علی اسلامیہ ہال میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس میں علامہ اقبال نے جو قرارداد پیش کی' اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"حلقہ ہائے انتخاب کی علیحدگی ہی سے باشندوں کے جائز حقوق و فوائد محفوظ رہ سکتے ہیں اور اسی صورت میں وہ فرقہ وار کشمکش دور ہو سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہے اور جو مخلوط و مشترک حلقہ ہائے انتخاب سے پیدا ہو گی۔ اس لیے لیگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک اقلیتوں کے حقوق کی موثر حفاظت کا انتظام نہ ہو' اس وقت تک مسلمان فرقہ وار حلقہ ہائے انتخاب کو دستور ہند کے ایک اساسی جزو کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لازماً مصر رہیں۔"(۱۷)

اپنی اس قرار داد کی توضیح کرتے ہوئے حضرت علامہ نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ میں سب سے پہلا ہندوستانی ہوں جس نے اتحاد ہندو مسلم کی اہمیت و ضرورت کا احساس کیا اور میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ اتحاد مستقل حیثیت اختیار کر لے لیکن حالات حلقہ ہائے انتخاب کے اشتراک کے لیے موزوں نہیں ہیں اور ہمارے صدر (سر محمد شفیع) نے ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے جو اقتباسات اپنے خطبہ صدارت میں دیے ہیں ان سے ہندوؤں کی افسوسناک ذہنیت آشکارا ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تو حلقہ ہائے انتخاب کا اشتراک کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں' اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں' تعلیم میں پسماندہ ہیں' ویسے بڑے بھولے بھالے ہیں' حکومت انہیں آسانی سے چکنی چپڑی باتیں کر کے پھسلا لیتی ہے' ہندو انہیں پھسلا لیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے۔ اور اگر کوئی وجہ نہ ہوتی تو میں کہتا کہ تنہا اسی وجہ سے حلقہ ہائے انتخاب الگ رکھے جائیں۔"(۱۸)

۴ ستمبر ۱۹۲۸ء کو حضرت علامہ نے آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ کے فیصلوں کے متعلق فری پریس کے نمائندے سے ملاقات کے دوران ہی فرمایا:

"ذاتی طور پر میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا حامی ہوں۔"(۱۹)

حضرت علامہ نے صدر آل انڈیا مسلم کانفرنس کی حیثیت سے ۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اخبارات میں اشاعت کے لیے جو بیان اپنے رفقا کے اور اپنے دستخطوں کے ساتھ بھیجا' اس میں بھی کہا گیا تھا۔

"جرائد میں بعض مسلمانوں نے فرقہ وارانہ تصفیہ میں ترمیم کرنے کے لیے گفت و

شنید جاری کر رکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری بحث طریقہ انتخاب سے وابستہ کر دی گئی ہے اور کوئی شخص ان اہم مطالبات کی طرف متوجہ نظر نہیں آتا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے اب تک بنگال و پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت' سندھ کی علیحدگی' مرکزی لیجسلیٹو میں مسلمانوں کی تہائی نیابت' اور کابینہ و ملازمت میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا سوال نہیں اٹھایا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اکثریت رکھنے والے فرقہ کے ساتھ رہنے سے ہمیشہ بیزاری ظاہر کی ہے اور گذشتہ دس سال کے اندر اس کے لیے جو بے سود کوشش کی گئی وہ اظہر من الشمس ہے۔ ہمارے نزدیک اس وقت مخلوط و جداگانہ انتخاب کا سوال اٹھانا بالکل بے موقع اور فضول ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہماری قوم اس تحفظ (جداگانہ انتخاب) کو ایسے نازک زمانہ میں ہاتھ سے کھو دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لہٰذا ہر ایسی بحث جو طریق انتخاب سے وابستہ ہو گی بے نتیجہ ثابت ہو گی۔"(۲۰)

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو حضرت علامہ نے زیر بحث مسئلے پر نمائندہ ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک اور زور دار بیان بھیجا:

"حالات حاضرہ کے ماتحت ہندوستان کے مسلمان انتخابات جداگانہ کے مطالبہ سے دستکش نہیں ہو سکتے۔ ذاتی طور پر مجھے یقین نہیں آتا کہ لکھنؤ کی گفت و شنید کسی صورت سے بار آور ثابت ہو سکتی ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان کے مسلمان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادوں کو ہمیشہ اپنا رہنما تصور کرتے رہیں گے۔ جداگانہ انتخاب پر جو نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں اور اسے قومیت کے خلاف بتایا جا رہا ہے' وہ میرے نزدیک قابل وثوق نہیں ہو سکتیں۔ میں مہاتما جی سے اس پر اتفاق کرتا ہوں کہ ہندوستان کی حالت غیر ممالک سے بالکل مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں مغربی طریقہ جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ جذبہ قومیت باہمی رواداری سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ابھی ہندوستان کے مسلمانوں کے اکثریت والی قوم سے ملنے کا زمانہ نہیں آیا لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ ایسے تصفیہ کے لیے ہمیشہ سے تیار ہیں اور اگر ایسا موقع آیا تو مجھ سے زیادہ خوشی کسی کو حاصل نہ ہو گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کے بعد ہمارے ہندو لیڈروں کا رویہ کیسا رہتا ہے؟"(۲۱)

مخلوط انتخاب کے خلاف حضرت علامہ نے ایک دلچسپ قطعہ بھی تحریر فرمایا تھا۔

ممکن نہیں کہ ایک ہی بازار میں چلیں
ہم سکے اور دھات کے وہ اور دھات کے
مخلوط انتخاب سے ہے تا امید ہند
پابندیاں کے ووٹ بھنگ ہیں چھوت چھات کے(۲۲)

مولانا ظفر علی خاں مخلوط انتخابات کے حامی تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ جداگانہ انتخابات کو فاقی نظام حکومت کے قیام کے دس سال بعد تک بحال رکھا جائے اور اس کے بعد مخلوط انتخابات ہوا کریں۔ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ کی دوسری نشست میں مولانا ظفر علی اں نے طریق انتخاب کے سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

"ہندوستان کے لاکھوں مسلمان اس تجویز کے خلاف چلا رہے ہیں کہ جداگانہ طریق انتخاب کو منسوخ کر دیا جائے۔ ایسا وقت آنے کو ہے جب ایسے طریق انتخاب کی ضرورت باقی نہیں رہے گی لیکن اس موقع کا انتظار کرنا چاہیے" مولانا نے زور دیا کہ جداگانہ طریق انتخاب کی تنسیخ کے لیے بالغ رائے دہی کے اصول کی شرط بھی لگائی جانی چاہیے۔ مسلمان معاشی طور پر (ہندوؤں سے) کمزور ہیں۔ بالغ رائے دہی اس کا واحد علاج ثابت ہو گا۔" تاہم اس موقع پر جناب اکرم خان نے بالغ رائے دہی کی تجویز کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ مردم شماری کے مطابق یہ تجویز بنگال میں مسلم اکثریت کو گھٹا دے گی"(۲۳)

مخلوط انتخابات کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علی خاں اتحاد بین المسلمین کے مقصد عزیز کو بھی چھوڑنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ تھے اور ملت اسلامیہ کی فوز و فلاح ان کا مطمح نظر تھا۔ مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے صدر سر علی امام کے نام ایک پیغام میں وہ اتحاد اسلامی پر زور دیتے ہوئے مسئلہ طریق نیابت کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

"وہ مسئلہ جس کی وجہ سے مسلمان دو مخالف جماعتوں اور دو معاند فریقوں میں منقسم ہو رہے ہیں، طریق نمایندگی و انتخاب کا مسئلہ ہے۔ ان مسلمانوں کے احساسات و جذبات سے بے اعتنائی روا رکھنا جو غلطی سے جداگانہ انتخاب کو مسلمانوں کے مکمل سیاسی امحا کے مقابلہ میں حفاظت کا واحد ذریعہ خیال کرتے ہیں، بدترین سیاسی غلطی ہو گی۔ ذاتی طور پر میں انتخاب کے مخلوط طریق کا حامی ہوں لیکن اس وقت اس مسئلہ پر جو شدید اختلاف رونما ہو رہا ہے، اسے دور کرنا از بس ضروری ہے۔ لہٰذا میں تجویز

کرتا ہوں کہ وفاقی نظام حکومت کے نفاذ و اجرا کے دس سال بعد تک جداگانہ انتخابات کا طریق علی حالہٖ قائم و برقرار رہے اور اس کے بعد خود بخود مخلوط انتخاب اس سرزمین کا قانون متصور ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ میری یہ تجویز ساری قوم میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اگر اسے قبول کر لیا گیا تو اس کے نتائج اتحاد اور یک جہتی کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور موجودہ اختلاف اور خلفشار فی الفور دور ہو جائے گا۔" (۲۴)

رہنمایان عظام کے نام اپنے ایک مکتوب میں جو ۲۳۔ اپریل ۱۹۳۱ء کو شائع ہوا' مولانا نے پھر اس تشویش کا اظہار کیا کہ دلدادگان طریقہ انتخاب جداگانہ اور حامیان انتخاب مخلوط کی باہم آویزی مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کر رہی ہے۔

مولانا ظفر علی خاں جداگانہ طریق انتخاب کی مشروط حمایت کرتے تھے۔ مولانا کی اس پالیسی پر حضرت علامہ اقبال نے ۲۔ مئی ۱۹۳۱ء کو باغ بیرون موچی دروازہ کے ایک جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے یوں تبصرہ کیا:

"وہ (نیشنلسٹ مسلمان) مخلوط انتخاب کو بالغوں کے حق رائے دہی سے مشروط کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں دس سال کے لیے جداگانہ انتخاب کے حامی ہیں اور اس کے بعد بھی بالغوں کے حق رائے دہی کی شرط لگاتے ہیں اور 'زمیندار' کی اشاعت دیروزہ میں لکھتے ہیں کہ بالغوں کا حق رائے دہی ابھی ممکن ہی نہیں ... جداگانہ انتخاب سے پہلے مخلوط انتخاب کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ سر علی امام جو لکھنؤ کانفرنس کے صدر تھے' اس تجربے کی بنا پر اس وفد میں لارڈ منٹو کے پاس گئے تھے' جس نے مسلمانوں کی حالت زار کا حوالہ دے کر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ لارڈ منٹو ان کے دلائل سے متاثر ہو کر جداگانہ انتخاب نافذ کرنے پر تیار ہو گئے۔" (۲۵)

بہارستان میں مخلوط انتخاب کے حق میں مولانا کی ایک نظم بھی موجود ہے جو ان کے غیر معمولی جوش و جذبہ کی ترجمان ہے۔

مذہب کی شرط کیا ہے مسلمان کے لیے
جس کے نہ ماننے سے وہ ہے مورد عذاب
ایمان غیب پر ہو مگر پختگی کے ساتھ
تھا اس سوال کا یہی قرآن میں جواب

اعلان کر رہے ہیں مگر مفتیان ہند
اس باب میں ہے تشنہ خود اللہ کی کتاب
ان محرمان سر ازل کے خیال میں
اسلام کی ہے شرط جداگانہ انتخاب
یہ شرط مٹ گئی تو بس اسلام مٹ گیا
ہندوستان میں خانہ ملت ہوا خراب
ہندو سے لے لیا اگر اسلامیوں نے ووٹ
تھامے ہوئے چلیں گے وہ الحاد کی رکاب
کافر ہی کافر آئیں گے اس ملک میں نظر
وہ ہوں گے اور ان کے ستم ہائے بے حساب
فطرت میں جو ہیں شیر وہ بن جائیں یوں شغال
اے رب کعبہ کیا ہے نرالا یہ انقلاب
کیوں ڈرنے لگ گئے ہیں بتوں سے خدا پرست
عصفور سے لرزنے لگا کس لیے عقاب
باطل کی کیا مجال کہ زک حق کو دے سکے
لائی ہے رات بھی کبھی نور سحر کی تاب
مخلوط انتخاب کو منظور تو کرو
ہوتے ہی رائج اس کے سب اٹھ جائیں گے حجاب
تم ظلمتوں کے وہم سے ہو پیچ و تاب میں
اور سامنے ہے حق کا درخشندہ آفتاب(۲۶)

ہم دیکھتے ہیں کہ طریق نیابت کے اس تنازع میں وقت نے بالآخر حضرت علامہ اقبال کے حق میں فیصلہ دیا اور انہی کا نقطۂ نظر معتبر ٹھہرا۔

سائمن کمیشن

سائمن کمیشن (۱۹۲۷ء) بھی مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کے درمیان شدید اختلافات کا باعث بنا۔ اس کمیشن کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں (۱۹۲۷ء) حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک

کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ برعظیم کے مختلف سیاسی عناصر سے تبادلہ خیالات کر کے اور حالات کا جائزہ لے کر یہ بتائے کہ آیا آئینی اصلاحات کے لیے جواز موجود ہے یا نہیں اور اگر موجود ہے تو ان اصلاحات کا نقشہ کیا ہو؟ محمد علی جناح اور ان کے ساتھی اس کمیشن کا مقاطعہ کرنے کے حامی تھے کیونکہ اس میں ہندوستانیوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ دوسری طرف سر محمد شفیع اور علامہ اقبال کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ اگر کمیشن کو مسلمانوں کے موقف سے آگاہ نہ کیا گیا تو مسلمان گھاٹے میں رہیں گے۔"(۲۷)

ظاہر ہے اس موقع پر جناح لیگ کانگرس کی ہمنوائی کر رہی تھی اور مولانا ظفر علی خاں بھی کانگرسی نقطۂ نظر کی حمایت میں سرگرم فکر و عمل تھے۔ سائمن کمیشن کے بارے میں حضرت علامہ اقبال کا نقطۂ نظر ان کے متعدد بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۳۔ نومبر۱۹۲۷ء کو پراونشل مسلم لیگ کا ایک اجلاس سر محمد شفیع کے مکان پر ہوا۔ اس اجلاس کے بعد حضرت علامہ نے اخبارات کو جو بیان دیا' اس میں فرمایا:

"پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کامل غور و خوض کے بعد ایک قرار داد منظور کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ کمیشن کا بائیکاٹ ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے علی الخصوص نقصان رساں ہو گا.... سر جان سائمن صدر کمیشن نے نہایت صحیح کہا کہ کمیشن کا فرض محض یہ ہو گا کہ ہندوستان کی طرف سے جو مختلف تجاویز پیش ہوں' ان کی روئیداد پیش کرے اور ان پر غور و خوض کرے۔ اس ملک کی قلیل التعداد جماعتوں کو رائل کمیشن کی آمد سے بڑھ کر اپنے اندیشے اپنی امیدیں اور اپنے مقاصد ظاہر کرنے کا اور کوئی موقع نہیں مل سکتا۔"(۲۸)

اپنے ۱۹۔ دسمبر۲۷ کے بیان میں آپ نے مزید فرمایا:

"رائٹ آنریبل سید امیر علی نے حال ہی میں جو پیغام بھجوایا ہے' ہمارے لیے یقینی طور پر دلیل راہ ہے۔ آپ کا وہ مشورہ جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے' یہی ہے کہ ہمیں کمیشن کا مقاطعہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے لیکن مسٹر جناح اور ان کے مسلمان دوست جان بوجھ کر اصرار کرتے ہیں کہ کمیشن کے مسترد کرنے میں ہمیں ہندوؤں کی حمایت کرنی چاہیے۔ مسٹر جناح ہماری آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتے ہیں.... مسٹر جناح نے عجیب دقت نظر سے اپنے تین دل پسند امور پر زور دیا ہے یعنی خود داری' مادر ہند سے وفاداری اور مقاطعہ کے فوائد۔ اس سے ہم کو روشن تاریخ

کی ایک سادہ کہانی یاد آگئی ہے۔ کسی پر تکلف دعوت میں گوناگوں گوشت اور شکار کی نمائش کی گئی تھی۔ لیکن آخر کار معلوم ہوا کہ یہ سب معمولی خنزیر کا گوشت تھا جس کو باورچی کی کاریگری نے مختلف صورتوں میں پیش کیا تھا۔ موجودہ صورت میں بھی مسٹر جناح ہندوستانی قومیت کو مختلف فریب آمیز شکلوں میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔"(۲۹)

سائمن کمیشن کی تشکیل اور اس کے دوروں کے خلاف مولانا نے کئی نظموں میں اظہار خیال کیا۔ مثلاً مسلم لیگ (سر شفیع گروپ) کا ایک اجلاس ۱۳ نومبر ۲۷ء کو سر شفیع کے گھر میں منعقد ہوا جس میں یہ ریزولیوشن منظور ہوا کہ سائمن کمیشن سے تعاون کیا جائے۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے لکھا۔

اپنی آبرو کھوئی ہم نے اپنی باتوں سے
جب لڑے ہم آپس میں تیسرے کی بن آئی
آج لارڈ برکن ہیڈ ناچیں ناچ نگنی کا
ہم کو بھائی پرمانند جان لیں اگر بھائی
ماننا ہی پڑتا ہے لیگ کا رزولیشن
گھر سے چل کے آیا ہے جب یہ معتبر نائی(۳۰)

۱۸- دسمبر ۱۹۲۷ء کے 'زمیندار' میں مولانا ظفر علی خاں کی نظم بعنوان 'اسلام کا پیغام' شائع ہوئی جس میں آپ نے سائمن کمیشن کی موہوم نوازشات کا تجزیہ اس طرح پیش کیا۔

کمیشن سے تعاون کرنے والے یہ تو فرمائیں
کہ آخر اس خوشامد کا صلہ ان کو وہ کیا دے گا
نئی عزت ملے گی کون سی ان کاسہ لیسوں کو
وہ کس سرخاب کے پر ان کی ٹوپی میں لگا دے گا
وفا کی ناک رگڑیں گے اگر یہ اس کی چوکھٹ پر
تو کیا وہ بیڑیاں ان کی غلامی کی بڑھا دے گا
یہ سچ ہے لے مریں گے کچھ نہ کچھ اس سے مولاتی
کسی کو سر کرا دے گا کسی کو جج بنا دے گا
مگر یہ وہ چچوڑی ہڈیاں ہیں خوان مغرب کی
جنھیں وہ پھینک کر مشرق کے کتوں کو لڑا دے گا

مسلمانو ہے ناموس وطن اس وقت خطرہ میں
بچاؤ گے جو تم اس کو خدا تم کو جزا دے گا
اگر ٹھکرا دیا تم نے کمیشن کو تو سن لینا
تمہارے نام کا ہندوستان ڈنکا بجا دے گا
تعاون کر کے انگریزوں سے اب تک کیا لیا تم نے
نہ سمجھے ہو تو سمجھو تم کو جو دے گا خدا دے گا (۳۱)

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ ۳۰- دسمبر ۱۹۲۷ء کی شام کو ٹاؤن ہال کلکتہ میں مولوی محمد یعقوب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا- اس اجلاس کی دوسری نشست ۳۱- دسمبر کی صبح کو ہوئی- اس نشست کی سب سے بڑی قرار داد سائمن کمیشن کے مقاطعہ سے متعلق تھی- سبجیکٹ کمیٹی کی طرف سے سر علی امام نے یہ قرار داد پیش کی:

"آل انڈیا مسلم لیگ پر جوش اعلان کرتی ہے کہ کٹھ پتلی کمیشن اور وہ طریق کار جس کا اعلان کیا گیا ہے' ہندوستان کے عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہیں- چنانچہ یہ قرار پایا ہے کہ ملک بھر کے مسلمانوں کو کسی سطح پر اور کسی شکل میں کمیشن سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے-"

اس قرار داد کے حق میں سر علی امام' قائداعظم اور مولانا ظفر علی خاں سمیت متعدد اکابر نے تقریریں کیں- مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ کاسہ لیسان سرکار کو چھوڑ کر تمام پنجاب ہمارے ساتھ ہے- جب رجعت پسند مہاسبھائی عنصر نے بھی کانگرس کی بات مان لی ہے تو کیا مسلمان ہچکچائیں گے؟" (۳۲)

آل انڈیا مسلم لیگ کے اسی اجلاس کلکتہ کی تیسری نشست یکم جنوری ۱۹۲۸ء کی سہ پہر کو ہوئی- اس میں ایک قرار داد (نمبر ۸) کے ذریعے سر محمد شفیع اور ان کے ساتھیوں کی اس مسلے پر مذمت کی گئی کہ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اختیارات اور فیصلے سے بغاوت کی ہے اور کلکتہ کے اجلاس میں شریک ہونے کے بجائے لاہور میں لیگ کا اجلاس کیا ہے- قرار داد میں کہا گیا کہ اس نازک وقت میں مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کی تمام تر ذمہ داری سر محمد شفیع اور ان کے احباب پر عائد ہوتی ہے-(۳۳)

اس سلسلے کی ایک اور قرار داد خود مولانا ظفر علی خاں نے پیش کی جس میں کہا گیا کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے مسلم لیگ کی موجودہ باڈی کے اختیارات کی سنگین خلاف ورزی کی ہے چنانچہ نظم و ضبط کے اصولوں کے مطابق پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ سے

غیر مسلک (Disaffiliate) کرنے کی قرار داد پیش کی جاتی ہے اور مسلمانان پنجاب سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی صوبائی مسلم لیگ تشکیل دیں جو پنجاب کی صحیح نمائندہ ہو۔" (۳۴)

۲۳- جنوری ۱۹۲۸ء کو مولانا نے لکھا۔

جب آئیں سائمن اس طرح استقبال ہو جائے
کہ پہنچیں جس جگہ نازل وہیں ہڑتال ہو جائے
زوال اسلامیوں کا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا
کہ جو ان کا تھا وہ انگریز کا اقبال ہو جائے
خلافت' کانگرس اور لیگ کا ایکا یہ کہتا ہے
کہ الٹی آسمان پیر کی ہر چال ہو جائے
اگر ہندوستان کو نعمت آزادی کی حاصل ہو
تو کھن توس کا برطانیہ میں کال ہو جائے (۳۵)

دوسرے شعر میں حضرت علامہ کے خلاف تعریض واضح ہے۔

سائمن کمیشن ۳- فروری ۱۹۲۸ء کو بمبئی پہنچا تو اس کے خلاف نہ صرف بمبئی بلکہ ملک بھر میں مظاہرے اور ہنگامے شروع ہو گئے- لاہور میں سر محمد شفیع' علامہ اقبال سر ذوالفقار علی خاں اور سر عبدالقادر وغیرہم نے ہڑتال کو ناکام بنانے کی کوشش کی اور اس مضمون کے اشتہار اپنے دستخطوں سے شہر کے در و دیوار پر چسپاں کرائے کہ ہڑتال مسلمانوں کے حق میں سخت مضر بلکہ مہلک اور خودکشی کے مترادف ہے- اس پر مولانا ظفر علی خاں نے حضرت علامہ اقبال کے خلاف یہ نظم زمیندار میں شائع کی- نظم غالباً ۴- فروری ۱۹۲۸ء کو کہی گئی تھی۔

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے سر اقبال نے
دشمنان ہند کو خوش کرنے کی خاطر شکست
آپ اپنی فوج کو دی کس نے سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے
آبرو ملت کی کھو دی کس نے سر اقبال نے
تھی ضرورت جس کو مرہم کی اس آلے زخم میں
سوئی اور الٹی چبھو دی کس نے سر اقبال نے

ہند کے ناموس کی تذلیل سے لاہور میں
بھر دی انگلستاں کی گودی کس نے سر اقبال نے
کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے آج
قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے

'بہارستان' کی ترتیب کے وقت اس نظم کی ردیف بدل کر "لیڈران قوم" کر دی گئی۔(۳۶)

سائمن کمیشن کے خلاف ہونے والے مظاہروں کو ہوا دینے میں 'زمیندار' پیش پیش تھا ۴۔ مارچ ۱۹۲۸ء کو زمیندار کے افتتاحیہ میں لکھا گیا:

"کمیشن کے ساحل ہند پر قدم رکھتے ہی اہل بمبئی نے دفتری حکومت اور اس کے حاشیہ برداروں کے زبردست پروپیگنڈے کے باوجود جو غیور فرزندان ہند کے جذبات آزادی کو دبانے اور کمیشن کی مقبولیت کا ڈھنڈورا چار دانگ عالم میں پیٹنے کے لیے کیا جا رہا تھا' اس کا استقبال ہڑتال سے کیا اور اپنے احتجاج آمیز رویہ سے حکومت کو یقین دلا دیا کہ اگر کمیشن نے بمبئی میں قیام کیا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اہل ہند ان مقاصد و عزائم سے ناواقف نہیں جو کمیشن کے تقرر سے استبداد پرستان انگلستان کے پیش نظر ہیں اور برطانیہ کا دل اہل ہند کے احتجاج پر پسیجے یا نہ پسیجے مگر انصاف پسند دنیا دیکھ لے گی کہ فرزندان ہند مادر وطن کے ناموس پر عزیز سے عزیز چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اور آنکھیں بند کر کے اپنی غلامی کے فتوے پر مہر توثیق ثبت کرنا انہیں منظور نہیں۔ اس صورت حالات کا یہ نتیجہ ہوا کہ کمیشن کے ارکان کو جہاز سے اترتے ہی دہلی کی گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ کمیشن کے ورود ہند پر نہ صرف بمبئی میں ہڑتال ہوئی بلکہ ملک کے ہر حصے اور ہر گوشے میں جہاں جہاں کانگرس کی آواز پہنچ سکی' دکانوں میں تالے پڑ گئے اور کاروبار بند ہو گیا۔ حتیٰ کہ اکثر سکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے غیرت و حمیت کے اس مظاہرہ میں حصہ لیا اور ان دھمکیوں کی مطلق پروا نہ کی جو ان کے استادوں کی طرف سے انہیں دی گئیں۔ بمبئی' پونا' احمد آباد' مدراس' دہلی' کلکتہ' لکھنؤ' بنارس' الہ آباد' امرتسر' جالندھر' لدھیانہ' پشاور' اور ان کے علاوہ تمام چھوٹے اور بڑے شہروں میں کامل و مکمل ہڑتال ہوئی۔ لاہور میں ہڑتال کو رکوانے کے لیے حکومت اور اس کے پٹھوؤں نے اپنی تمام طاقتیں جمع کر دیں۔ تحریص و ترغیب اور تخویف و ترہیب کے علاوہ ہر قسم کی ریشہ دوانیوں سے کام لیا گیا.... ان اسباب کے ماتحت لاہور میں ہڑتال ناکام رہی.... سائمن کمیشن دس

مارچ کو یہاں (لاہور میں) آنے والا ہے... ہم اہل لاہور سے عموماً اور مسلمانان لاہور سے خصوصاً عرض کریں گے کہ وہ اس موقع پر احرار ملک کا ساتھ دے کر اس داغ ندامت کو دور کرنے کی کوشش کریں جو انہوں نے ۳- فروری کو پنجاب کے نام نیک پر لگا دیا ہے-"(۳۷)

بہرحال ظفر علی خاں اور کانگرس وغیرہ کی یہ اپلیں رنگ لائیں اور جب سائمن کمیشن لاہور پہنچا تو اس کا استقبال زبردست احتجاجی جلوس نکال کر کیا گیا- جناب اشرف عطا نے سائمن کمیشن کے دورۂ لاہور کی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند کی ہے جس سے مجاہدین آزادی کی قربانیوں اور سرفروشیوں کی ایک روشن جھلک ہمارے سامنے آتی ہے- افسوس ہے یہاں وہ پوری روداد نقل نہیں کی جا سکتی- مختصر یہ کہ "جلوس میں ایک لاکھ سے زائد انسان شامل تھے اور جلوس میں "سائمن گو بیک" اور "ڈاؤن ڈاؤن ود یونین جیک" "ڈاؤن ڈاؤن ود برٹش امپریلزم" "اپ اپ ود نیشنل فلیگ" کے نعرے لگتے رہے- پولیس نے لاٹھیاں برسائیں- مولانا ظفر علی خاں اور لالہ لاجپت رائے خصوصاً ان لاٹھیوں کا نشانہ بنے- لالہ لاجپت رائے تو انہی شدید ضربوں کی وجہ سے چند روز بعد چل بسے- اس تاریخی جلوس کی قیادت کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خاں' ڈاکٹر ستیہ پال- امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری- ڈاکٹر گوپی چند بھارگو- میاں سراج الدین پراچہ- مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی' سردار سردول سنگھ کویشر پانڈہ' سنت رام اور لالہ لاجپت رائے کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں-(۳۸)

مولانا ظفر علی خاں کی نظم بعنوان "لاہور میں سر جان سائمن کا استقبال" اسی قومی معرکہ کی یادگار ہے- چند اشعار ملاحظہ ہوں-

سواگت ہے نرالا سائمن کا
پھٹا آتے ہی گولا ڈھائی من کا
یہ گولا' ماسکو کا بم نہیں ہے
مگر اس بم سے کچھ بھی کم نہیں ہے
ڈر انگریزوں کا ہے جن کے دلوں میں
وہ ٹوڈی گھس گئے اپنے بلوں میں
ہوئیں کیا پھبتیاں آج انقلابی
کہاں ہے آج مذہب یہ رکابی

کدھر ہیں اب یہ بد خواہان ملت
بڑی کیا اس سے ہو گی ان کی ذلت
کہ پہرے میں پولس کے سائمن ہے
اور اس پر شہر سارا خندہ زن ہے(۳۹)

مولانا ظفر علی خاں کی نظم "لاہور مسلم لیگ" بھی اسی پر آشوب دور میں کہی گئی تھی اور ۱۱- نومبر ۱۹۲۸ء کے زمیندار میں شائع ہوئی تھی۔

اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کون کہتا ہے کہ بیکار ہے لاہور کی لیگ
ملک سے برسر پیکار ہے لاہور کی لیگ
جس نے علامہ اقبال کو بدمست کیا
آج اسی نشہ میں سر شار ہے لاہور کی لیگ
سائمن اس کا خداوند یہ اس کی لونڈی
غازۂ عارض سرکار ہے لاہور کی لیگ
جنس دشنام ہے بازار ادب میں ارزاں
مہر و سالک کی خریدار ہے لاہور کی لیگ
اگر احرار میں شامل ہیں سر آغا خاں بھی
تو نمایندۂ احرار ہے لاہور کی لیگ(۴۰)

سائمن کمیشن کے مسئلہ پر مولانا ظفر علی خاں خاصے رواں رہے۔ لیکن اس سلسلے کی تمام نظموں کو یہاں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ سائمن کے بارے میں کن حضرات کا نقطۂ نظر زیادہ قابل ترجیح تھا۔ اس سوال کا جواب دیتے وقت ہمیں تمام اکابر کے حسن نیت کو ملحوظ خاطر رکھنا ہو گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ سائمن کمیشن سے تعاون اور کانگرس سے اختلاف کرنے والوں کا نقطۂ نظر دراصل دو قومی نظریہ ہی کا غیر مبہم پیش آہنگ تھا۔

نہرو رپورٹ

وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birkenhead) نے طنزاً کہا تھا کہ ہندوستانی مدبرین اپنے لیے خود کوئی متفق علیہ دستور کیوں نہیں مرتب کر لیتے۔ اس کے جواب میں مئی ۱۹۲۸ء میں کل

جماعتی کانفرنس نے متعدد اجلاس منعقد کر کے ایک کمیٹی مقرر کی اور اسے دستور کے سلسلے میں تفصیلات طے کرنے کے لیے کہا۔ پنڈت موتی لال نہرو اس کمیٹی کے صدر تھے۔ اس رپورٹ کو جو اس کمیٹی نے پیش کی، نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے۔ نہرو رپورٹ میں قلمروی طرز حکومت (Dominion status) کی سفارش کی گئی تھی۔ صوبوں کی بہ نسبت مرکز کو بہت زیادہ اختیارات دیے گئے تھے اور جداگانہ انتخاب کو ختم کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

پروفیسر محمد خلیل اللہ نے نہرو رپورٹ کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے "نہرو رپورٹ کی سفارشات کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ ساری تجویزیں جو مسلمانوں کے مفاد میں تھیں، نظر انداز کر دی گئیں اور صرف ان باتوں کو لائق اعتنا سمجھا گیا جن سے صرف اکثریت کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ نہرو رپورٹ نے بارہ سال پرانے اس سمجھوتے کو بھی ختم کر دیا جو میثاق لکھنؤ کی شکل میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہوا تھا۔ میثاق لکھنؤ میں نہ صرف جداگانہ حق انتخاب کو تسلیم کیا گیا تھا بلکہ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی گئی تھیں۔ نہرو رپورٹ نے ایک طرف جداگانہ انتخاب کو ختم کیا تو دوسری طرف آبادی کے متناسب نشستوں کی سفارش کر کے انہیں اس حق سے بھی محروم کر دیا۔ صوبہ سندھ کی علیحدگی کو جن شرطوں کا پابند بنایا گیا، ان سے بھی کسی خلوص نیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کی سفارش کے ساتھ ساتھ یہ نیا سوال بھی اٹھایا گیا کہ جنوبی ہند میں کنٹری بولنے والوں کا ایک نیا صوبہ تشکیل دیا جائے۔ یہ گویا سرحد اور بلوچستان میں مسلمانوں کو ملنے والے حقوق کا جواب تھا۔"(۴۱)

نہرو رپورٹ کے سلسلے میں ہونے والی مزید کارروائیوں کے بارے میں پروفیسر محمد خلیل اللہ لکھتے ہیں۔

"۲۸۔ اگست ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں کل جماعتی کانفرنس کے اجلاس میں نہرو رپورٹ منظوری کے لیے پیش کی گئی۔ کانفرنس نے چند ترمیمیں پیش کیں اور طے کیا کہ نہرو کمیٹی میں چند اور ممبر شریک کیے جائیں جو غور و خوض کے بعد یہ رپورٹ ایک مسودہ قانون کی شکل میں سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے نمائندوں کے عام اجلاس میں توثیق کے لیے پیش کریں گے۔ کمیٹی کے نئے ممبروں میں قائداعظم کا نام بھی شامل کیا گیا جو اس وقت انگلستان میں تھے مگر قائداعظم نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ انگلستان سے واپسی (۲۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء) کے بعد قائداعظم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر اپنے جائز مطالبات منوانے کی کوشش کریں۔ آپ نے مسلمانوں کے جذبات کو بے قابو ہونے سے روکنے کے لیے یہ بھی فرمایا کہ نہرو رپورٹ کوئی حرف آخر نہیں

-۷

پنڈت موتی لال نے طے کیا کہ سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کا مجوزہ اجلاس ۲۲- دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتے میں منعقد کیا جائے- قائداعظم نے اس کے جواب میں پنڈت موتی لال نہرو سے تاریخ بڑھانے کی خواہش کی تاکہ مسلم لیگ کونسل کو رپورٹ پر غور کرنے کا موقع مل سکے مگر پنڈت جی نے اس سے انکار کر دیا- اس طرز عمل کے باوجود قائداعظم کسی نہ کسی قسم کی مفاہمت کے لیے کوشاں رہے- آپ نے بڑی مشکل سے مسلمانوں کو راضی کیا کہ وہ بھی انہی دنوں مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں منعقد کریں- اسی دوران میں مرکزی خلافت کمیٹی اور بمبئی صوبائی مسلم لیگ نے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا- پھر بھی قائداعظم کی کوششوں سے مسلم لیگی زعما کانفرنس میں شرکت کے لیے تیار ہو گئے- سیاسی جماعتوں کے نمائندہ اجلاس میں قائداعظم نے چند ترمیمیں مسلمانوں کی طرف سے پیش کیں جن میں تین اہم یہ تھیں:

(i) مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں دی جائیں-

(ii) اگر بالغ رائے دہی کا طریقہ رائج نہ ہو تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب نمائندگی دی جائے-

(iii) صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں تاکہ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبے مرکزی ہندو اکثریت کے اثر سے محفوظ رہیں-

قائداعظم کی ترمیموں پر غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی (Sub-Committee) مقرر کی گئی جس نے انہیں رد کر دیا- قائداعظم نے اب بھی شکست نہ مانی اور عام اجلاس میں انہیں پیش کیا ان ترمیموں کے جواز میں ایک نہایت ہی مدلل اور موثر تقریر کی- بعض ہندو زعماء بھی ان دلائل کے معترف ہو گئے- چنانچہ سر تیج بہادر سپرو نے بھی ایک موثر تقریر کی جس میں ہندوؤں سے اپیل کی گئی کہ وہ مسلمانوں کے جائز مطالبات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں مگر ساری دلیلیں اور اپیلیں بے اثر رہیں- قائداعظم کی ترمیموں میں سے کوئی بھی قبول نہ کی گئی-"(۴۲)

انڈین نیشنل کانگرس نے اس کلکتہ کنونشن میں مسلمانوں کے مطالبات کی پروا کیے بغیر نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا- یہ رپورٹ حکومت کو پیش کی گئی- اور کہا گیا کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ ۳۱- دسمبر ۱۹۲۹ء (یعنی ایک سال کے اندر اس رپورٹ کو منظور نہیں کر لیتی تو کانگرس اپنے پروگرام کے مطابق کامل آزادی کی تحریک پر عمل شروع کر دے گی جس میں سول نافرمانی اور ٹیکسوں کی عدم ادائگی شامل ہے- حضرت قائداعظم ہندوؤں کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہوئے اخبار ڈیلی کرانیکل (Daily Chronicle) کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے آپ نے صاف صاف کہہ

دیا:

"مسلم قوم نہرو رپورٹ کو ہرگز منظور نہیں کر سکتی اور ہرگز ایسا نہیں کرے گی۔ کسی قسم کی چالبازیاں عامتہ المسلمین سے نہرو رپورٹ کی منظوری حاصل نہیں کر سکتیں۔"(۴۳)

نہرو رپورٹ کا سیاسیات ہند پر شدید رد عمل ہوا۔ ہندو بالعموم اس رپورٹ کے حق میں تھے۔ مسلمان رہنماؤں میں سے مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، سر آغا خان مسلم لیگ کے سر شفیع گروپ نے رپورٹ کی مخالفت کی۔ قائداعظم اور ان کی لیگ کا نقطۂ نظر پیش کیا جا چکا ہے کہ وہ رپورٹ کو مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے اس میں ترامیم چاہتے تھے۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی جس میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، تصدق احمد خان شیروانی، رفیع احمد قدوائی وغیرہ شامل تھے، نہرو رپورٹ کے حق میں تھے۔ حضرت علامہ اقبال لاہور لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے نہرو رپورٹ کے بارے میں ایسوسی ایٹڈ پریس کو ۲۰ اگست ۱۹۲۸ء کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:

"میں نے ابھی تک نہرو کمیٹی کی مکمل رپورٹ کا مطالعہ نہیں کیا میں نے صرف وہی حصے دیکھے ہیں جو اخبارات میں شائع ہو گئے ہیں جو کچھ میں نے پڑھا ہے اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ رپورٹ صحیح الدماغی کا ایک نمونہ ہے اور اس سے ملک کے اہم آئینی مشکلات کے حل کرنے کی حقیقی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔"(۴۴)

لیکن رپورٹ کے تفصیلی مطالعہ اور اس پر غوروخوض کے بعد حضرت علامہ کا نقطۂ نظر اس رپورٹ کے بارے میں بدل گیا۔ اور وہ اس کی مخالفت کرنے لگے۔ چنانچہ ملک فیروز خان نون اور سر عبدالقادر کے اشتراک سے حضرت علامہ نے ۷۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا:

"قوم اس امر کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے کہ نہرو رپورٹ ہندوستان کی اکثریت کے لیے قابل قبول نہیں۔"(۴۵)

اس سے قبل ۲۰ ستمبر ۱۹۲۸ء کو فری پریس کے نمائندے سے ملاقات کے دوران میں وہ کہہ چکے تھے:

"مجھے ڈر ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ (جو نہرو رپورٹ کی سفارشات پر غور و فکر اور تبادلہ خیال کے لیے بلایا گیا تمام کے فیصلے جات اور مولانا شوکت علی کے وہ حیرت انگیز انکشافات جو انہوں نے اپنے ابتدائی بیان میں کیے ہیں،

ہندوستان کی فرقہ وار صورت حال کو بد سے بدتر بنا دیں گے... ہندوستان کا مسلمان اب اس جذبہ کو از سرنو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے پر مجبور ہو جائے گا جسے ہندی قومیت کے جذبہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جونہی وہ اس امر پر غور کرے گا وہ اپنے آپ کو مولانا شوکت علی کی طرح پائے گا جن کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں اور جو کمال رنج و احساس درد کے ساتھ اپنے دل کو آزادی کے اس جوش اور جذبہ سے خالی پاتے ہیں جس نے ان کی ہستی میں ایک قسم کی بجلی بھر رکھی تھی۔ تمام باتیں مسلمانوں کے احساس عدم اعتماد کو مستحکم و مضبوط کرنے کا موجب ہوں گی۔"(۴۶)

نہرو رپورٹ کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں کا مؤقف یہ تھا "میں نہرو رپورٹ کا ان ترمیمات کے ساتھ جو "آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں منظور ہوئیں' حامی ہوں۔"(۴۷)

اس ضمن میں یہاں مولانا ظفر علی خاں کی اس تقریر کا اقتباس نقل کرنا دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا جو مولانا نے جون ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتہ میں بمبئی میں فرمائی۔ مولانا کی یہ تقریر "اتحاد" بمبئی کی تیس جون ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں رپورٹ ہوئی تھی۔ زمیندار نے اسے اپنی ۷۔ جولائی ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں نقل کیا اس رپورٹ کی تمہید اور نہرو رپورٹ سے متعلق حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"اس ہفتہ بمبئی میں آقائے ظفر علی خاں' اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خان کی دعوت خاص پر تشریف لائے۔ دو روز تو اعلیٰ حضرت کی ملاقاتوں اور وداع میں گزر گئے مگر تین روز مختلف مقامات میں مختلف انجمنوں کے ارکان سے تبادلہ خیالات ہوا اور چند ولولہ انگیز تقریریں بھی ہوئیں۔ درحقیقت ۱۹۲۱ء کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا اور ہندو مسلم اتحاد اور وطنی جہاد کے لیے ایک زبردست تحریک پیدا ہو گئی۔ علی الرغم مخالفت ٹوڈیان ان شاندار مظاہرات کی کامیابی اور نتیجہ خیزی میں ذرا شک نہیں کیونکہ بمبئی کے چند روزہ قیام میں آقائے ظفر علی خاں کی کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو وہی راہ عمل دکھا دیں جو تحریک خلافت کا مطمع نظر تھی اور کچھ عرصہ سے ہندو مسلم انجمنوں کی وجہ سے مسلمانوں نے اسے ترک کر دیا تھا۔ جینا ہال کے جلسہ میں جہاں ہندو حاضرین بھی تھے' انہوں نے مہاسبھا کی مفسدانہ تحریکات کے خطرناک نتائج سے متنبہ کیا اور مدن پورہ کے جلسہ میں جہاں مسلمان ہی مسلمان تھے' انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے لیے یہی چارہ کار ہے کہ وہ خارجی حکومت کے مقابلہ میں ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں..."

نہرو رپورٹ اور طریق انتخاب

نہرو رپورٹ کی نسبت آقائے ظفر علی خاں صاحب نے ایک ایک پہلو پر تفصیلی خیالات ظاہر کیے۔ اس کے بنیادی اصول بتاتے ہوئے ان فوائد پر روشنی ڈالی جو ہر قوم کو اور وطن کو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں آپ نے فرمایا کہ نہرو رپورٹ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ عام حق انتخاب دیتی ہے۔ اس کی نظر میں ایک کروڑ پتی برلا اور ایک معمولی مزدور دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے عوام اور مزدوروں کے لیے یہ رپورٹ قابل خیر مقدم ہونی چاہیے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہندوستان میں کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔ یا تو حکومت کی طرف سے کھانا اور کپڑا ملے گا ورنہ اس کے لیے کام مہیا کیا جائے گا۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ ہمارے فرمانروا بنگلوں میں بیٹھے داد عیش دیتے ہیں (جبکہ) ہزاروں لاکھوں اہل وطن نان شبینہ کو محتاج اور ستر پوشی سے نا آشنا ہیں مگر ان خارجی حکام کی بلا کو غرض ہے کہ ان کی تکالیف کا خیال کریں اس لحاظ سے بھی نہرو رپورٹ قابل تعریف ہے۔ پھر اس میں ہر شخص کی مذہبی روایات کے تحفظ کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور کامل مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ مجالس میں نیابت کے متعلق بھی اس میں ایسی دفعات ہیں جن سے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔ ہم زیادہ مانگتے ہیں انہوں نے سمجھوتہ کے شرائط میں ہمارے مطالبہ سے کچھ کم رکھی ہیں ہمارا یہ مطالبہ مسلم لیگ کے فیصلہ کے مطابق برقرار ہے۔ مگر اس مطالبہ کی وجہ سے ہم ساری رپورٹ کو مسترد نہیں کر سکتے اور دشمنان آزادی ہند کے بازو مضبوط ہونے کا باعث نہیں بن سکتے۔ سارا جھگڑا پنجاب کی وجہ سے یہ لوگ اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ نہرو رپورٹ میں بعض پہلوؤں سے اس مطالبہ سے بہتر حقوق موجود ہیں جو ہمارے مخالفین کا تھا۔ وہ تو صرف ایک معین مدت کے لیے مسلمانوں کی مخصوص نمائندگی چاہتے تھے جس کے بعد یہ نمائندگی کا طریقہ خود بخود بدل جاتا مگر ہم نے نہرو رپورٹ میں آیندہ نظرثانی کرتے وقت بھی مسلمانوں کے فیصلے پر انحصار کر دیا ہے۔

مشترک انتخابات قومیت کا لیے مفید ہیں کیونکہ اس وقت جب کہ نمائندے اسلام اور ہندو دھرم کے نام سے کونسلوں میں جاتے ہیں تو ہر ایک کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی جماعت میں ہی وقار پیدا کرنے کے لیے دوسرے کے لیے ایک مخالف کی حیثیت اختیار کر لے جس سے ہندوستان کی فضا مین روز بروز زہر زیادہ ہوتا جاتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوتا جاتا ہے کہ مسلمان آزادی کی راہ میں سنگ گراں ہے پس ایسی تحریک پیدا کی

جائے کہ صرف ہندو کے بل بوتے پر ہی آزادی کی کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر مونجے جیسے لوگوں کو زہر پھیلانے کا موقع ملا ہے۔"(۴۸)

مولانا کی نظم 'کلکتہ' بھی جو اب 'بہارستان' کی زینت ہے' کلکتہ کنونشن کی یادگار ہے

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر ایسا سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
آزادی وطن کی تڑپ نے ہنود میں
وہ دل نواز جذبہ ابھارا کہ ہائے ہائے
ان میں وہ اتفاق کی طاقت کہ واہ وا
ہم میں وہ اختلاف کا یارا کہ ہائے ہائے
ملت کی آبرو سے علی بھائیوں کی ضد
لانے لگی وہ زنگ خود آرا کہ ہائے ہائے(۴۹)

نہرو رپورٹ کے سلسلے میں مسلم سیاسی حلقوں میں پیدا ہونے والے سیاسی اختلافات کے بارے میں جناب عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں۔

"پنجاب سے جو بزرگ لکھنؤ جا کر نہرو رپورٹ کو قبول کر آئے تھے' ان میں مولانا عبدالقادر قصوری' مولانا ظفر علی خاں اور تمام دوسرے خلافتی پنجابی کارکن شامل تھے لیکن ان حضرات کو پنجاب میں واپس آتے ہی معلوم ہوا کہ اس معاملے میں قوم ان کے ساتھ نہیں ہے۔ "انقلاب" نے بارہا ان کو چیلنج کیا کہ مسلمانوں کے کسی جلسہ عام میں آ کر نہرو رپورٹ کی حمایت کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ ہمت کر کے دہلی دروازے کے باہر باغ میں مسلمانوں کے سامنے نہرو رپورٹ کی تائید کرنی چاہی لیکن ہزارہا مسلمانوں نے ایک نہ سنی بلکہ اسٹیج پر اینٹیں برسائیں جن سے مولانا عبدالقادر قصوری' مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری زخمی بھی ہو گئے۔ غرض نہرو رپورٹ کے خلاف مسلمانوں میں قہر و غضب کا جذبہ بے حد مشتعل ہو گیا اور مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کی پیہم تائید ہونے لگی۔"(۵۰)

اس زمانے میں نہرو رپورٹ کی حمایت اور مخالفت میں جا بجا جلسے ہو رہے تھے۔ اس قسم کے دو جلسوں کی روداد جناب اشرف عطا کی زبانی سنئے۔

"... مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام باغ موچی دروازہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں سید افضال علی حسنی' ملک فیروز خان نون' مولوی غلام محی الدین قصوری' مولوی عظیم الدین وکیل' خلیفہ

شجاع الدین اور حضرت علامہ شیخ محمد اقبال نے نہرو رپورٹ کے خلاف تقریریں کیں۔ اس جلسہ میں چودھری افضل حق مرحوم اور مولانا ظفرعلی خاں بھی پہنچ گئے مقصد یہ تھا کہ جلسہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ جب حضرت علامہ تقریر فرما رہے تھے تو چودھری افضل حق نے کہا ع

دوزخ کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اس پر حضرت علامہ اقبال اور چودھری افضل حق میں زبردست جھڑپ ہو گئی۔ مسلمانوں کے دلوں میں حضرت علامہ اقبال کی بے حد عزت تھی اس لیے عوام نے چودھری صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا "بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ" جوابی طور پر بھی نعرے لگائے گئے اور جلسہ میں گڑبڑ شروع ہو گئی لیکن اس گڑبڑ کے باوجود جلسہ جاری رہا اور حضرت علامہ اقبال تقریر فرماتے رہے۔

موچی دروازے کے اس جلسہ نے جس میں حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبال نے تقریر کی تھی' سارے شہر میں نہرو رپورٹ پر بحث و تمحیص کے دروازے کھول دیے۔ تھڑوں' دکانوں اور بازاروں میں بحثیں ہونے لگیں۔ ان بحثوں کے دوران کئی مقامات پر آپس میں مار کٹائی ہوئی۔ چنانچہ اس جلسہ کا جواب دینے کے لیے باغ بیرون دہلی دروازہ میں جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ آدمیوں کا ہجوم تھا۔ مخالفین بھی جلسہ کو درہم برہم کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہو کر آئے تھے۔ ان کے پاس لاٹھیاں اور چاقو بھی تھے۔ جلسہ شروع ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے تقریر شروع کی۔ ابھی چند فقرے ہی کہنے پائے تھے کہ ایک طرف سے گڑبڑ ہوئی لیکن ہم نے اس گڑبڑ کو دبا دیا۔ اب دوسرے گوشہ سے شور اٹھا ہم اس طرف بڑھے تو لاٹھیوں اور اینٹوں کی بارش ہو گئی۔ ہمارے رضاکار زخمی ہو گئے۔ صورت حال نازک ہو گئی تو امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے انتہائی دلپذیر لہجہ میں گڑبڑ کرنے والوں سے اپیل کی کہ وہ صبر و سکون سے کام لیں اور آرام سے تقریریں سنیں اگر وہ گڑبڑ سے باز نہ آئے تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے اس کی ذمہ داری ان پر ہو گی۔ اس پر گڑبڑ کرنے والوں نے خشت باری شروع کر دی اور ان اینٹوں کی وجہ سے مولانا ظفر علی خاں کا سر زخمی ہو گیا اور شاہ صاحب کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔(۵۱)

نہرو رپورٹ کی حمایت کرنے پر مولانا ظفر علی خاں کو قتل کی دھمکی بھی دی گئی۔ جس کا جواب مولانا کی طرف سے ۱۲۔ مئی ۱۹۲۹ء کے ضمیمہ میں شائع ہوا۔ مولانا کے اس نوٹ کا عنوان تھا۔ "دہلی سے ایک مژدہ جانفزا" مولانا نے لکھا۔

خدا ترا بت ناداں دراز سن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

... مجھے دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے دو مہینے کے اندر اندر نہرو رپورٹ کے باب میں اپنی روش نہ بدلی یعنی آل انڈیا نوڈیز لمیٹڈ کے دہلوی پروگرام کو اپنا لائحہ عمل قرار دے کر ہندوؤں کے خلاف اعلان جنگ نہ کیا تو تم موت کے گھاٹ اتار دیے جاؤ گے۔ "ینگ مسلم سوسائٹی دہلی" کے پریذیڈنٹ صاحب کی خدمت با برکت میں' جن کی طرف سے مجھے یہ پیغام موت موصول ہوا ہے' نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ گو میں نہرو رپورٹ کا ان ترمیمات کے ساتھ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں منظور ہوئیں' حامی ہوں اور اس لحاظ سے آپ کے نزدیک اور آپ کے سیاسی رہنما حضرت بابائے خلافت اور سر محمد شفیع اور دوسرے قائدین ملت بیضا کے نزدیک دشمن اسلام اور واجب القتل ہوں لیکن خدا کو ایک مانتا ہوں اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتا ہوں اور اس لحاظ سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ایک لمحہ کے کروڑویں حصہ کے برابر بھی نہ آگے بڑھا سکتی ہے نہ پیچھے ہٹا سکتی ہے اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعتہ ولا یستقدمون۔ مجھ میں بڑی خرابی یہ ہے کہ میں اس قسم کی دھمکیوں سے اپنے عقائد نہیں بدلا کرتا' اس لیے آپ دو مہینے کی زحمت انتظار بھی ناحق اٹھاتے ہیں۔ آئیے اور اپنا کام کیجئے۔ ع

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ظفر علی خاں

لاہور ۱۰ مئی ۱۹۲۹ء وقت دس بجے شب بعد نماز عشاء(۵۲)

نہرو رپورٹ کے متعلق کانگرس کی شرط یہ تھی کہ برطانوی حکومت اسے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء تک منظور کر لے ورنہ یہ خود بخود کالعدم قرار پائے گی لیکن حکومت برطانیہ نے یہ رپورٹ منظور نہ کی حتیٰ کہ متعینہ تاریخ آ گئی۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگرس کا ایک اجلاس لاہور میں دریائے راوی کے کنارے جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں' آدھی رات گزرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو راوی کی لہروں کی نذر کر دیا گیا۔ مکمل آزادی کی قرار داد منظور کی گئی اور شرکائے اجلاس نے راوی کے کنارے رقص آزادی کا مظاہرہ کیا۔(۵۳)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

برعظیم کی تحریک آزادی ترک موالات' گاندھی جی کی نمک سازی کی تحریک' گاندھی

اروِن معاہدے، گول میز کانفرنسوں اور فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل ایوارڈ) سے ہوتی ہوئی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) کے نفاذ تک پہنچی۔ اس ایکٹ کو آئینی اصلاحات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ حکومت برطانیہ نے مارچ ۱۹۳۳ء میں گول میز کانفرنس کے تینوں اجلاسوں کی سفارشات پر مبنی ایک قرطاس ابیض (White paper) شائع کیا۔ ۱۱۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو یہ پیپر مزید غور و فکر کے لیے برٹش جوائنٹ پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کے سپرد ہوا۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں انڈین آئینی بل (Indian Constitutional Bill) بنایا گیا جو بالآخر ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو نافذ ہوا۔ یہ دستور دوسری جنگ عظیم کے دوران دسمبر ۱۹۳۹ء میں منسوخ ہو گیا۔

اس ایکٹ کے بارے میں محمد اشرف خاں عطا لکھتے ہیں:

> "اس (ایکٹ) کی رو سے صوبائی خود مختاری عمل میں آئی اور اقلیتوں کے تحفظات کے سلسلے میں گورنروں کو خاص اختیارات دے دیے گئے اور سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ تسلیم کر لیا گیا" (۵۴)

مسٹر آر۔ جی۔ کیسی (R.G. Cassey) کے الفاظ میں:

> "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء خود اختیاری کی طرف ایک بڑا قدم تھا اور وہ سائمن کمیشن کی سفارشات سے بہت آگے بڑھ گیا۔" (۵۵)

سید حسن ریاض گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا دوسرا حصہ اس لیے وضع کیا گیا تھا کہ اس سے پورے ہندوستان کا وفاق پیدا کیا جائے مگر وہ اس وجہ سے کبھی نافذ نہیں ہوا کہ والیان ملک نے وفاق میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا مرکز اسی طرح رہا جس طرح کہ پہلے تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے خلاف مسلمانوں کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ان کے مطالبے کے مطابق ان کے حقوق و مقاصد کی حفاظت کے لیے دستور میں واجب التعمیل دفعات نہیں رکھی گئیں بلکہ اقلیتوں کی حفاظت گورنروں اور گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی میں داخل کر دی.... اس سے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت تو کچھ نہ ہوئی البتہ ان کے اخلاق اور حوصلے پر یہ برا اثر پڑا کہ وہ اکثریت کے مقابلے میں انصاف حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ گورنروں اور گورنر جنرل کی خوشامد کرتے رہیں۔" (۵۶)

آئینی اصلاحات کی یہ تجاویز جب بل کی صورت میں شائع ہوئیں تو حضرت علامہ نے اس کے متعلق اپنے ساتھیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے دو مفصل بیانات دیے۔ ایک ۱۸ مئی ۱۹۳۵ء

کو اور دوسرا ۳- جولائی ۱۹۳۵ء کو- موخر الذکر بیان میں آپ نے کہا "ہم.... یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان انڈیا بل کی حمایت کرنا چاہتے ہیں- مسلمانان ہند کا مختصراً یہ مطالبہ ہے کہ وہ فرقہ وار اعلان کے پیراگراف ۲ دفعہ ٦ کے مطابق انڈیا بل میں شامل ہوں-

وہ تین باتوں کے آرزو مند ہیں (۱) دس سالہ مدت حفاظت اور اطمینان—— اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اصلاحات کا نظام کم از کم دس سال کی مدت کے لیے فرقہ وار اعلان کے اصول پر مبنی ہو- اقلیتوں کا اعتماد اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اس شرط پر عمل کرنا بے حد ضروری ہے (۲) فرقہ وار اعلان کی ترمیم کے سلسلے میں ہر قسم کی گفت و شنید میں ان کی قومی رضامندی اور خوشنودی کو ضروری قرار دیا جائے (۳) اس کی وضاحت کی جائے کہ متعلقہ اقوام کی رضامندی سے مقصود کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل کی جائے گی؟"(۵۷)

حضرت علامہ کے دونوں طویل بیانات اور متذکرہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بل کی تجاویز سے مطمئن نہ تھے بلکہ اس میں ترامیم چاہتے تھے- یہی عدم اطمینان مولانا ظفر علی خاں کے ان اشعار سے بھی جھلکتا ہے جو انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے خلاف کہے- ان اشعار کی ذیلی سرخی تھی "استعمار کی بھینس کا انڈا"- اشعار درج ذیل ہیں-

صدر اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام
لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
اپنے پینے کے لیے شمپین بھر لی جام میں
ہند کے رندان درد آشام کو ٹھرا دیا
میوہ خوری کے لیے چننے لگے جب گول میز
رکھ لیا خود مغز چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا
بھینس استعمار کی گابھن ہوئی مدت کے بعد
اور بڑی دقت سے اصلاحات کا انڈا دیا(۵۸)

لیکن اس وقت کی صورت حال نے مسلمانوں کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے مفاہمت کرنے پر مجبور کر دیا- چنانچہ "آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی اپریل ۳٦ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر غور کرنے کے بعد اس کی صوبائی اسکیم کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اگرچہ اس میں بڑے قابل اعتراض پہلو ہیں لیکن حالات اس کے مقتضی ہیں کہ وہ جیسی

بھی ہے' اس کو اس طرح برتا جائے کہ اس سے جو فوائد حاصل ہو سکیں وہ کیے جائیں.... ایک اور رزولیوشن میں یہ طے کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرے جس کے اہتمام سے یہ الیکشن لڑے جائیں- جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ہونے والے ہیں اور اس کے صدر مسٹر جناح ہوں-" (۵۹)

اس مطالعہ و تجزیہ سے ظاہر ہو گا کہ ۱۹۳۵ء تک پہنچتے پہنچتے حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں کا وہ بعد و فصل جو نظریہ و مقصدیت میں نہیں بلکہ محض طریق کار میں تھا' قرب و وصل سے مبدل ہو گیا- اگرچہ اس کے بعد بھی طرفین کے دلوں میں کبھی کبھار فروعی سیاسی اختلاف کی خراشیں ابھریں لیکن وہ فوراً ہی محو بھی ہو گئیں اور ۱۹۳۷ء کے بعد تو حضرت اقبال' مولانا ظفر علی خاں اور حضرت قائداعظم سیاسیات اسلامیہ کے میدان میں ہم عناں اور ہم رکاب نظر آتے ہیں-

مولانا ظفر علی خاں اور ہندو مسلم اتحاد

ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں کی مساعی پیہم کا کافی تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے- دراصل انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ متحدہ ہندوستان میں تحریک آزادی اور استخلاص وطن کی متحدہ تحریک کا زمانہ تھا- آغاز میں کانگرس تمام ہندوستانیوں کی مشترک جماعت تھی اور اس کی تاسیس (۱۸۸۶ء) میں تمام ہندوستانی قوموں نے مل جل کر حصہ لیا تھا- کانگرس کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا چنانچہ اس کے پہلے اجلاس میں جو ڈبلیو سی بونر جی کی صدارت میں بمبئی میں ۲۸- دسمبر ۱۸۸۵ء کو منعقد ہوا' محمد رحمت اللہ سیانی اور دیگر مسلمان رہنماؤں نے شرکت کی تھی- کانگرس کے متعدد اجلاسوں کی صدارت بھی مسلمان اکابر نے فرمائی مثلاً ۱۸۸۷ء میں کانگرس کے اجلاس مدراس کی صدارت جناب بدرالدین طیب جی نے' ۱۸۹۶ء میں اجلاس کلکتہ کی صدارت جناب محمد رحمت اللہ سیانی نے ۱۹۱۳ء میں اجلاس کراچی کی صدارت نواب سید محمد بہادر نے ۱۹۱۸ء میں اجلاس بمبئی کی صدارت سید حسن امام نے ۱۹۲۱ء میں اجلاس احمد آباد کی صدارت حکیم اجمل خاں نے ۱۹۲۳ء میں اجلاس دہلی کی صدارت مولانا ابو الکلام آزاد نے اسی سال اجلاس کوکناڈا کی صدارت مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۲۷ء میں اجلاس مدراس کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے فرمائی اور پھر ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد مسلسل کئی سالوں تک مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس کے سالانہ اجلاسوں کے صدر بنتے رہے- اگرچہ مجموعی طور پر کانگرس کی پالیسی اور نظم و نسق پر ہندو غالب رہے

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کانگرس ابتدا میں صرف ہندووانہ جماعت نہ تھی بلکہ برعظیم کی مشترکہ حریت کوش جماعت تھی یہی وجہ تھی کہ بہت سے مسلمان رہنما کانگرس کے رکن تھے اور دو قومی نظریہ پر ایمان و ایقان رکھتے ہوئے بھی مشترک سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے اور باہم ایسی ناچاقی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے آزادی کی منزل کے دور یا متاخر ہو جانے کا خدشہ ہوتا۔ کانگرس کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر انصاری' مولانا ظفر علی خاں' مولانا ابوالکلام آزاد' شعیب قریشی اور دیگر متعدد مسلمان رہنماؤں کے ربط و تعلق کو انہی سیاسی حالات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ خود حضرت قائداعظم تادیر انڈین نیشنل کانگرس کے ممبر اور ہندو مسلم اتحاد کے سفیر رہے مسلم زعما میں سے غالباً صرف حضرت علامہ اقبال ہی ایسے دیدہ ور تھے جن کی دانش ایمانی نے ہندو ذہنیت اور اس کی دام گستری سے کبھی دھوکا نہ کھایا۔

مولانا ظفر علی خاں تحریک آزادی کے آغاز ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی متعدد نظمیں اداریے اور مضامین ان کے اس صلح پسندانہ مسلک کے شاہد ناطق ہیں۔ لیکن کانگرس کے رکن ہونے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے مسلسل کوشش کرنے کے باوجود مولانا اپنے اس احساس عظمت و تفاخر سے کبھی مجبور نہیں ہوئے کہ وہ اول و آخر مسلمان ہیں۔ انہوں نے اپنی اسلامیت اور اپنی علیحدہ قومیت کا اظہار زندگی بھر تسلسل و تکرار کے ساتھ کیا۔ اسلام اور اسلامیت کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والوں کو برداشت یا معاف کرنا ان کی اسلامی حمیت کے خلاف تھا۔ اس معاملے میں وہ لگی لپٹی رکھنے کے ہرگز قائل نہ تھے اور دولت و منصب و اقتدار کی کوئی قوت انہیں مرعوب نہ کر سکتی تھی۔ ان کی اس جرات ایمانی کی متعدد شہادتیں ان کے آفاق حیات پر جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ اسلام دشمنی یا مسلم آزاری کے مسئلے پر انہوں نے گاندھی' نہرو' لاجپت رائے' سرکشن پرشاد شاد' مدن موہن مالوی اور سوامی شردھانند جیسی شخصیتوں کو بھی معاف نہ کیا۔ شدھی اور سنگٹھن جیسی تحریکیں اٹھیں تو مولانا نے تحریر و تقریر کے محاذوں سے وہ میزائل پھینکے کہ یہ اسلام دشمن تحریکیں خاکستر ہو کر رہ گئیں۔ اور جب' ہوتے ہوتے یہ حقیقت مولانا پر پوری طرح منکشف ہو گئی کہ کانگرس سے اتحاد ہرگز ملت اسلامیہ کے مفاد میں نہیں اور یہ کہ کانگرس کی ساری بھاگ دوڑ محض رام راج کے لیے ہے تو انہوں نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ غالباً ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ مولانا کے یہاں اس کے بعد بھی گاہے گاہے ہندو مسلم اتحاد کا ساز بجتا رہا اور یہ لے ان کے کلام میں دسمبر ۱۹۴۰ء تک سنائی دے رہی ہے حالانکہ ۱۹۳۷ء سے وہ کھل کر ہندوؤں کی مخالفت اور مسلم لیگ

کی حمایت کر رہے تھے چنانچہ ۵- دسمبر ۱۹۴۰ء کو مولانا یہ ترانہ الاپتے نظر آتے ہیں۔

اگر جینا کا دل آ جائے گاندھی جی کی مٹھی میں
تو غیروں کی غلامی سے وطن آزاد ہو جائے
رواداری کامل کے ہر اک مندر میں چرچے ہوں
ہر اک مسجد جو اب ویران ہے آباد ہو جائے
ادھر ہو شیخ کا کس بل ادھر شکتی برہمن کی
یہ دہرا زور' مرگ دیو استبداد ہو جائے(۶۰)

تاہم یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ خود حضرت قائداعظم بھی حصول آزادی کے عظیم نصب العین کے پیش نظر آبرو مندانہ ہندو مسلم مفاہمت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے چنانچہ ایسوسی ایٹڈ پریس (اپ) کی طرف سے قائداعظم کا ذیل کا بیان ۱۰- جولائی ۱۹۴۰ء کو 'زمیندار' میں شائع ہوا۔

"ہندو لیڈر اگر ہندو مسلم مفاہمت کے متعلق مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں تو میں خوشی سے اس کے لیے تیار ہوں گا۔"

حوالے اور حواشی

۱- باقیات اقبال ص ۲۹-۳۱
۲- ایضاً- ص ۳۳
۳- ایضاً ص ۱۰۹
۴- ایضاً ص ۱۳۰
۵- علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر ۱۹۵۴ء-۵۵ء ص ۵۹
۶- مخزن اپریل ۱۹۰۴ء
۷- بہارستان- ص ۴۳۵
۸- ایضاً ص ۱۸۴
۹- یہ شعر نواب محبوب علی خاں آصف کی اس نظم سے ماخوذ ہے جو انہوں نے ۱۳۱۹ھ میں اپنی سالگرہ کے جشن کے موقع پر اپنی افواج کو مخاطب کرتے ہوئے پڑھی تھی- اس نظم کے تین شعر یہ ہیں۔

اے جاں نثار فوج ظفر موج شکر ہے
جوہر ہیں تم میں صورت شمشیر آبدار

اے اہل فوج دل سے اطاعت وہ تم کرو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار
تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
اس سے ہی کامگار ہو اس سے ہی نامدار

ظاہر ہے کہ زمیندار کی پیشانی پر چھپنے والا شعر مندرجہ بالا اشعار کے چوتھے اور پانچویں مصرعے کو ترکیب نو دینے سے وجود میں آیا۔

۱۰۔ باقیات اقبال۔ ۱۹۷۸ء۔ ص ۲۱۶
۱۱۔ بہارستان ص ۱۹۴
۱۲۔ ایضاً۔ ص ۲۰۵
۱۳۔ بہارستان ص ۱۵۰
۱۴۔ چمنستان۔ مکتبہ کارواں۔ (س ن) ص ۵۰-۵۱
۱۵۔ مضمون از پروفیسر احمد سعید مشمولہ مقالات جشن اقبال صدی ص ۲۰۸' ۲۰۹
۱۶۔ ایضاً۔ ص ۲۰۹
۱۷۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل۔ ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور ص ۲۶' ۲۷
۱۸۔ ایضاً ص ۲۷
۱۹۔ ایضاً ص ۷۰
۲۰۔ روزنامہ زمیندار لاہور۔ ۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء
۲۱۔ زمیندار۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء
۲۲۔ باقیات اقبال ص ۴۷۰.
۲۳۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان ص ۱۲۱۔ ۱۲۲۔
۲۴۔ زمیندار۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۱ء
۲۵۔ گفتار اقبال ص ۱۱۷
۲۶۔ بہارستان۔ نسخہ کارواں۔ ص ۳۱۱
۲۷۔ نقوش۔ اقبال نمبر ۲۔ ص ۵۳۴
۲۸۔ گفتار اقبال۔ ص ۵۲
۲۹۔ ایضاً ص ۶۲' ۶۳
۳۰۔ بہارستان۔ ص ۵۳۳
۳۱۔ بہارستان ص ۳۰۷
۳۲۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان۔ حصہ دوم۔ ص ۱۱۴ تا ۱۱۸
۳۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲۴
۳۴۔ ایضاً۔ ص ۱۲۵

۳۵- بہارستان ص ۳۱۳
۳۶- بہارستان ص ۵۴۲
۳۷- زمیندار بابت ۴- مارچ ۱۹۲۸ء
۳۸- تفصیل کے لیے دیکھیں کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں تذکرے از اشرف عطا- سندھ ساگر اکادی لاہور- مئی ۱۹۶۶ء- ص ۵۳ تا ۵۵
۳۹- بہارستان ص ۵۴۴
۴۰- بہارستان- ص ۴۰۶- دوسرا شعر جو حضرت علامہ اقبال سے متعلق تھا' بہارستان کی ترتیب کے وقت حذف کر دیا گیا-
۴۱- تحریک پاکستان- پروفیسر محمد خلیل اللہ- مکتبہ اختر کراچی ص ۲۰۵
۴۲- ایضاً ص ۲۰۷ تا ۲۱۰-
۴۳- روزنامہ انقلاب لاہور ۹- اپریل ۱۹۲۹ء- بحوالہ مضمون احمد سعید مقالات جشن اقبال صدی شعبہ اقبالیات جامعہ پنجاب لاہور ص ۳۲۴
۴۴- گفتار اقبال- ص ۶۶
۴۵- ایضاً- ص ۸۹
۴۶- ایضاً- ص ۷۰
۴۷- زمیندار- ۱۲- مئی ۱۹۲۹ء
۴۸- زمیندار- ۷- جولائی ۱۹۲۹ء
۴۹- بہارستان ص ۴۰۹
۵۰- سرگذشت از عبدالمجید سالک- ص ۲۵۴
۵۱- اشرف عطا- کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں تذکرے- ص ۶۲' ۶۳
۵۲- زمیندار- ۱۲- مئی ۱۹۲۹ء
۵۳- محمد اشرف خان عطا- قائداعظم- ص ۶۶ نیز ظفر علی خاں از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۵۵-
۵۴- محمد اشرف خان عطا- قائداعظم- ص ۴۷
۵۵- آر- جی- کیسی (R.G. Cassey) کی کتاب (An Australian in India) ص ۴۹ بحوالہ سید حسن ریاض- پاکستان ناگزیر تھا- کراچی ۱۹۸۲ء- ص ۱۸۲
۵۶- سید حسن ریاض- پاکستان ناگزیر تھا ص ۱۸۲
۵۷- گفتار اقبال ص ۱۹۴
۵۸- ظفر علی خاں- نگارستان ص ۱۴۱- ۱۴۲-
۵۹- سید حسن ریاض- پاکستان ناگزیر تھا- ص ۱۸۳
۶۰- چمنستان ص ۱۷۰

باب سوم

اقبال و ظفر اور قیام پاکستان

حضرت علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد (۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۰ء) میں برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا تصور واضح طور پر پیش فرمایا تھا۔ اس خطبہ کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں:

> "میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس سے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔"(۱)

اور پھر حضرت علامہ نے حضرت قائداعظم کے نام اپنے خطوط میں جو ۱۹۳۶ اور ۱۹۳۷ء میں لکھے گئے، اپنی مجوزہ اسلامی ریاست کے خدوخال مزید واضح کیے۔ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام کے سلسلے میں اور بعد ازاں پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے حضرت علامہ نے مسلمانان برعظیم کے لیے وہ گراں قدر خدمات سرانجام دیں جن کے اعتراف و استحسان کے لیے کسی موجودہ لغت کے کلمات تحسین کفایت نہیں کرتے۔ حضرت علامہ کی ان ملی خدمات اور ان کے متذکرہ بالا مکاتیب کی اہمیت کا اعتراف خود قائداعظمؒ نے مکاتیب اقبال بنام قائداعظم کے پیش لفظ محررہ ۲۷۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں یوں فرمایا ہے:

> "اگر مرکزی پارلیمانی بورڈ نے اپنی صوبائی شاخوں کے ہمراہ مسلم لیگ کی طرف سے یہ پہلی عظیم کوشش کی کہ مسلم رائے عامہ قانون سنہ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی مجلس قانون ساز کے لیے لیگ کے ٹکٹ پر آئندہ انتخاب میں حصہ لیا جائے تو لکھنؤ اجلاس اس امر کی نشاندہی کا باعث بنا کہ پہلے مرحلے میں مسلم لیگ کی عوامی سطح پر تنظیم نو ہونی چاہئے اور یہ کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور

بااختیار جماعت ہے۔ ان دونوں مقاصد کے حصول میں' میں اپنے دوستوں جن میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی شامل ہیں' کے انمول تعاون' حب الوطنی اور بے غرض مساعی کی بدولت کامیاب ہو سکا..... میرے نزدیک یہ خطوط (اقبالؒ کے خطوط بنام قائداعظمؒ) زبردست تاریخی اہمیت کے حامل ہیں بالخصوص وہ خطوط جن میں مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات کا واضح اور غیر مبہم اظہار ہے۔ ان کے خیالات پورے طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور بالآخر میں ہندوستان کے دستوری مسائل کے مطالعہ اور تجزیہ کے بعد انہی نتائج پر پہنچا اور کچھ عرصہ بعد یہی خیالات ہندوستان کے مسلمانوں کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ قرار داد لاہور ہے جو عام طور پر قرار داد پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔"(۲)

بعض اسلام دشمن سیاسی اور ادبی دجال پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مشکوک اور کمزور بنانے کے لیے آج بھی اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اکابر پاکستان کی تحریروں کو تحریف کر کے پیش کریں اور اس طرح پاکستان کے بارے میں عالمی رائے اور خود مسلمانوں کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیں انہی سیاسی و ادبی دجالوں میں ایک صاحب ایس حسن احمد (کراڑی داتاں غلام فاطمہ) ہیں جنہوں نے اپنی انگریزی کتاب بنام اقبال۔ ہز پولیٹکل آئیڈیاز ایٹ کراس روڈز" میں اسی روایتی التباس آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں انگلستان کے ایک ادیب اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے پروفیسر ایڈورڈ تھامپسن کے نام حضرت علامہ اقبال کا ایک انگریزی خط مرقومہ ۴۔ مارچ ۱۹۳۴ء بھی شائع کیا گیا ہے اور اس کی گمراہ کن تاویل کی گئی ہے۔ حال ہی میں اس خط کا غلط اور مغالطہ آفریں ترجمہ کر کے (یا کسی سے کرا کے) سید مظفر حسین برنی نے کلیات مکاتیب اقبال جلد سوم میں شامل کیا ہے۔ اب اس خط کے تحریف شدہ ترجمہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ حضرت علامہ تحریک پاکستان کے حق میں نہ تھے (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔ حالانکہ اس خط میں حضرت علامہ کا موقف یہ تھا کہ وہ چودھری رحمت علی کی پاکستان سکیم کے حامی نہیں۔ اس خط کے غلط ترجمہ پر پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے بجا گرفت کی ہے(۳) اس خط کا اصل متن اور صحیح ترجمہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے ایک مضمون مشمولہ اقبال ریویو بابت جنوری ۱۹۸۳ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔(۴) تحریک پاکستان کے سلسلے میں حضرت علامہ اقبال کی خدمات کے بارے میں حضرت قائداعظم کی رائے پیش کی جا چکی ہے۔ ایسی غیر مبہم اور روشن رائے کی موجودگی میں ایس حسن احمد اور ان کے حواریوں کی عنکبوتانہ بافندگی کو کیا اعتبار و وقار حاصل ہو

سکتا ہے؟

ظفر علی خاں اور مسلم لیگ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء

یہ حقیقت محتاج اظہار نہیں کہ مولانا ظفر علی خاں کا خمیر اسلامیت سے اٹھا تھا اور ان کے شجر حیات کے تمام رنگا رنگ فروع اسی اصل کے آثار تھے۔ مولانا اول و آخر مسلمان تھے اور ان کی اسلامیت اپنے اظہار میں کسی مصلحت اور کسی تقیہ کی روادار نہ تھی۔ جناب اشرف عطا کے بیان کردہ ایک واقعہ سے حضرت مولانا ظفر علی خاں کی شان اسلامیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "انٹی کمیونل لیگ (جس کے بانی مشہور نیشنلسٹ رہنما ڈاکٹر محمد عالم تھے) کے زیر اہتمام موری دروازے کے باغ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا ظفر علی خاں بھی اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں پہنچ گئے۔ جلسہ میں ڈاکٹر کچلو نے مذہب پر سخت اعتراضات کیے اور اس امر کا اعلان کیا کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں اور بعد میں مسلمان یا کچھ اور مولانا ظفر علی خاں اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے یہ عقیدہ موجب صد ہزار نازش و مباہات ہے کہ میں پہلے مسلمان ہوں اور اس کے بعد کچھ اور۔ میرا پہلا گھر مکہ ہے دوسرا مدینہ ہے اور تیسرا لاہور یا کوئی اور شہر۔ میں جہاں بھی ہوں، اس معبود برحق اس شہنشاہ حقیقی کا عاجز بندہ ہوں جو آسمان و زمین کا خالق ہے، مشرق یا مغرب کا تاجدار ہے اور جس کے آخری غیر متبدل اور غیر متغیر قانون کا ڈنکا ساری کائنات میں بج رہا ہے۔"(۵)

مولانا ظفر علی خاں اپنے دیگر ملت افروز معاصرین کی طرح ہر اس تنظیم اور جماعت کا ساتھ دینے میں پیش پیش رہتے تھے جو مسلمانوں کی فلاح و فوز کے لیے کوشاں ہوتی تھی چنانچہ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کو جب شاہ باغ ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا افتتاحی اجلاس ہوا تو مولانا ظفر علی خاں بھی اس میں شریک ہوئے۔ نواب سلیم اللہ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرار داد پیش کی۔ حکیم اجمل خاں نے اس قرار داد کی تائید کی اور مولانا ظفر علی خاں نے اس قرار داد کی حمایت میں تقریر فرمائی(۶) مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بھی مولانا ظفر علی خاں نے ملت اسلامیہ کے لیے بالعموم اور مسلمانان ہند کے لیے بالخصوص متعدد قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مسلم لیگ سے مولانا ظفر علی خاں کے ربط و تعاون کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

لیگ کے اس اجلاس میں جو ۳۰- دسمبر ۱۹۱۵ء اور یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو بمبئی میں منعقد ہوا' جناب جناح کی تحریک پر اس مفہوم کی قرارداد منظور کی گئی کہ مسلمانوں کی بہبود کے لیے اصلاحات کی سکیم بنائی جانی چاہئے اس سکیم آف ریفارمز کی توضیح و تشکیل کے لیے قائداعظم نے ذمہ دار مسلمان رہنماؤں کی ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی- اس کمیٹی میں پنجاب سے دس ارکان لیے گئے جن میں مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے-(۷)

مولانا ظفر علی خاں اور علی برادران کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا تھا- آل انڈیا مسلم لیگ کا آٹھواں اجلاس جناب مظہر الحق کی صدارت میں بمبئی میں منعقد ہوا تو جناب صدر نے متذکرہ مسلمان رہنماؤں کی بلاجواز نظر بندی کے خلاف آواز اٹھائی- انہوں نے کہا کہ جس انداز میں ان وسیع دائرہ اثر اور مقبولیت کے حامل مسلم رہنماؤں کو آزار پہنچانے کے لیے یہ قوانین نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے نزدیک قابل اعتراض ہے- ان کی نظر بندی کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی اور لوگ اس سلسلے میں اپنے طور پر ظن و قیاس سے کام لے رہے ہیں..... حکومت کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ برعظیم کے مسلمان اس کے اقدامات کو درست سمجھتے ہیں- نہیں ایسا نہیں ہے اور اگر حکومت مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو آسودہ کرنے کی حقیقی خواہش رکھتی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ رہنماؤں کو جلدی رہا کر دے(۸) اس اجلاس کی تیسری نشست یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو بروز ہفتہ بوقت دس بجے صبح تاج محل ہوٹل بمبئی میں ہوئی- اس نشست میں صرف لیگ کے ارکان اور پریس کے نمائندوں کو شرکت کی اجازت دی گئی تھی- اس موقع پر (قائداعظم) محمد علی جناح نے ذیل کی قرار داد پیش کی-

RESOLUTION V

The All-India Muslim League resolves that a committee consisting of the following gentlemen* be appointed to formulate and frame a scheme of reforms, and that the said Committee is authorized to confer with political and other organizations or committees if any, appointed by such organizations as they may deem fit, provided always that due regard is paid to the needs and interests of the Musalmans of India in the formation of the aforesaid scheme of reforms. The Committee shall submit its report and scheme to the Council of the All- India Muslim League to be presented to the league at its next Annual Session.

اس کمیٹی میں پنجاب سے دس ارکان لیے گئے تھے' ان میں مولانا ظفر علی خاں کا نام بھی شامل تھا(۹)

آل انڈیا مسلم لیگ کا نواں اجلاس لکھنؤ میں ۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو (قائداعظم) محمد علی جناح کی صدارت میں منعقد ہوا- اجلاس کی دوسری نشست میں' جو ۳۱- دسمبر کو ہوئی مولانا ظفر علی خاں اور علی برادران کی نظر بندی کے متعلق ذیل کی قرارداد پیش اور منظور کی گئی-

RESOLUTION VII

The All-India Muslim League records the deep sorrow and pain that have been caused to the entire Muslim community by the internment of Messrs. Mohammad Ali, Shaukat Ali and Zafar Ali Khan, whose great services to the Muslim cause have placed them in the front rank of Muslim public workers. In view of the fact that no definite charges have been brought against any of these gentlemen, the League prays the Government to restore them to liberty, thereby earning the deep gratitude of the Musalmans of India.

یہ قرار داد جناب مظہرالحق نے پیش کی- اس قرارداد پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کمین ترین شخص بھی یہ معلوم کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کے خلاف کیا الزامات ہیں لیکن ان عظیم ابطال کو ان پر لگائے گئے الزامات سے آگاہ نہیں کیا گیا- انہوں نے چیلنج کیا کہ حکومت کا کوئی کارندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حضرات بغاوت پر اکسانے والے یا نامطبوع لوگ ہیں- جناب مظہرالحق نے مسلمانان ہند پر زور دیا کہ وہ اس معاملہ پر پرزور احتجاج کریں اور لارڈ چیمسفورڈ سے ان رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کریں- سید نبی اللہ' مسٹر یعقوب حسن سیٹھ اور مسٹر آر- ایم- غلام حسین نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی اور قرارداد منظور ہو گئی(۱۰)

آل انڈیا مسلم لیگ کا سولھواں اجلاس گلوب سینما تھیٹر بمبئی کے بڑے ہال میں ۳۰- دسمبر ۱۹۲۴ء کو بوقت گیارہ بجے صبح سید رضا علی کی صدارت میں شروع ہوا- اس اجلاس کی تیسری نشست ۳۱- دسمبر کو چار بجے شام متذکرہ بالا مقام پر ہوئی- اس نشست میں یکے بعد دیگرے منظور ہونے والی دو قراردادوں (نمبر ۸'۹) میں مولانا ظفر علی خاں کا ذکر ملتا ہے- قرار داد نمبر ۸ میں کہا گیا-

The All India Muslim League is of opinion that the circumstances of the time imperatively demand that the various Muslim associations of India, representing different shades of policical thought and different parts of the country, should co-operate together to the greatest possible extent, and a united and sound practical activity should be developed to supply the needs of the Muslim community, and that for this purpose, it is desireable that

the representatives of the various associations should meet in a conference at an early date at Delhi, or at some other central place, and that the Secretary of the League should invite the associations and announce a proper time and place for the conference after previous consultation with them.

یہ قرار داد مولانا شوکت علی نے پیش کی۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس کی تائید کی۔(۱۱) (قائداعظم) محمد علی جناح اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس قرارداد کی حمایت کی قرارداد نمبر ۹ کا متن درج ذیل ہے۔

The All-India Muslim League appoints a committee of the following gentlemen, with power to add to their number, nine members being necessary to form a quorum, to formulate the Muslim demand regarding the representation of the Muslim community in the Legislatures of the country and in other elective bodies, and their due and proper share in the public services, with power to them to to confer with the other political organisations and report to the Muslim League.

اس کمیٹی میں مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے (۱۲) مسلم لیگ کا انیسواں سیشن ۳۰۔ دسمبر ۱۹۲۷ء کی شام کو ٹاؤن ہال کلکتہ میں شروع ہوا مولانا ظفر علی خاں اس اجلاس کی تمام نشستوں میں شریک رہے۔ ۳۱۔ دسمبر کی صبح کو اجلاس کی دوسری نشست ہوئی۔ اس میں قائداعظم اور دیگر مسلمان رہنماؤں نے سائمن کمشن کے مقاطعہ کی قرارداد پاس کی۔ یہ قرارداد سر علی امام نے پیش کی تھی۔

اجلاس کی اسی نشست میں خان برکت علی نے ایک قرار داد پیش کی جس کی رو سے لیگ کی کونسل کو ایک ایسی تحتی کمیٹی (Sub-Committee) بنانے کا اختیار دیا گیا جو ہندوستان کے لیے نئے آئین کی تسوید کے سلسلے میں انڈین نیشنل کانگرس کی ورکنگ کمیٹی اور دیگر ایسی تنظیموں سے جنہیں وہ مناسب سمجھتی ہو' مذاکرات کرے تاکہ آئین میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ اس موقع پر حلقہ ہائے انتخاب کے مخلوط یا جداگانہ ہونے اور تجاویز دہلی پر خوب بحث ہوئی۔ اس بحث میں مولانا ظفر علی خاں نے بھی حصہ لیا۔ مولانا کی اس تقریر کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

اس اجلاس کلکتہ کی تیسری نشست (یکم جنوری ۱۹۲۸ء) میں لاہور میں مسلم لیگ کا متوازی اجلاس بلانے پر سر محمد شفیع اور ان کے ساتھیوں کے خلاف قرارداد مذمت منظور کی گئی۔ پنجاب

پراونشل مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ سے الگ کر دیا گیا اور مسلمانان پنجاب سے کہا گیا کہ وہ نئی پراونشل مسلم لیگ بنائیں جو ان کو صحیح نمائندہ ہو(۱۳)

مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے باریسال (بنگال) کے سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر بلینڈی (Blandy) کے رویہ کی مذمت کی گئی جس نے بغیر کسی جواز کے ان مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا تھا جو بستی کلکتی میں ایک مسجد کے صحن میں جمع تھے۔ اس سلسلے میں حکومت بنگال کی بھی مذمت کی گئی جو مسلمانوں کی الم انگیز شکایات کے بارے میں سنگدلانہ بے رخی برت رہی تھی۔ قرارداد مولوی عبدالکریم نے پیش کی۔ مولانا محمد اکرم خاں نے اس کی توثیق اور مولانا ظفر علی خاں نے اس کی حمایت کی(۱۴) نومبر ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں اس میں شریک ہونے کے لیے گیارہ نومبر کو کلکتہ میل سے لکھنؤ روانہ ہوئے (۱۵) آل انڈیا مسلم لیگ کا بیسواں اجلاس ۲۶۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کو مہاراجہ محمود آباد کی صدارت میں البرٹ ہال کلکتہ میں شروع ہوا۔ اجلاس کی دوسری نشست میں جو ۲۷۔ دسمبر کو ہوئی تیسری قرارداد جناب ایم۔ سی۔ چھاگلہ نے پیش کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ صاحبان ذیل لیگ کے نمائندگان کے طور پر اس کنونشن میں شریک ہوں گے جو انڈین نیشنل کانگریس بلا رہی تھی اور مباحث میں حصہ لیں گے۔ یہ حضرات اس طبقاتی مسئلہ کے نکتہ ہائے نظر پر محتاط انداز میں غور و خوض کریں گے اور انہیں پوری وقعت دیں گے جو لیگ کے کھلے اجلاس اور سبجیکٹ کمیٹی میں ظاہر کیا گیا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ضمن میں ان متعدد اہم سوالات کو سلجھانے کی پوری کوشش کریں گے جو نہرو رپورٹ سے ابھرے ہیں۔ یہ نمائندے اپنی مساعی کے نتائج ماہ رواں کی اٹھائیس یا انتیس تاریخ تک لیگ کے حوالے کریں گے تاکہ ان کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے۔ ان نمائندگان میں درج ذیل اصحاب شامل تھے۔

مہاراجہ محمود آباد۔ ایم۔ اے جناح، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ایم۔ سی۔ چھاگلا۔ ملک برکت علی، مولوی عبدالحمید، مولوی مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمود، مولوی حسام الدین، مولوی محمد اکرم خان، مولانا ظفر علیخاں۔ سیٹھ یعقوب حسن، غازی عبدالرحمٰن، عبداللہ بریلوی، تصدق احمد خان شیروانی، چودھری خلیق الزمان، نواب لیاقت علی خاں، مولوی مظہر علی (اظہر) شاہ محمد زبیر، مولوی عبدالکریم متذکرہ بالا کنونشن کلکتہ میں پہلے سے جاری تھا اور اس میں نہرو رپورٹ پر مبنی قرار داد لکھنؤ زیر غور لائی گئی تھی۔(۱۶) اس اجلاس میں حاجی عبداللہ ہارون نے یہ ترمیم پیش کی۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس ایک کمیٹی مقرر کرتا ہے جو نہرو رپورٹ کو تمام پہلوؤں سے جانچے گی اور لیگ کو رپورٹ پیش کرے گی کہ آیا نہرو رپورٹ میں

مسلمانوں کے مفادات کے لیے کافی تحفظات فراہم کیے گئے ہیں۔"

مولانا ظفر علی خاں نے ترمیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذہنیت میں فرق ہے۔ ہندو آپس میں صداقت اور اخلاص سے اختلاف کرتے ہیں جبکہ مسلمانوں میں ٹوڈیوں کا ایک ایسا طبقہ ہے جو اپنے غلط محرکات کی وجہ سے اختلاف کرتا ہے۔"

اس بیان پر ارکان سامعین میں اچھی خاصی برہمی پیدا ہو گئی اور ایوان میں کچھ دیر تک بد نظمی رہی (قائداعظم) محمد علی جناح نے Point of order اٹھاتے ہوئے کہا مسٹر ظفر علی نے غیر پارلیمانی زبان استعمال کی ہے۔ انہیں اپنی بات واپس لینی چاہئے۔ مولانا نے اپنے ریمارکس واپس لینے سے انکار کر دیا اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا اسے ایک بار پھر دہرایا۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے بیان کو ثابت کر سکتا ہوں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ لیگ کے کسی ممبر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے کسی طبقہ کے خلاف سخت الزامات لگائے۔ پھر انہوں نے مسٹر ہارون سے کہا کہ وہ اپنی پیش کردہ ترمیم پر زور نہ دیں۔(۱۷)

مرکزی پارلیمانی بورڈ

آل انڈیا مسلم لیگ کا چوبیسواں سیشن ۱۱۔ ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں جناب وزیر حسن سابق چیف جج اودھ چیف کورٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس سیشن میں قائداعظم بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے قائداعظم کی سرکردگی میں مسلم لیگ کا سنٹرل پارلیمانی بورڈ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس بورڈ کے قیام کے سلسلہ میں قائداعظم نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ ۲۹۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو وہ لاہور آئے اور یہاں تقریباً ایک ہفتہ ٹھہرے۔ یکم مئی ۱۹۳۶ء کو جناب قائد نے شاہی مسجد لاہور میں مسلمانوں سے خطاب فرمایا۔ اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں آپ کے ساتھ تھے۔ نماز جمعہ کے بعد پہلے مولانا ظفر علی خاں نے اور پھر جناب قائداعظم نے تقریر کی۔ جناب نسیم سوہدروی لکھتے ہیں کہ اسی موقع پر قائداعظم نے مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں فرمایا۔

"مجھے اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاں جیسے دو چار آدمی دے دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں پھر مسلمانوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔(۱۸)

مرکزی پارلیمانی بورڈ میں پہلے مولانا ظفر علی خاں کا نام جیسا کہ جناب عاشق بٹالوی نے لکھا ہے، شامل تھا۔ بعد میں مولانا نے اس سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سلسلے کی تفاصیل ہماری ایک اور

کتاب 'مولانا ظفر علی خاں اور پاکستان' میں پیش کر دی گئی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ان معاملات میں مولانا ظفر علی خاں زیادہ قصور وار نظر نہیں آتے۔ بہرحال مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ سے مولانا ظفر علی خاں کے وصل و فصل کے ہنگاموں میں علامہ اقبال' بھی مولوی ظفر علی خاں سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۲۳۔ مئی ۱۹۳۶ء کو قائداعظم کو لکھا:

I do hope that the punjab parties -- specially the Ahrars and the Ittihad Millat --- will eventually, after some bickering join you. A very enthusiastic and active member of the Ittihad told me so a few days ago. About Mr.Zafar Ali Khan the Ittihad people do not themselves feel sure.(19)

اقبال در ہجو مولانا ظفر علی خاں

انہی دنوں حضرت علامہ اقبال نے مولانا کے خلاف یہ اشعار "ایکس شاعر"(۲۰) کے خفیہ قلمی نام سے کہے۔

سوئے کوہسار اڑ گیا مولوی
بڑے بول(۲۱) نے جب کہا کم ٹوی(۲۲)
کوئی مفتی شہر سے پوچھتا
یہ کفر خفی ہے کہ شرک جلی
"مر او را رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی"(۲۳)
مگر سادگی سے یہ سمجھا ظفر
کہ نوشیدنی ہے بٹالے کی نَے(۲۴)

اس زمانے میں سر فضل حسین مسلم لیگ کو ناکام کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے اور اس سلسلے میں قادیانی بھی سر فضل حسین کے حامی تھے یوں سر فضل حسین سے مولانا کے میل جول کو بالواسطہ قادیانیوں سے ربط ضبط قرار دیتے ہوئے حضرت علامہ نے پھر 'ایکس شاعر' کے نام سے لکھا۔

سامنے دونوں کے ہے دین و سیاست کی بساط
لائے ہیں دونوں کھلاڑی اپنی اپنی کعبتین
نقطۂ فائے فرنگی سے ہے دونوں کی کشود
یہ وہ نقطہ ہے کہ جس سے عین ہو جاتا ہے غین

انتشار ملت بیضا ہے دونوں کی غرض
متحد پھر کیوں نہ ہوں محمود(۲۵) اور فضل حسین
لذت حرکت سے گو محروم ہیں دونوں مگر
نحو انگلش میں روا ہے التقائے ساکنین
یہ ہوائے قادیاں تھی یا ہوائے کوہسار
بجھ گئی افسوس بیچارے ظفر کی لالٹین
اب حریم قادیاں میں ہے بٹالہ بھی شریک
لازم آیا مولوی پر سجدہ سوئے قبلتین(۲۶)

اسی تناظر میں ''ایکس شاعر'' کے یہ اشعار بعنوان 'لاالہ الا فرنگی' ۲۹۔ جون ۱۹۳۶ء کو روزنامہ 'احسان' لاہور میں شائع ہوئے۔

ہو گئی ہے مادیان قادیاں اس پر سوار
اب کہاں ہے وہ سوار مادیان قادیاں(۲۷)
التوا کیوں اس قدر اس کی اشاعت میں ہوا
ٹیچی ٹیچی نے اڑا لی 'ارمغان قادیاں'(۲۸)
لو فرنگی کی اولوالامری سے باز آیا پسر(۲۹)
کس قدر بدلے زمین و آسمان قادیاں
خیر اب پنجاب کی مجھ کو نظر آتی نہیں
ہے بٹالے کے گلے میں ریسمان قادیاں
اس قدر پنجاب میں بام وزارت ہے بلند
چور چڑھتے ہیں لگا کر نردبان قادیاں
لاٹ سے روٹھے گئے پنڈت کے استقبال کو(۳۰)
دیکھ کس روزن سے نکلا ہے دخان قادیان
نیشنل کور و طواف شملہ و منع جہاد
خود غلام احمد نہ سمجھا چیستان قادیاں
'لا الہ الا فرنگی' کلمہ دین بروز
'الفرنگی اکبر' آواز اذان قادیاں(۳۱)

'ایکس شاعر' کے سلسلہ منظومات کی ایک اور نظم بعنوان 'احرار اور اتحاد ملت' میں بھی

مولانا ظفر علی خاں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ذرا سن لو بزرگان بہم آمیز کے قصے
بڑے لوگوں کے اشغال عداوت بیز کے قصے
ادھر ناگفتنی احرار کی مسجد سے بیزاری
ادھر اک عقدہ مشکل ہیں دستاویز کے قصے

'دستاویز' کا اشارہ تحریک مسجد شہید گنج کی طرف ہے۔ 'تحریک مسجد شہید گنج' نامی کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی نے متذکرہ بالا 'دستاویز' کے سلسلے میں ذیل کا نوٹ لکھا ہے۔

"۱۹۲۲ء میں خلافت کمیٹی کے سیکرٹری جنرل ملک لعل خاں اور سکھوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا تھا جس کے مطابق یہ مسجد مسلمانوں کے قبضے میں دی گئی تھی لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسلمان اس مسجد پر اپنا قبضہ مستحکم نہ کر سکے۔ یہ دستاویز ملک لعل خاں ہی کے پاس تھی جب مسجد کا دعویٰ عدالت میں دائر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس دستاویز کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملک لعل خاں نے یہ دستاویز دفتر 'زمیندار' پہنچا دی تھی۔ کسی طرح یہ مولانا ظفر علی خاں کے صاحب زادے اختر علی خاں تک پہنچی جنہوں نے اسے چند ٹکوں کے عوض سکھوں کے حوالے کر دیا۔"(۳۲)

۱۹۳۷ء کے انتخابات

جنوری۔ فروری ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ احرار اور مجلس اتحاد ملت نے اپنے الگ الگ امیدوار کھڑے کیے۔ اتحاد پارٹی (یونینسٹ) ان کی حریف غالب تھی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کے سات امیدواروں میں سے صرف دو کامیاب ہوئے یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں۔ منتخب ہونے کے فوراً بعد راجہ صاحب بھی اتحاد پارٹی سے جا ملے اور اسمبلی میں صرف ایک لیگی ممبر باقی رہ گیا۔

ان انتخابات میں اگرچہ مجلس اتحاد ملت نے اپنے الگ امیدوار کھڑے کیے تھے لیکن مولانا ظفر علی خاں نے احرار کے خلاف اور لیگ کی حمایت میں بھرپور انتخابی مہم چلائی مثلاً امرتسر میں احرار کے امیدوار شیخ حسام الدین کے مقابلہ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ ڈاکٹر کچلو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے کے لیے آمادہ نہ تھے اور علامہ اقبال نے انہیں آزاد امیدوار کے طور پر الیکشن لڑنے پر رضامند کر لیا تھا(۳۳) مولانا ظفر علی خاں نے ۲۷۔ دسمبر ۱۹۳۶ء کو کچلو کے حق میں فرمایا۔

کون دے گا ووٹ بیچارے حسام الدین کو
کچلو امرتسر میں جب مختار مطلق ہو گیا (۳۴)

+++

ڈاکٹر کچلو زبر ہیں اور حسام الدین ہیں زیر
یہ دمن اس عہد کی وہ نل سیاسیات کا (۳۵)

اس طرح ملک برکت علی کی حمایت میں آپ نے ۱۹۔ جنوری ۱۹۳۷ء کو لکھا

اگر سرکار مرشد تھی تو احراری ولی نکلے
اور ان کی گوشمالی کو ملک برکت علی نکلے (۳۶)

۱۹۳۷ء کے انتخابی نتائج کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خاں نے ۷ مئی ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کے نام ایک خط لکھا اور مسلم لیگ کو زیادہ منظم اور فعال بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس انگریزی خط کی عکسی شبیہ اور اس کا ترجمہ جناب زاہد منیر عامر کی مرتب کردہ کتاب "مکاتیب ظفر علی خاں" میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۳۷ء کے ضمنی انتخابات اور کونسل کی رکنیت کے انتخابات میں بھی مولانا ظفر علی خاں نے مسلم لیگ سے بھرپور تعاون کیا اور اپنی تحریر و تقریر سے مسلم لیگ کی مدد کی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب 'مولانا ظفر علی خاں اور پاکستان'۔

مجلس اتحاد ملت اور مسلم لیگ

مسلم لیگ سے مولانا ظفر علی خاں کے مکمل اشتراک و تعاون ہی کا ایک کرشمہ تھا کہ مولانا نے اپنی جماعت مجلس اتحاد ملت' کو مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مجلس اتحاد ملت' تحریک مسجد شہید گنج کے دوران میں ۱۹۳۵ء میں تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ (اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں مولانا نے مجلس اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا تھا۔ ممکن ہے ایسا کوئی اعلان ہوا ہو لیکن تاریخی ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس اتحاد ملت ۱۹۴۰ء تک قائم رہی اور اس نے موقع بہ موقع مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ قرار داد پاکستان (مارچ ۱۹۴۰ء) کے سلسلہ میں بھی مجلس اتحاد ملت نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ جناب ابو سعید انور کے اس خیال سے انکار مشکل ہے "ایسی جماعت (اتحاد ملت) سے پنجاب میں ان کی وجہ سے بالخصوص اور یوپی' صوبہ سرحد میں بالعموم مسلم لیگ کو ابتدائی کارکن میسر آئے اور پھر قریہ قریہ گاؤں گاؤں خود مولانا مرحوم (مولانا ظفر علی خاں) نے مسلم لیگ کا پیغام سنایا۔"(۳۷)

مولانا مرکزی قانون ساز اسمبلی میں

۱۹۳۷ء میں مولانا ظفر علی خاں سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کی سبیل یہ ہوئی کہ اپریل ۱۹۳۷ء میں پنجاب کی طرف سے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن کے ایل گابا مستعفی ہو گئے۔ اس خالی نشست کے لیے مختلف سیاسی پارٹیوں نے اپنے امیدوار کھڑے کیے مسلم لیگ کی طرف سے مولانا ظفر علی خاں نے اس ضمنی انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہو کر ۲۳۔ اگست ۱۹۳۷ء کو سنٹرل اسمبلی میں رکن کی حیثیت سے پہنچے۔ مسلم لیگ کے رکن اسمبلی کی حیثیت سے مولانا نے مسلمانان برعظیم اور مسلم لیگ کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ مثلاً ۱۷۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو جب مرکزی اسمبلی میں آئین ۱۹۳۵ء کے مسترد ہو جانے کے بعد نیا آئین بنانے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل پر بحث ہو رہی تھی' مولانا ظفر علی خاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہندو تقسیم ہندوستان میں وہ رویہ اختیار کر رہے ہیں جو ایک بڑے بھائی نے چھوٹے کے ساتھ مکان کی تقسیم میں کیا تھا۔

از صحن خانہ تابہ لب بام ازاں من
وز بام خانہ تابہ ثریا ازان تست

انگریز باتوں سے نہیں نکلیں گے۔ اگر لڑنے پر آمادہ ہو تو میں ساتھ دے سکتا ہوں۔ زاغلول پاشا مصری کی سی فراست اور فراخدلی اختیار کرو۔ مسلمانوں کو کچلنے کے ارادوں سے باز آؤ۔" (۳۸)

مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ

مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس لال باغ لکھنؤ میں ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو شروع ہوا۔ اور ۱۸۔ اکتوبر تک جاری رہا۔ اس اجلاس کی صدارت قائداعظم نے فرمائی۔ مولانا ظفر علی خاں اس اجلاس کی تمام نشستوں میں شریک رہے۔ اس اجلاس کی تیسری نشست اتوار ۱۷۔ اکتوبر کو صبح ساڑھے دس بجے محمد علی جناح کی صدارت میں ہوئی۔ اس نشست میں مسلم لیگ نے تازہ صورت حال میں اپنے نصب العین اور مطمح نظر کا اعلان ایک قرارداد کی صورت میں یوں کیا:

"قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مطمح نظر ایسی آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی صورت میں کامل آزادی حاصل کرنا ہے جن میں آئین کے اندر مسلمانوں اور دوسری

اقلیتوں کے حقوق اور مفادات مناسب اور موثر طور پر محفوظ ہوں۔" یہ قرارداد مولانا حسرت موہانی نے پیش کی اور اس کی وضاحت میں تقریر بھی فرمائی۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس قرارداد کی تائید کی اور فرمایا کہ مسلمان ہمیشہ آزادی کے لیے محو فکر رہے ہیں۔ ہندوستان صرف ایک قوم پر مشتمل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جمہوریت کے بہترین اصولوں کے مطابق مسلمان ہمیشہ اکثریتی طبقہ کے رحم و کرم پر ہوتے لیکن انہوں نے اس حیثیت میں رہنے سے انکار کیا ہے۔ مسلمانوں کو حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور دوسرے طبقوں کو حصول آزادی میں مدد دینی چاہیے۔"(۳۹)

اجلاس لکھنؤ کی اسی نشست میں مولانا ظفر علی خاں نے مسجد شہید گنج کے بلاجواز انہدام کی مذمت، مسجد کی بحالی اور اس کی ازسرنو تعمیر کے بارے میں بھی ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید پروفیسر ملک عنایت اللہ نے کی۔(۴۰) اسی نشست میں مولانا نے ایک قرار داد بلوچستان کے بارے میں پیش کی جس میں حکومت برطانیہ پر زور دیا گیا کہ وہ بلوچستان میں موجودہ مستعمرانہ نظام کی جگہ دوسرے صوبوں کی طرح جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنے کے لیے فوری اقدامات کرے۔ سکندر جناح پیکٹ بھی جو بعد میں مسلم لیگ کے حق میں سرابستان ثابت ہوا، لیگ کے اسی اجلاس لکھنؤ میں صورت پذیر ہوا تھا اور اسی اجلاس لکھنؤ میں سر سکندر حیات (چیف منسٹر پنجاب) اور فضل الحق (چیف منسٹر بنگال) نے اپنے مسلم اکثریت کے پارلیمانوں کو مسلم لیگ میں مدغم کرنے کا اعلان کیا تھا اور مسلم رابطہ کی مہم بھی جاری کی گئی تھی۔(۴۱)

مسلم لیگ اور اتحاد پارٹی (یونینسٹ پارٹی) کے باہمی اشتراک و تعاون کے خیال سے دیگر مسلم زعما کی طرح مولانا ظفر علی خاں بھی بہت خوش تھے اور اپنی اس خوشی کا اظہار انہوں نے متعدد نظموں میں کیا۔ مثلاً ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ کے ایک جلسہ میں صدر جلسہ مولانا شوکت علی کی فرمائش پر انہوں نے ایک نظم کہی اور اس میں فرمایا۔

سکندر اور جینا قوم کی آنکھوں کے تارے ہیں
اسی سے شوکت اسلام کا اندازہ ہوتا ہے

مسلم لیگ کے اسی اجلاس لکھنؤ میں مولانا ظفر علی خاں کی ایک تقریر کا ذکر جناب عاشق حسین بٹالوی نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو قائداعظم نے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے لیگ کا پرچم لہرایا اور آٹھ دس منٹ کی مختصر تقریر میں قومی

پرچم کی اہمیت بیان کی۔ تقریر انگریزی میں تھی۔ لوگوں نے مولانا (ظفر علی خاں) سے کہا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کر دیجئے۔ مولانا نے ترجمہ کی آڑ میں اپنی تقریر شروع کر دی جو پون گھنٹہ جاری رہی۔ دوران تقریر میں ایک موقع پر جوش میں آ کر کہنے لگے "ہم تین سو تیرہ تھے اور ہم نے دنیا کو تین تیرہ کر دیا۔" میرے پاس دو لکھنوی اصحاب کھڑے تھے۔ اس رعایت لفظی پر پھڑک اٹھے اور آگے بڑھ کر کہنے لگے "واللہ ظفر علی خاں یہ تیرا ہی حصہ ہے۔"(۴۲)

کچھ اور انتخابی دورے

۱۹۳۷ء میں مولانا نے مسلم لیگ کے حق میں دور دراز مقامات کے انتخابی دورے کیے اور اپنی لسانی اور وجدانی صلاحیتوں سے مسلم لیگ کو فائدہ پہنچایا۔ اس ضمن میں حسن پور (ضلع مراد آباد) امروہہ' سہارنپور اور بلند شہر وغیرہ کے انتخابی دورے خصوصاً قابل ذکر ہیں ان میں سے اکثر دوروں میں مولانا شوکت علی بھی آپ کے ہمراہ رہے۔ مولانا شوکت علی کے بارے میں بعض اشعار انہی دوروں کے دوران میں کہے گئے۔ مثلاً اپنے دو اشعار کی شان نزول بیان کرتے ہوئے مولانا ظفر خاں لکھتے ہیں:

> "دھان پور میں ایک اور لطیفہ ہوا۔ ابھی چاء پینے سے فراغت ملی تھی کہ مولانا شوکت علی کو جو اس دورہ میں میرے رفیق طریق تھے' پیشاب کی حاجت ہوئی۔ جب وہ ادب خانہ سے مست ہاتھی کی طرح جھومتے جھامتے نکلے تو یاران سرپل نے کہا۔ کچھ اس پر بھی۔ میں نے فی البدیہہ یہ قطعہ عرض کیا۔
>
> دھان پور آئے جناب حضرت شوکت علی
> ہاتھ رکھے قبضہ شمشیر جوہر دار پر
>
> اس سے مراد وہ شمشیر ہے جو مولانا شوکت علی کو اپنے برادر مرحوم رئیس الاحرار محمد علی جوہر سے ترکہ میں ملی تھی۔
>
> میں نے پوچھا کانگریس کے حق میں کیا کہتے ہیں آپ
> ہنس کے بولے کانگریس کو مارتا ہوں دھار پر
>
> دھار سے کچھ اور نہ سمجھ لیجئے گا۔ اس سے یہاں تلوار کی دھار مراد ہے۔"(۴۳)

مسلم لیگ سے مولانا ظفر علی خاں کے اشتراک و تعاون کے سلسلہ میں ذیل کی شہادتیں بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

۴- نومبر ۱۹۳۷ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اعزازی سیکرٹری جناب غلام رسول نے حضرت قائداعظم کو لکھا:

"جہاں تک تنظیمی کمیٹی کا تعلق ہے پراونشل لیگ پہلے سے موجود ہے اور ہم ضلع تحصیل اور گاؤں کی سطح پر شاخیں قائم کر رہے ہیں اس لیے یہاں کسی تنظیمی کمیٹی کی ضرورت نہیں لیکن اگر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کی قرارداد کی رو سے تنظیمی کمیٹی کا قیام ضروری ہے تو اس سلسلے میں درج ذیل نام تجویز کیے جاتے ہیں-"

اس کے بعد غلام رسول صاحب نے پچیس افراد کے نام تجویز کیے ہیں جن میں مولانا ظفر علی خاں کا نام بھی شامل ہے-(۴۴)

جناب غلام رسول اپنے اسی مکتوب میں مسلم لیگ کے نظرثانی شدہ سنٹرل پارلیمانی بورڈ کا ذکر کرتے ہیں اور شکوہ کرتے ہیں کہ اس بورڈ میں سات نشستیں سر سکندر کی پارٹی کو الاٹ کر دی گئی ہیں اور ان کے مقابلے میں ہم بشمول مولانا ظفر علی خاں صرف تین رہ گئے ہیں-(۴۵)

۹- نومبر ۱۹۳۷ء کو جناب شفاعت احمد خان نے قائداعظم کے نام اپنے خط میں مسلم لیگ سے احرار کی علیحدگی اور مولانا ظفر علی خان کی پیوستگی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا-

"احرار کانگرس میں شامل ہو گئے ہیں کیونکہ مولانا ظفر علی خان لیگ میں شامل ہو گئے ہیں-"(۴۶)

۲۷- دسمبر ۱۹۳۷ء کو مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں مجلس اتحاد ملت اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس شاہی مسجد لاہور میں ہوا جس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانوں کو اتحاد کا درس دیا-(۴۷)

ظفر علی خاں اور مسلم لیگ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک

مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے مولانا کی ۱۹۳۸ء سے اوائل ۱۹۴۰ء تک کی خدمات کا ملخص ذیل میں پیش کیا جاتا ہے-

○ ۳۰- ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں کونسل آف دی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں، جو قائداعظم کے زیر صدارت منعقد ہوا، شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلمانوں کی تنظیم کے لیے جو کمیٹی بنی، اس میں مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے-(۴۸)

○ ۲۱- اپریل کو حضرت علامہ اقبال کا وصال ہو گیا- مولانا ظفر علی خاں ان دنوں کلکتہ میں تھے- یہ وحشت خیز خبر سن کر مولانا نے وہ تعزیتی اشعار کہے جن کا مطلع درج ذیل ہے-

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا

○ ۳- جولائی ۱۹۳۸ء کو مولانا نے بمبئی میں فرمایا۔

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے
منہ پر ہے صدا آزادی کی اور دل میں شوق غلامی کا
اکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی ان دونوں نے مل کر باندھی ہے(۴۹)

○ اگست ۱۹۳۸ء میں بقول مولانا "صندل ہال شملہ میں مقامی انجمن اسلامیہ کی طرف سے ایک تعلیمی جلسہ ہوا۔ اکابر و اعیان شملہ مدعو تھے۔ مسٹر جینا (قائداعظم محمد علی جناح) بھی بلوائے گئے تھے۔ ان کی تقریر کے بعد میری تقریر ہوئی جس کی تمہید ذیل کے برجستہ اشعار تھے۔"

دیا یہ درس صندل ہال میں جینا نے یاروں کو
تمہیں مرنا نہ آئے گا تو جینا بھی نہ آئے گا
مسلمانو مسلماں نام ہی کے ہو تو سن رکھو
تمہارے کام مکہ اور مدینہ بھی نہ آئے گا
سمندر کو نہ چیرو گے خدا کا نام اگر لے کر
یقیں مانو کہ ساحل تک سفینہ بھی نہ آئے گا

○ ۲۲- اکتوبر ۱۹۳۸ء کو مردان میں مسلم لیگ کانفرنس مولانا ظفر علی خاں کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اپنے صدارتی خطبے میں مولانا نے دو قومی نظریہ کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے فرمایا:

"مدنی سرکارؐ کے غلام' نماز و عبادت کرنے والے' جہاد کرنے والے' مغلوب نہیں ہو سکتے۔ وہ غالب ہونے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ ملت دوسروں میں مدغم نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں نو کروڑ مسلمان ہیں جو یہاں اپنی حیثیت کے مالک ہیں۔ ہمارا خدا الگ' ہمارا رسولؐ الگ' ہماری نماز الگ' روزہ و حج و زکوۃ الگ' طریقہ جہاد الگ۔ ہم آزادانہ حیثیت سے ہندوستان میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم نہ تو انگریز کے سامنے جھکنے کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں اور نہ واردھا کے احکام کے ماتحت اپنی اسلامی زندگی کو چھوڑ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں.... گاندھی جی اور کانگرس کے دوسرے نیتاؤں کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے۔ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ دو قومیں بستی ہیں ہندو اور مسلمان۔ مسلمانوں کی نسبت میں کہہ چکا

ہوں کہ وہ ہندویت میں ابداً مدغم نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر ہندو مسلمانوں کا کیش و آئین اور تہذیب اختیار کر لیں تو پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ قول صحیح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف ایک جاتی آباد ہے۔" (۵۱)

○ ۵- فروری ۱۹۳۹ء کو آپ نے گاندھی صاحب کو یہ خراج پیش کیا۔

اے سامری وقت کہ گاندھی ہے ترا نام
کہتے ہیں نصاریٰ کا تجھے بندہ بے دام
ہندو کو مسلماں سے لڑانا ہے ترا کام
ہم کو نظر آتا ہے جو ہو گا ترا انجام
اے دشمن اسلام!
سانچے میں اہنسا کے مسلماں نہ ڈھلے گا
سرحد کے پٹھانوں پہ یہ جادو نہ چلے گا
چرخہ لیے بیٹھا ہوا تو ہاتھ ملے گا
مدت سے تری ناک میں ہے گردش ایام
اے دشمن اسلام! (۵۲)

○ ۱۴- ۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو مولانا نے بورے والا کے جلسوں میں شرکت کی اور مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی طور پر مضبوط ہونے کی تلقین فرمائی (۵۳)

○ اپریل، مئی ۱۹۳۹ء میں مولانا نے صوبہ بہار کے متعدد شہروں کا دورہ کیا اور اسلام کی تبلیغ اور مسلم لیگ کی تنظیم و تقویم کے فرائض سرانجام دیے۔ (۵۴)

○ تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں کی مساعی جمیلہ کی بعض تفصیلات مولانا کی اس ڈائری سے بھی ملتی ہیں جس کے کچھ حصے ۱۹۵۷ء میں 'زمیندار' میں شائع ہوئے۔ مولانا ۲۸- جولائی ۱۹۳۹ء کی روداد یوں لکھتے ہیں۔

"صبح دس بجے کوئٹہ پہنچا۔ قاضی محمد عیسیٰ مسلم لیگ کے کارکنوں اور عمائد بلوچستان کے ہمراہ اسٹیشن پر استقبال کو موجود تھے خاکسار بھی بہ تعداد کثیر موجود تھے۔ میرا جلوس نکالا گیا جو بڑا شاندار تھا۔ سارے شہر میں گھوم پھر کر ملک محمد جان خان سالار رضا کاران لیگ کے مکان پر فروکش ہوا۔ ارباب کرم خان نے رات کو پر تکلف دعوت دی۔ رات کو جلسہ عام ہوا۔ بیس ہزار سے کم مجمع نہ ہو گا۔ میری تقریر ہوئی۔ آزادی کا بے پناہ جذبہ لوگوں کے دلوں میں دوڑ گیا۔ بلوچستان کے لیے ہندوستان کے

دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات حاصل کرنے کا عزم بالجزم کر لیا گیا۔" (۵۵)

○ اواخر اگست اور اوائل ستمبر میں آپ نے بھیرہ اور سرگودھا وغیرہ کا دورہ کیا۔ ۲۳۔ اگست کو آپ نے بھیرہ میں کانگرس اور گاندھی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

کچھ اس کی بھی خبر ہے تم کو چرخہ کاتنے والو
کہ تلواروں کے سایہ میں مسلماں کا بسیرا ہے
مسلماں ہی پہ کیا موقوف جو قومیں بھی غالب ہیں
ہے ان میں کون جس نے سوت اہنسا کا اٹیرا ہے
رسول اللہؐ کے گھر میں یہ کیسا انقلاب آیا
کہ گاندھی جی کی کٹیا' عالمان دیں کا ڈیرا ہے
خدا ہی جانتا ہے حشر اس ٹولی کا کیا ہو گا
حرم سے جس کی بدبختی نے رخ ملت کا پھیرا ہے (۵۶)

○ ۱۱۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو مرکزی اسمبلی میں مسٹر اینے (Mr. Anne) کی ایک تخفیف کا جواب دیتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے کہا کہ

"اگر ہندو یہ چاہتے ہیں کہ ملک ایک اور قومیت ایک ہو تو ان کو چاہئے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اس پر ایمان لے آئیں تو ایک قوم ہو جائیں گے۔" (۵۷)

غرض ان سالوں میں بھی مولانا ظفر علی خاں نے مرکزی اسمبلی کے اندر اور باہر تقریباً ہر موقع پر قائداعظم اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔

قرارداد پاکستان

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور ۲۲۔ مارچ ۱۹۴۰ء سے شروع ہونا تھا۔ روزنامہ زمیندار' نے ۱۹۔ مارچ کو اعلان کیا کہ ۲۱۔ مارچ کو مسلم لیگ نمبر نکالا جائے گا لیکن یہ نمبر معلوم نہیں کیوں شائع نہ ہو سکا۔ ۲۱۔ مارچ ہی کو قائداعظم اجلاس میں شریک ہونے کے لیے لاہور تشریف لا رہے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے مرزا امتیاز علی سالار اعلیٰ جیش نیلی پوشاں (یعنی مولانا ظفر علی خاں کی قائم کردہ مجلس اتحاد ملت) ضلع لاہور کی طرف سے روزنامہ زمیندار کے شمارہ ۲۱۔ مارچ کی وساطت سے لاہور کے نیلی پوش مجاہدوں کو یہ اطلاع دی گئی :

"تمام ضلع لاہور کے نیلی پوش رضا کاران اتحاد ملت کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح ۲۱۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو جمعرات کے دن بوقت ٹھیک

نو بجے صبح لاہور اسٹیشن پر تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کا جلوس شہر کی طرف روانہ ہو گا اس لیے انہیں بذریعہ اخبارات اطلاع دی جاتی ہے کہ صبح سات بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں پہنچ جائیں تاکہ تمام نیلی پوش جیش ایک نظام کے ماتحت اسٹیشن پر پہنچیں اور جلوس میں شامل ہوں۔ بھاٹی دروازہ' مزنگ' باغبانپورہ اور موچی دروازہ کے سالاروں کو بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ بھی اسی مقام پر صبح سات بجے پہنچ جائیں۔"(۵۸)

۲۱۔ مارچ ۱۹۴۰ء ہی کے 'زمیندار' میں میاں بشیر احمد بیرسٹرایٹ لاء سیکرٹری مجلس استقبالیہ نے "آل انڈیا مسلم لیگ کا اہم تاریخی اجلاس" کے عنوان سے ۲۲۔ مارچ کا مجوزہ پروگرام شائع کرایا اور مسلمانوں سے استدعا کی کہ وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ۲۲۔ مارچ کے جلوس اور اجلاس میں شریک ہوں اور اس قومی اجتماع کو بے مثال بنا دیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں شریک ہونے کے لیے حضرت قائداعظم ۲۱۔ مارچ کو علی الصبح اسپیشل ٹرین کے ذریعے لاہور پہنچے۔ اسی روز انہوں نے ۱۹۔ مارچ کو زخمی ہونے والے خاکساروں کی میوہسپتال میں جا کر عیادت کی اور اسی روز چار بجے شام انہوں نے منٹو پارک میں پرچم کشائی کی رسم ادا فرمائی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا کھلا اجلاس ۲۲۔ مارچ کی سہ پہر کو شروع ہوا۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے بھی خطاب فرمایا۔ ۲۲۔ مارچ ہی کو بقول عبداللہ ملک رات کے دس بجے اور بقول عاشق حسین بٹالوی آٹھ بجے کے قریب مسلم لیگ کی مجلس مضامین (Subject Committee) کا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کی کارروائی بیان کرتے ہوئے بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

"اسی شام آٹھ بجے کے قریب مجلس انتخاب مضامین (سبجکٹس کمیٹی) کا جلسہ ہوا۔ خاکساروں کے حادثے (۱۹۔ مارچ ۱۹۴۰ء) کے متعلق غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لیے اکثر ارکان نے مختلف قراردادیں پیش کرنے کا نوٹس دے رکھا تھا۔ خیال تھا کہ اس نشست میں ان قراردادوں پر بحث ہو گی لیکن قائداعظم نے شروع ہی میں کہہ دیا کہ خاکساروں کے مسئلہ کو سردست ملتوی کیا جاتا ہے۔ پھر نواب زادہ لیاقت علی خاں نے قرارداد پاکستان پیش کی جس کا اہم جزو یہ تھا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصے میں ان خطوں کو جو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے متصل و ملحق ہیں اور جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' علاقائی رد و بدل کے ساتھ باقی ہندوستان سے الگ کر کے مقتدر و خود مختار مملکت میں تبدیل کر دیا جائے۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ اسی وقت مناسب بحث کے بعد یہ قرارداد منظور کر لی جائے۔ لیکن حاضرین کی رائے

تھی کہ قرارداد چونکہ بے حد اہم ہے اس لیے انہیں اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے کا مزید موقع دیا جائے۔ اس کے علاوہ قرارداد کا متن انگریزی میں تھا اور بعض لوگ انگریزی نہیں جانتے تھے چنانچہ مولانا ظفر علی خاں نے وہیں قرارداد کا اردو میں ترجمہ کیا اور مفصل بحث دوسرے دن پر ملتوی کر دی گئی۔" (۶۰)

بٹالوی صاحب نے اپنے ایک اور مضمون بعنوان 'مولانا ظفر علی خاں' میں واقعہ مندرجہ بالا کی مزید تفصیلات فراہم کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء (یہ سہو کتابت ہے۔ اصل تاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء ہے۔ جعفر) کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی سبجکٹس کمیٹی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں نے قرارداد پاکستان پیش کی تو قرارداد کا مسودہ انگریزی میں تھا۔ حاضرین میں سے بعض انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اردو ترجمے کے لیے اصرار کیا تو نواب زادہ مرحوم نے یہ کہہ کر کاغذ مولانا ظفر علی خاں کے حوالے کر دیا کہ آپ سے بہتر ترجمہ کون کر سکے گا۔ مولانا نے وہیں بیٹھے بیٹھے نہایت خوبصورت اور نستعلیق اردو میں ترجمہ کیا۔ قرارداد کے متن میں لفظ زون بار بار آتا ہے۔ مولانا نے اس کا ترجمہ منطقہ کیا۔ اجلاس ختم ہوا تو میں نے مولانا کو مبارک باد پیش کی کہ ترجمہ تو ہم ایسے اناڑی بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ صحیح جغرافیائی اصطلاح 'منطقہ' آپ ہی کو سوجھ سکتی ہے۔" (۶۱)

قرارداد کے اردو میں ترجمہ ہونے کے واقعہ کو فقیر وحید الدین صاحب نے 'انجمن' میں اور ان کے تتبع میں جناب نظیر حسنین زیدی نے اپنی کتاب "مولانا ظفر علی خاں احوال و آثار" (ص ۲۱۵) میں ۲۳ مارچ کی کارروائیوں میں شمار کیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان میں اگرچہ قرارداد کے ترجمہ کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن سبجکٹس کمیٹی میں مجوزہ قرارداد پاکستان پر غور کرنے کو ۲۲ مارچ (بروز جمعہ) کا واقعہ قرار دیا گیا ہے جو تطویل کے باعث (جیسا کہ بٹالوی صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے بھی ظاہر ہے) ہفتہ ۲۳ مارچ کے دو بجے سہ پہر تک جاری رہا(۶۲) فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد سوم کے مطابق مسلم لیگ کا دوسرا کھلا اجلاس ۲۳ مارچ کو تین بجے سہ پہر شروع ہوا۔ بقول جناب عبداللہ ملک:

"پہلے یہ طے پایا تھا کہ مولوی ظفر علی خاں مرحوم کھلے اجلاس میں اس تحریک کو پیش کریں گے لیکن دوسرے دن پروگرام میں تبدیلی کر دی گئی اور اس تحریک کو پیش کرنے کا سرا بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کے سر بندھا۔" (۶۳)

قرارداد پاکستان ۲۳ مارچ کو پیش ہوئی اور دو دن کی پرجوش تقریروں اور تائیدوں کے بعد ۲۴ مارچ کو منظور ہوئی۔ قرارداد کی تائید و حمایت میں تقریر کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔ جناب عاشق حسین بٹالوی رقمطراز ہیں:

"مولوی فضل الحق (شیر بنگال) کی تائید میں چوہدری خلیق الزماں نے خلاف معمول بہت پرجوش اور جذبات سے مرصع تقریر کی۔ قائداعظم کا قاعدہ تھا کہ لیگ کے سالانہ اجلاس پر اہم ترین تجویز کی حمایت میں ہندوستان کے ہر صوبے سے ایک ایک نمائندے کی تقریر کرایا کرتے تھے۔ اس قرارداد کی حمایت کرنے والوں میں بمبئی سے ابراہیم اسمٰعیل چندریگر' سی پی سے عبدالروف شاہ' مدراس سے' عبدالحمید خاں سرحد سے اورنگ زیب خاں' آسام سے عبدالمتین چودھری' بہار سے محمد عاشق وارثی اور پنجاب سے مولانا ظفر علی خاں شامل تھے۔"(۶۴) •

اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا:

"آج میں یوں محسوس کرتا ہوں گویا میں آزاد ہندوستان سے بول رہا ہوں۔ میں کافی عرصہ تک ہندو مسلم اتحاد کا مبلغ اور کئی سالوں تک کانگرس کا رکن رہا ہوں۔ اس تمام عرصہ میں میں نے دیکھا کہ کانگرس کا اضطراب حصول آزادی کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ دراصل اقلیتوں کو دبانا چاہتی تھی۔ کانگرس نے اپنی موجودہ بلند حیثیت اس تعاون کی بنا پر حاصل کی ہے جو اسے ماضی میں مسلمانوں کی طرف سے ملا اور اب کانگرس مسلمانوں سے سرد مہری برت رہی ہے۔ ہم اور ہمارے مکتب فکر کے دیگر حضرات مسلم لیگ کو اس لیے ہدف تنقید بناتے رہے ہیں کہ وہ کسی تعمیری پروگرام کو اختیار نہیں کر رہی تھی۔ کانگرس کی آئین ساز اسمبلی کی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ہم کسی ایسے آئین کو قبول نہیں کریں گے جو مسلمانان ہند کی پسندیدگی اور رضامندی کا حامل نہیں ہو گا۔"(۶۵)

اورینٹ پریس کے نمائندہ کو انٹرویو

جناب علی اکبر گھمن اپنے مقالہ بعنوان "مولانا ظفر علی خاں کے حالات زندگی اور کارنامے" میں روزنامہ زمیندار بابت ۲۹۔ مارچ ۱۹۴۰ء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

قرارداد پاکستان کے اجلاس کے بعد آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں دیگر نمائندگان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔ اجلاس کے

بعد مولانا نے اورینٹ پریس کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ "یہ کہنا حقیقت سے اغماض کرنا ہے کہ قائداعظم ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کے حق میں نہیں اور موجودہ آئنی تعطل کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ جونہی قائداعظم کو پتہ چلا کہ گاندھی جی نے حصول پاکستان کو مان لیا ہے تو گاندھی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اس ملاقات کے نتائج مسٹر جناح نے پہلے ہی بتائے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم متحد ہو جانا چاہئے اور یہ اتحاد وقت کی اشد ترین ضرورت ہے۔ مجھے کامل بھروسہ ہے کہ دونوں لیڈروں کی ملاقات نتیجہ کے طور پر دونوں قوموں کو رشتہ اتحاد میں منسلک کرے گی۔"(۶۶)

وردھا کی سیاست

۲۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو مولانا ظفر علی خاں نے "وردھا کی سیاست" کے عنوان سے دہلی میں جو نظم کہی وہ کانگرس کی مکارانہ سیاست کا پردہ بخوبی چاک کر رہی ہے۔ آپ نے فرمایا

حکومت مرکزی ہو اور نظام اس کا ہو جمہوری
مدار اس کا ہو دونوں پر قوام اس کا ہو دستوری
نشاں بردار ہوں گاندھی و نہرو و پٹیل اس کے
مسلماں ووٹ جن کے ہیں بہت کم ہوں دبیل اس کے
حفاظت اس حکومت کی کرے انگریز کا لشکر
اور اس لشکر کے بوتے پر ہو اونچا ہندوؤں کا سر
یہ وہ حکمت ہے مضمر جس میں وردھا کی سیاست ہے
ٹپکتی جس کے ہر نکتہ سے گاندھی کی فراست ہے
مگر ہندوستاں کا عقدہ یوں حل ہو نہیں سکتا
مسلمانوں کا ہاتھ اس داؤں سے شل ہو نہیں سکتا
کوئی جا کر یہ کہہ دے کانگرس کے رہ نماؤں سے
کہ مشکل ہے الجھنا رب اکبر کی قضاؤں سے
اگر آزاد ہونا ہے خدا کا آسرا ڈھونڈھو
ہمارے بازوئے تیغ آزما کا آسرا ڈھونڈھو(۶۷)

اکال گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) میں تقریر

چودھری نظام الدین صاحب چوہان سیکرٹری مسلم لیگ اکال گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) نے درج ذیل خبر ۲۲- مئی ۱۹۴۰ء کے زمیندار میں شائع کرائی "۱۳- مئی کو ٹھیک ۱۲ (بارہ) بجے دن کی گاڑی پر حضرت قبلہ مولانا ظفر علی خاں ورود فرما ہوئے..... اس کے بعد ۲/۱-۸ (ساڑھے آٹھ) بجے رات کے دوسرا جلسہ شروع ہوا جس میں حضرت قبلہ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے پاکستانی سکیم پر کافی روشنی ڈالی جس سے حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے اور پاکستانی سکیم سے اتفاق ظاہر کیا-"(۶۸)

انگریزوں کو فوجی بھرتی اور مالی امداد

دوسری جنگ عظیم میں کانگرس انگریزوں کو فوجی بھرتی اور مالی مدد دینے کے حق میں نہ تھی جب کہ مسلم لیگ کا موقف اس کے برعکس تھا اور وہ مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو منوانے اور ان کے لیے سیاسی مراعات کے حصول کے لیے حکومت سے تعاون کرنے میں مصلحت دیکھتی تھی- اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں بھی مسلم لیگ کے ہمنوا تھے- چنانچہ ۱۱- نومبر ۱۹۴۰ء کو جب مرکزی قانون ساز اسمبلی میں فنانس بل پر بحث ہو رہی تھی تو ستیا مورتی نے صاف کہا کہ ہم تو گورنمنٹ کی مخالفت کرنے اور اس کو سبق سکھانے آئے ہیں- اس پر مولانا ظفر علی خاں نے کہا کہ ہم کو تو دوہری قوت کی فوج رکھنی ہے اول تو گورنمنٹ کی مدد کو اور دوسری ہم والنٹیر فوج رکھیں گے جو مسلم ممالک کی' خاص کر ترکی کی مدد کے واسطے ضروری ہو گی کہ جرمنی مسلم ممالک کو ہڑپ نہ کر جائے-

بعد میں جناب محمد یامین خاں نے مولانا کی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "میں اگرچہ فوجی ایکسپرٹ نہیں ہوں لیکن یہ آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ ان ممالک کی کافی امداد کی جائے جن پر ہندوستان کے تحفظ کا دارو مدار ہے کہ کہیں جرمنی ان کو روند کر ہندوستان کا رخ نہ کرے اتفاق سے یہ سب ممالک مسلمانوں کے ہیں اور ہم ان کی امداد کرنی چاہتے ہیں ہم کو ان سے اس لیے زیادہ ہمدردی ہے کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں ان کو ترقی کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا- مضبوط اور طاقت ور ٹرکی برٹش قوم کا بڑا مددگار ثابت ہو گا- مولانا ظفر علی خاں کی کل کی اسپیچ کو مسٹر کرشنما چاری نے بغیر سمجھے الٹے معنی دے دیئے- ظفر علی خاں کا مطلب یہ تھا کہ ان ملکوں میں جو جرمنی کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے موثر طریقہ سے روک سکتا ہے وہ ٹرکی ہے اس لیے ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم بڑی فوج بھرتی کر کے ٹرکی کی امداد کے واسطے

بھیجیں تاکہ ہمارے ملک کی حفاظت ہو سکے۔"(۶۹)

جناح اور گاندھی

قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کے زمانے میں مولانا نے بارہا قائداعظم کے حق میں اور بشمول گاندھی ہندو رہنماؤں کے خلاف نظم و نثر میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ ۱۶۔ نومبر ۱۹۴۰ء کو آپ نے جرمنی اور روس کے گٹھ جور کا ذکر کرتے ہوئے گاندھی صاحب کو "نداف ہند" قرار دیا۔

ماسکو سے ہو رہا ہے رشتہ برلن کا قریب
طوق ہٹلر کا ہے اور گردن ہے مولوتاف کی
دب گئی چرخے کی چرخ چوں بموں کی گونج میں
جس سے بنیادیں لرز اٹھی ہیں کوہ قاف کی
اس میں جینا ہوں کہ ہوں راما سوامی مدلیار
کوئی بھی سنتا نہیں ہے ہند کے نداف کی

راما سوامی مدلیار، وزیر تجارت تھے۔

۳۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کی مرقومہ ایک نظم میں جناح اور گاندھی کا یوں تقابل کرتے ہیں۔

جینا کی صدا اور ہے گاندھی کی کتھا اور
بطحا کی فضا اور ہے وردھا کی ہوا اور
بیناً ہے وہ تلوار کا چرخہ کی یہ اولاد
ہے لطف جہاد اور اہنسا کا مزا اور
ملت کا تقاضا ہے کہ اے قائداعظم
اسلامیوں کی شان میں کچھ چاند لگا اور
گاندھی کے جھکانے کی جو ہے تجھ کو تمنا
اللہ کی دہلیز پہ گردن کو جھکا اور

لیکن با ایں ہمہ کبھی کبھار وہ ہندو مسلم اتحاد کا پرانا ترانہ بھی گنگنانے لگتے ہیں چنانچہ ۵۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کو انہوں نے لکھا:

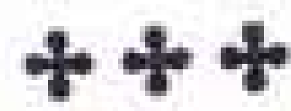
اگر جینا کا دل آ جائے گاندھی جی کی مٹھی میں
تو غیروں کی غلامی سے وطن آزاد ہو جائے

ادھر ہو شیخ کا کس بل ادھر شکتی برہمن کی
یہ دہرا زور مرگ دیو استبداد ہو جائے
عمل کا وقت ہے احباب جو کرنا ہے اب کر لیں
مبادا یہ قبالہ زائد المیعاد ہو جائے

بن کے رہے گا پاکستان

یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو مولانا نے نئے سال کے حوالے سے مختلف زمینوں میں خیال و فکر کے تازہ پھول کھلائے۔ یہ اشعار اب "نئے سال کی نئی پھلجھڑیاں" کے رنگیں عنوان سے "چمنستان" کی زینت ہیں۔ چند اشعار نذر قارئین ہیں۔

جا کے وزیرِ ہند سے پوچھو گائے ہے پہلے یا انسان
بوجھ سکیں گر وہ یہ بجھارت ہند کی مشکل ہو آسان
گاندھی و ساورکر ہوں کہ ایمری ہم سے الجھ کر لیں گے کیا
عزم ہمارا ٹل نہیں سکتا بن کے رہے گا پاکستان
ترکی و ایراں، شام و فلسطیں، مصر و حجاز و نجد و عراق
سب ہیں جو اک تسبیح کے دانے، ہے یہ پیمبرؐ کا فرمان



ہندو سبھا ٹھیست ہے اور کانگرس پچیت
دونوں کی نکتیاں ہیں مسلماں کی تاک میں
ڈر ہے اگر انہیں تو ہے جینا کے داؤں کا
ایسا نہ ہو کہ ان کو ملا دے وہ خاک میں

مولانا مدراس، بنگلور اور ناگپور میں

۱۹۴۱ء میں مولانا نے مدراس، ویلور بنگلور اور ناگپور وغیرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ حسن اتفاق سے جناب ماہر القادری کو اس سفر میں متعدد مقامات پر مولانا کی رفاقت کا شرف حاصل رہا اور انہوں نے اس رفاقت کی بعض حسین یادیں اپنے ایک مضمون میں محفوظ کر دی ہیں۔ آیئے ہم بھی اس مضمون کو جستہ جستہ دیکھتے چلیں "اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں اردو کانفرنس اور مشاعرہ تھا..... اسی ٹرین سے مولانا ظفر علی خاں مرحوم سفر کر رہے تھے۔ اردو

کانفرنس کی صدارت کے لیے ان کو تکلیف دی گئی تھی.... بنگلور کے بعد ناگ پور میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ نیلی پوشوں کے دستہ کی سلامی کا منظر' وہ پنڈال میں مولانا کی صدارتی تقریر۔ ایک ایک بات حافظہ میں آج تک محفوظ ہے مسلم لیگ کا اجلاس ختم ہونے کے بعد گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے مولانا لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے جانے کے کوئی دو گھنٹہ کے بعد یہ وحشت اثر خبر ملی کہ گرانڈ ایکسپریس ناگپور سے کچھ دور پہنچ کر الٹ گئی۔ میں ناگپور میں نواب محی الدین علی خاں مرحوم کے یہاں مہمان تھا۔ اس خبر کے سنتے ہی وہ اپنی موٹر کار میں مجھے لے کر دوڑے۔ راستہ میں نواب صدیق علی خاں اور مسلم لیگ کے دوسرے کارکن بھی ساتھ ہو لیے۔ ناگپور کی سڑک پر موٹروں' تانگوں اور سائیکلوں کا تانتا بندھا تھا۔ ایمبولینس گاڑیاں تیزی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ ہم آدھ گھنٹہ میں موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ عجب منظر دیکھا۔ ریل کی پٹڑی جگہ جگہ سے بل کھا کر مڑ گئی تھی۔ پوری ٹرین ایک طرف کو جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ حادثہ انتہائی ہولناک تھا۔ ٹرین کو الٹ جانا چاہئے تھا۔ مگر ساری بلا انجن سے جڑے ہوئے آموں کے ڈبہ پر آ کر رہ گئی۔ جانی نقصان ذرا سا بھی نہیں ہوا۔ بس ایک مسافر کے پہونچے میں بہت ہی معمولی چوٹ آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی اس شان کو بھی دکھا دیا کہ ہلاکت و تباہی کے بالکل کنارے پر پہنچا کر وہ بچا بھی سکتا ہے۔ ان اللہ علی کل شی ءٍ قدیر۔ مولانا ظفر علی خاں اپنی نیلی قمیص پہنے' ہاتھ میں چھڑی لیے کھیت میں کھڑے تھے۔ ہم انہیں لے کر شہر آ گئے۔ دوسرے یا تیسرے دن کی گاڑی سے وہ لاہور روانہ ہوئے۔(۷۰)

زکوٰۃ کمیٹی کی ممبری

۲۶ اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس قائداعظم کے زیر صدارت اینگلو عربک کالج ہال دہلی میں منعقد ہوا جس میں متعدد قراردادیں پاس ہوئیں۔ ایک قرارداد میں طے پایا کہ چند اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو منظم طریقے سے زکوٰۃ' فطرانہ اور قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کے لیے اور ان کو شریعت کے مطابق مسلمانوں کے وسیع تر مفاد میں خرچ کرنے کے لیے ایک مفصل سکیم تیار کرے اور اسے مزید غور و خوض کے لیے جلد از جلد کونسل میں پیش کرے۔ اس بارہ رکنی کمیٹی میں مولانا ظفر علی خاں کا نام نامی بھی شامل تھا۔(۷۱)

راشٹریہ سیوک سنگھ

کانگریس نے 'ہندوستان خالی کرو' (Quit India) کی تحریک چلائی تو مسلم لیگ نے اس کا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس فیصلے پر صاد کیا۔ جناب اشرف عطا اس واقعہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

"۸۔ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ جس میں ہندوستان خالی کرو" کا نعرہ بلند کیا گیا اور گاندھی کو اختیار دیا گیا کہ وہ اس قرار داد کی عدم منظوری کی صورت میں عموی تحریک یعنی بغاوت شروع کر دیں۔ چنانچہ حکومت نے ۱۵۔ اگست کو تمام کانگرسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ کانگرسیوں نے ملک میں توڑ پھوڑ اور تخریبی کار روائیاں شروع کر دیں۔ قائداعظم نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ کانگرس کی یہ تحریک دراصل مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لیے چلائی گئی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے جو پرانے کانگرسی اور محب وطن لیڈر تھے' جن کی ساری عمر برطانوی سامراج کے خلاف لڑتے گزری تھی' کانگرس کے خطرناک عزائم کو 'زمیندار' کے کالموں اور پبلک جلسوں میں تقریریں کر کے مسلمانوں پر واضح کیا۔ ہندو اخبارات نے مولانا ظفر علی خاں کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر لیا ہندو اخبارات نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف خوب زہر اگلنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ خفیہ طور پر راشٹریہ سیوک سنگھ ایسی فوجی جماعت کی تنظیم زور شور سے شروع کر دی۔ مولانا ظفر علی خاں نے 'زمیندار' میں ایک زبردست مقالہ لکھ کر مسلمانوں کو خبردار کیا کہ ہندو راشٹریہ سیوک سنگھ کی شکل میں ایک زبردست فوجی تنظیم قائم کر رہا ہے اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کل کو انگریز عنان اقتدار منتقل کر دے تو یہ تنظیم زبردستی قابض ہو جائے اور ہندو راج کے قیام کا اعلان کر دے اور اگر مسلمان سر اٹھائیں تو ان کی سرکوبی کی جائے۔ مولانا نے اس مقالہ میں یہ پیش گوئی بھی کی کہ ہندوستان سے انگریز کے بوریا بستر لپیٹتے ہی مسلمانوں کو مسلنے اور کچلنے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ والے' جنہیں سرکاری اسلحہ گوداموں سے اسلحہ پہنچ رہا ہے' طول و عرض ملک میں وسیع پیمانہ پر فسادات شروع کر دیں گے۔ چنانچہ مولانا کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی..... مولانا نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ آنے والے خونی انقلاب سے بے خبر نہ رہیں بلکہ انہیں بھی اپنی حفاظت کے لیے تمام انتظامات کو مکمل کرنا چاہئے تاکہ وقت آنے پر راشٹریہ سیوک سنگھ کے حملوں کا

کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے۔"(۷۲)

ہمارا موقف پاکستان ہے

انہی دنوں بنگال میں شدید قحط پڑا مگر حکومت نے امداد کے سلسلہ میں سرد مہری کا رویہ اختیار کیا۔ مرکزی اسمبلی میں ۱۵ ستمبر (۱۹۴۳ء) سے ۱۸ ستمبر تک ان واقعات پر مفصل بحث ہوئی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ حصول آزادی اور انتقال اقتدار کے ضمن میں ہم سے تعاون نہیں کر رہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے اور مسلم لیگ کے موقف کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ آزادی ہند کی راہ میں حائل اور ایک بڑے مسئلہ کے حل میں رکاوٹ ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں مسلم لیگ آزادی ہند کی اتنی ہی حامی ہے جتنی کانگرس یا مہاسبھا۔ مسلم لیگ نے کسی پارٹی کے ساتھ مذاکرات کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ اس نے تو بار بار یہ اعلان کیا ہے وہ برابری کی سطح پر تمام جماعتوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہے تاکہ نازی ازم اور فاشزم کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک بھر کے وسائل و قویٰ کو مجتمع کیا جا سکے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلم لیگ دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد کی کسی تجویز کی مخالف ہے.... میں کہتا ہوں کہ وہ وقت آنے والا ہے جب مسلم لیگ کو اپنے حقوق کی جنگ لڑنا ہو گی اور وہ جنگ یقیناً بہت خوفناک ہو گی۔ اگر آزاد ہندوستان کا مطلب اکثریت کی حکومت ہو تو مسلمان اس سے متفق نہیں ہوں گے۔ مسلمانوں کا موقف پاکستان ہے۔ میں اس ایوان سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسٹر ونسٹن چرچل کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ پاکستان ہمارا نصب العین ہے اور اگر اس سلسلے میں ہمیں انکار کیا گیا تو اپنے تحفظ کے لیے ہمیں مجبوراً لڑنا پڑے گا اور ہم سب کے خلاف لڑیں گے خواہ برطانوی ہوں خواہ ہندو۔ لیکن (فی الحال) مسلم لیگ نے کانگرس کے ساتھ مکالمت کا دروازہ کھلا رکھا ہوا ہے۔"(۷۳)

خاکساروں کے حق میں

خاکساروں پر سے پابندیاں اٹھائے جانے کے مطالبہ میں بھی مولانا ظفر علی خاں نے مسلم لیگی قائد کی حیثیت سے بھرپور کردار ادا کیا۔ انہوں نے خاکساروں کی حمایت میں موقع بہ موقع

اپنے اخبار 'زمیندار' میں بھی لکھا اور ۲۳ ستمبر ۱۹۴۲ء کو سنٹرل قانون ساز اسمبلی میں اس کے حق میں تقریر بھی فرمائی۔(۷۴)

کمیٹی برائے معاملات حج

۹۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس قائداعظم کی صدارت میں اینگلو عربیک کالج ہال دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی ایک قرارداد میں مولانا حسرت موہانی' مولانا ظفر علی خاں' جناب عبدالحمید صاحب قادری' حاجی نواب جمشید علی خاں اور جناب عبدالحمید صاحب (کنوینر) پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا جس کو گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے سمندر پار کے معاملات کے رکن سے ملاقات کر کے حج کے سلسلے میں ہونے والے ضروری انتظامات کا جائزہ لینا تھا تاکہ مسلمانوں میں احساس طمانیت پیدا ہو اور اس گفتگو کے نتائج سے صاحب صدر کو مطلع کرنا تھا۔(۷۵)

سردار شوکت حیات اور مسلم لیگ کے حق میں

۲۶۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کی رات کو سر سکندر حیات دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال کر گئے ان کی جگہ ملک خضر حیات (ولد سر عمر حیات) پنجاب کے وزیر اعظم بنے۔ سر سکندر حیات کے بیٹے سردار شوکت حیات کو ان کے والد کی وفات کے بعد وزارت میں لیا گیا لیکن کیونکہ سردار شوکت حیات مسلم لیگ کے فروغ و استحکام کے لیے سرگرمی سے کام کر رہے تھے اس لیے یونینسٹ پارٹی کے ہندو ارکان' ملک خضر حیات ٹوانہ اور گورنر پنجاب سر ہربرٹ گلینسی نے گٹھ جوڑ کر کے سردار شوکت حیات خاں کو ایک سکولز انسپکٹرس کے معاملہ کی آڑ لے کر وزارت سے الگ کر دیا جناب اشرف عطا اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

[گورنر پنجاب سرہربرٹ گلینسی نے پنجاب کے غیور' نڈر' جری اور جواں سال قائد سردار شوکت حیات خاں کا پارلیمانی مستقبل خراب کرنے کے لیے ایک اعلان شائع کیا جس میں سردار شوکت حیات خاں کو اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا قرار دیا گیا۔ گورنر پنجاب کے اس اعلان سے مسلمانان پنجاب میں ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا مولانا ظفر علی خاں نے سرہربرٹ گلینسی کے عنوان سے ایک زبردست مقالہ لکھا جس میں مسلم لیگ پر سرہربرٹ گلینسی کے حملہ کی شدید مذمت کی گئی اور ٹوانہ چھوٹو رام گٹھ جوڑ کے بخیے ادھیڑتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اس ناپاک گٹھ جوڑ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ 'زمیندار' نے ایک مقالہ میں لکھا:

"سرہربرٹ ایمرسن، چھوٹو رام، بلدیو سنگھ اور کانگرسیوں کے خفیہ گٹھ جوڑ اور ملی بھگت کا مقصد وحید اس کے ماسوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ کو کٹھ پتلی بنا کر مسلم لیگ کے جہاز کو تار پیڈو کریں اور برطانوی حکومت اور بیرونی دنیا پر یہ ظاہر کر سکیں کہ مسٹر جناح کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ پنجاب ان کے ساتھ ہے..... اب دیکھنا یہ ہے کہ زندہ دلان پنجاب جو شاندار سیاسی روایات کے مالک ہیں، اس سازش کو جس کا نشانہ سردار شوکت حیات خاں کو بنا کر مسلم لیگ کے وقار پر ضرب لگانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، خاموشی سے برداشت کر لیں گے یا پھر ہربرٹ ایمرسن کی اکڑی ہوئی گردن میں خم پیدا کرنے اور ٹوانوں، کانگرسیوں، اکالیوں اور یونینسٹوں کی ناپاک سازش کو ناکام بنانے کے لیے دلیرانہ اور بہادرانہ طریقہ سے جو ہمیشہ سے پنجابیوں کا طغرائے حیات رہا ہے، میدان میں اترتے ہیں" مولانا ظفر علی خاں نے جو بیماری کی وجہ سے اس تحریک میں عملی حصہ نہ لے سکے، نوجوانوں کو خضر شاہی کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کی۔(۷۶)]

ہماری منزل پاکستان ہے

سر محمد یامین خان نامہ اعمال میں لکھتے ہیں "۱۸۔ فروری (۱۹۴۳ء)... پنڈت نیل کنٹھ داس اڑیسہ کے ممبر نے ریزولیوشن پیش کیا کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو مرکز میں بھی نافذ کر دیا جائے جیسے کہ صوبہ جات میں اس کا نفاذ ہو چکا ہے۔"

اس ریزولیوشن کے پیش کرنے کا مقصد ہندوستان میں فیڈریشن کے قیام کی حمایت کرنا تھا جس کی مخالفت مسلم لیگ اور خود کانگرس بھی پہلے ہی کر چکی تھیں اس فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کرنا دراصل اکثریتی پارٹی کی حکومت کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ اس موقع پر سر یامین خاں، نواب زادہ لیاقت علی خاں مولانا ظفر علی خاں اور دیگر مسلم لیگی اصحاب نے کسی قسم کی فیڈریشن کے قیام کے خلاف اور قیامِ پاکستان کے حق میں تقریریں کیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا:

"ہم مسلمانوں کی منزل مقصود پاکستان ہے اور ہم ایک ایسے راستے پر چل رہے ہیں جس میں مراجعت نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مسائل کا حل پاکستان کا قیام ہی ہو گا لیکن ہندو اس کو تقسیم ہند اور دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔ پاکستان کا یہ نظریہ ہمارے دس کروڑ مسلمانوں کا ہے۔ پنجاب میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن یہاں بھی ان کے ساتھ دوسرے صوبوں کی اقلیتوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمان اکثریت کی حکومت ہونی چاہئے کیونکہ یہ مسلمانوں کا حق ہے

اور ہر شخص جانتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہندوؤں کے حقوق محفوظ ہیں لیکن مسلمان ستم ظریفی کا شکار ہیں جبکہ ہندو مہاسبھا من مانی کارروائی کر رہی ہے۔ ہندو انگریز کے جانے کے بعد اقتدار کا خواہش مند ہے۔ ہندوؤں کو یہ خیال چھوڑ دینا چاہئے اور پاکستان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے۔ ہم اپنے مفاد کے متعلق خود بہتر جانتے ہیں۔"(۷۷)

اس موقع پر بقول سر یامین خان' مولانا ظفر علی خاں نے نہایت لطف کی بات کہی کہ "اکثریت کی رائے سے حکومت کرنے کا خیال چھوڑ دو کیونکہ دو سو گدھے ایک آدمی کے برابر نہیں ہو سکتے۔"(۷۸)

ظاہر ہے مولانا کا مندرجہ بالا فقرہ حضرت علامہ اقبال کے درج ذیل شعر سے مستفاد ہے۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

سر یامین خان اطلاع دیتے ہیں کہ متذکرہ بالا قرارداد بغیر رائے شماری کے خارج ہو گئی۔

دہلی یونیورسٹی بل

دہلی یونیورسٹی بل مارچ ۱۹۴۳ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں پیش ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ کے حقوق تعلیم کی حفاظت کی جائے۔ اس بل پر بقول سر یامین خان مارچ ہی سے مسلم لیگ اور گورنمنٹ میں مسلسل مقابلہ ہو رہا تھا۔ آخر ۲۵۔ اگست کو مسٹر جان ٹائی سن سیکرٹری محکمہ تعلیم نے تحریک پیش کی کہ

"دہلی یونیورسٹی بل جس طرح ترمیم ہو گیا ہے' پاس کیا جائے۔ اپنی تقریر میں کہا کہ ہم نے مسلم لیگ کی اکثر ترمیمات منظور کر لیں اور ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ دہلی یونیورسٹی کے اکثر شعبہ جات میں مسلمانوں کی کمی ہے اس کو پورا کیا جائے اور مسلمان تعلیم دینے والوں میں اضافہ کیا جائے اور جو جو خرابیاں آئندہ معلوم ہوں گی ان کو رفع کیا جائے گا۔"

لیکن مسلم لیگ اس ترمیم شدہ بل سے مطمئن نہیں تھی اور ارکان مسلم لیگ اس سے زیادہ کے لیے مطالبہ کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کا نقطہ نظر سر محمد یامین خان کے علاوہ سر ضیاء الدین احمد' میر غلام بھیک نیرنگ' مسٹر غیاث الدین' مولانا ظفر علی خاں اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پیش کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا۔

"جب تک ہم (مسلمان اور ہندو) ایک دوسرے کے حقوق کا تحفظ کچھ اس طرح نہیں کریں گے' جس طرح اپنے اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں' اس وقت تک دونوں قوموں میں اتحاد قائم نہیں ہو سکتا لہٰذا ہمیں بھی دوسروں کی طرح اپنی قوم اور حقوق کا تحفظ چاہئے۔"(۷۹)

یہ بل پاس کر لیا گیا تھا۔

بنگال کے مصیبت زدگان کی امداد

سر یامین لکھتے ہیں

"۷۔ نومبر ۴۳ء۔ میرے یہاں نمبر ۱۸ ونڈسر پیلیس پر مسلم لیگ پارٹی کی چاء ہوئی اور پھر پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ یہ قرار پایا کہ پارٹی ایک ہزار روپے اپنے ممبروں میں جمع کر کے قائداعظم محمد علی جناح کو دے کہ وہ پارٹی کی طرف سے بنگال کے مصیبت زدگان کی امداد کے واسطے بھیجیں۔ پارٹی نے یہ بھی طے کیا کہ گورنمنٹ سے کہے کہ خوراک کی جو ملک میں خراب حالت ہے' اس پر غور کرنے کے واسطے کافی دن اسمبلی میں بحث کے واسطے مقرر کرے چونکہ بنگال اور دیگر مقامات پر خوراک کی حالت بہت نازک ہے اور حکومت ایک وائٹ پیپر جاری کرے۔ جو ممبر میرے علاوہ موجود تھے وہ یہ تھے نواب زادہ لیاقت علی خاں' ڈاکٹر سر ضیاء الدین' سر سید رضا علی' مولوی عبدالغنی' مسٹر اظہر علی' عبدالستار سیٹھ' نواب صدیق علی خاں' مسٹر یوسف ہارون' سید غلام بھیک نیرنگ' مولوی ظفر علی خاں' چودھری حاجی اسمٰعیل خان' چودھری محمد حسین' حافظ محمد عبداللہ کونسل آف اسٹیٹ ابھی شروع نہیں ہوئی اس لیے وہ ممبر شریک نہیں ہو سکے قائداعظم بھی ابھی دہلی نہیں آئے۔"(۸۰)

اجلاس قصور کی صدارت

لاہور ضلع مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس قصور منڈی میں ہوا جس کی دوسری نشست کی جو بعد نماز عشا منعقد ہوئی' صدارت مولانا ظفر علی خاں نے فرمائی۔ اس نشست میں نواب افتخار حسین والئی ممدوٹ اور سردار محمد حسین ایم ایل اے نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ کو مضبوط کریں۔ آخر میں مولانا ظفر علی خاں صدر جلسہ نے فرمایا کہ ہم نے محمد علی جناح کو اس لیے اپنا قائداعظم بنایا ہوا ہے کہ اس کو دنیا کا بڑے سے بڑا لالچ دے کر بھی کوئی خرید نہیں سکتا۔(۸۱)

۱۹۴۶ء کے انتخابات

متذکرہ بالا واقعات کے علاوہ بھی مولانا ظفر علی خاں نے ہر اس موقع پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا جب اس نے حسن و خیر کے لیے آواز اٹھائی ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مولانا ظفر علی خاں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لاہور کے ایک حلقہ سے مرکزی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار دوٹوں کی بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے مسلم لیگ کو ان انتخابات میں چشم کشا اور فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی۔ ان انتخابی معرکوں میں مولانا ظفر علی خاں نے دیگر اکابر کے دوش بدوش قابل رشک کردار ادا کیا۔ جناب اشرف عطا لکھتے ہیں:

"ان انتخابات میں مولانا ظفر علی خاں نے رات دن کانگرسیوں کے گڑھ صوبہ یوپی میں مسلم لیگ کے لیے کام کیا۔ آپ نے ایک ایک دن میں بیس بیس مقامات پر انتخابی تقریریں کیں اور کانگرسیوں کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے..... مسلم لیگ کی اس انتخابی کامیابی میں مولانا ظفر علی خاں کی تقریروں اور تحریروں کا بہت بڑا حصہ تھا۔"(۸۲)

اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے ایک ذاتی مشاہدہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے سلسلے میں جب انتخابی مہم زوروں پر تھی' میرے چند دوست لاہور سے کسی مسلم لیگی رہنما کو بلانے کے لیے آئے تاکہ بٹالہ شہر اور تحصیل میں تقریریں کرائی جائیں۔ کوئی لیڈر تیار نہ ہوتا تھا پیشہ ور خطیب تیار ہوتے تھے تو ان کے نرخ ان دنوں بہت چڑھے ہوئے تھے۔ میرے دوست مایوس ہو کر واپس لوٹنے لگے تو کسی نے مشورہ دیا۔ ذرا 'زمیندار' میں بھی چل کر دیکھیں۔ وہاں گئے تو مولانا ابھی دہلی سے واپس آئے ہی تھے بستر ابھی بند پڑا تھا۔ سفر کی تکان قدرتی بات تھی۔ تاہم دوستوں نے مولانا سے درخواست کی اور اپنی دن بھر کی حوصلہ شکنیوں کو اور اس علاقے میں مسلم لیگ کی پتلی حالت کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ مولانا اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور بٹالہ چلے آئے۔ پھر دو روز تک مسلسل سفر' ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں' دوسرے سے تیسرے اور پھر ہر جگہ تقریر۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مولانا نے صرف صبح کو ناشتے میں دو نیم برشت انڈے' دو توس اور دو پیالیاں چائے کی پی تھیں۔ سارا دن کچھ نہ کھایا۔ حتیٰ کہ رات کو دس گیارہ بجے ایک گاؤں میں چائے حقہ پیا اور تازہ دم ہو کر اشعار کی فرمائش بھی پوری کرنے لگے اور پھر

اگلے روز علی الصباح پانچ سات میل کی "تیز گام" سیر بھی کی۔"(۸۳)

بیماری

بڑھاپے میں اس جاں توڑ محنت نے مولانا کی صحت کو بہت نقصان پہنچایا۔ "۱۹۴۶ء کے وسط میں آپ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور تین ماہ تک بستر علالت پر دراز رہے۔ تپ محرقہ کے اس حملے سے ذرا افاقہ ہوا اور آپ ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ آپ پر دوبارہ فالج کا حملہ ہو گیا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کے بعد آپ کی صحت پھر سنبھل نہ سکی اور وہ شیر بیشہ حریت جس کی ذات ہنگاموں کو جنم دیتی تھی، جو سر سے پاؤں تک شعلہ تھا، خاموش راکھ کا ایک ڈھیر بن کر رہ گیا راکھ کے اس انبار میں چنگاریاں تو ضرور تھیں لیکن ان میں حرارت اور تپش نہیں رہی تھی۔ ان میں شعلہ بن کر بھڑکنے کی صلاحیت ناپید ہو چکی تھی۔"(۸۴)

ظفر علی خاں اور استحکام پاکستان

قیام پاکستان کے بعد بھی مولانا کے آثار قلم کا سراغ ملتا ہے اور ہم متعدد نظمیں ان کے نام سے شائع شدہ دیکھتے ہیں مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل اشعار مولانا نے قیام پاکستان کے سلسلے میں کہے۔

کسی کو امن و اماں کی فضا میں رہنا ہے
تو کس لیے نہیں لیتا وہ راہ پاکستان
ہزار بار بجالا خدائے پاک کا شکر
کہ اس نے بخشی ہے تجھ کو پناہ پاکستان
علیؓ کی قوت بازو عطا ہوئی ہے اسے
شکست کھا نہ سکے گی سپاہ پاکستان
عجب نہیں جو ہو تسخیر ایشیا سارا
کہ اٹھ رہی ہے ادھر بھی نگاہ پاکستان(۸۵)

ذیل کے اشعار شیخ کرامت اللہ (گجرات) نے تبرکات ظفر علی خاں کے طور پر بعنوان 'طلوع پاکستان'، ۶- مارچ ۱۹۵۸ء کے زمیندار میں شائع کرائے۔

گر چشم جہاں بیں ہے تو نیرنگ جہاں دیکھ
آفاق میں اللہ کی قدرت کے نشاں دیکھ

کس قطع سے دامان شب تار ہوا چاک
کس وضع سے خورشید ہوا جلوہ فشاں دیکھ
کس طرح ہری ہو گئیں سوکھی ہوئی شاخیں
رخصت ہوئی کیونکر چمنستاں سے خزاں دیکھ
پھر پاٹ میں پھیلاؤ وہی ہے جو کبھی تھا
توحید کے دریا کو کراں تابہ کراں دیکھ
پھر گرم ہے بازار رسولؐ عربی کا
اور جل کے ہوئی راکھ حریفوں کی دکاں دیکھ
جاروب کشانِ حرمِ مصطفوی کا
اللہ نے کس طرح کیا پلہ گراں دیکھ(۸۶)

لدھیانہ اور جگراؤں کے مسلمانوں کے مصائب ہجرت سن کر مولانا نے ۵- ستمبر ۱۹۴۷ء کو چند اشعار فی البدیہہ ارشاد فرمائے- دو شعر درج ذیل ہیں-

کل اس طرح مجھے اسلام نے تسلی دی
نہیں سمجھتے تم اللہ کے ارادوں کو
ملائکہ نے سنایا پیام پاکستان
پہنچنے والی ہے ملت دلی مرادوں کو(۸۷)

پاکستان کے پہلے جشن استقلال کے موقع پر 'زمیندار' نے ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو اپنے اداریہ میں لکھا:

"آج جشن استقلال منایا جا رہا ہے- یہ مظاہرہ ہماری صد و پنجاہ سالہ جدوجہد کا حاصل ہے- بے شمار قربانیوں کا نتیجہ ہے..... پاکستان کیا ہے؟ ستر لاکھ مسلمانوں کی خانہ بربادی کا پھل ہے- لاکھوں فرزندان توحید کی شہادت کا ثمرہ ہے اور جو مالی نقصان ہوا' اس کا تذکرہ ہم ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ جان اور عزت کے مقابلے میں مال کی کوئی حقیقت نہیں- جو قوم لاکھوں انسانوں کی جانیں پیش کر سکتی ہے' اس کے نزدیک مالی قربانی کیا چیز ہے؟ جب پاکستان ہمیں اتنی قربانیوں سے ملا ہے تو اس کے ایک ایک ذرے کی حفاظت کے لیے کٹ مرنا ہمارا فرض ہے"

(۸۸) معلوم ہوتا ہے یہ اداریہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے نہیں ہے ممکن ہے جناب اختر علی خاں یا ادارہ کے کسی اور رکن نے لکھا ہو- تاہم چونکہ یہ اداریہ حضرت مولانا کی زندگی میں لکھا گیا اور اخبار کی پالیسی ان کے خلاف ایسا نہیں ہو سکتی تھی اس لیے حضرت مولانا سے اس

اداریہ کی روح معنی کا انتساب بے محل نہ ہو گا۔ مکمل اداریہ ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد حضرت مولانا' پاکستان کے استحکام کی فکر میں تھے جناب ابو سعید انور نے لکھا:

"ایک دفعہ حاضر ہوا خاموش بیٹھے تھے۔ کسی صاحب نے کہا۔ یہ ابو سعید انور ہیں۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمانے لگے۔ بحمد اللہ پاکستان بن گیا۔ بھئی اس کو اچھا بناؤ۔ اب تو تم نوجوانوں پر ہے کہ اس کی شکل کیسی بناتے ہو مگر ابھی کشمیر کو حاصل کرنا باقی ہے۔"(۸۹)

پی این ای سی (پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس) کی پنجاب شاخ کے افتتاح کے موقع پر خطبہ صدارت دیتے ہوئے حضرت مولانا نے ۱۵۔ جنوری ۵۱ء کو اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ پاکستان ہر شعبہ حیات میں ترقی کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"پاکستان کی اسلامی مملکت میں ہماری قومی زبان اردو کے علاوہ انگریزی' گجراتی' بنگالی' سندھی' پشتو اور بعض دوسری زبانوں میں روزناموں' ہفتہ وار جریدوں' ماہناموں اور دوسرے موقت الیشوع رسالوں کا بھاری تعداد میں شائع ہونا اس حقیقت کبریٰ کی علامت اور دلیل ہے کہ ہمارا ملک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حیات اجتماعی کے ہر منغے میں ترقی و.... کی طرف گامزن ہے اور اس کے عوام دیدہ بیدار ہو کر اپنے کوائف اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لینے کے قابل بنتے چلے جا رہے ہیں۔"(۹۰)

۱۵۔ اگست ۱۹۵۲ء کے زمیندار' میں "جشن استقلالِ پاکستان" کے عنوان سے حضرت مولانا کے درج ذیل اشعار شائع ہوئے۔

عہد خزاں گزر گیا فصل بہار آ گئی
دوش صبا پہ بوئے گل ہو کے سوار آ گئی
نامیہ نے جگا دیا سبزہ کو خواب ناز سے
باغ میں کوکتی ہوئی قمری زار آ گئی
راہ رو حجاز کو ناقہ شوق مل گیا
گرم رووں کے ہاتھ میں اس کی مہار آ گئی
کشتی امت قویم جس کے نبیؐ ہیں ناخدا
سینہ بھنور کا چیر کر تابکنار آ گئی

ہم ہیں وہ رند لم یزل' جن کے لیے مئے الست
کل جو ملی تھی دے کے دام آج ادھار آ گئی

کشمیریات

باؤنڈری کمیشن کے اعلان سے قبل ہی ہندوؤں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مہاراجہ کشمیر کے ساتھ ساز باز کر کے کشمیر کو ہتھیانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مجاہدین کشمیر گوریلا جنگ کے ذریعے ڈوگرہ فوج کو شکستوں پر شکستیں دے رہے تھے مہاراجہ دارالحکومت سے بھاگ کر جموں میں پناہ گزین ہو چکا تھا۔ آزاد شدہ علاقے میں آزاد کشمیر حکومت قائم ہو چکی تھی اتنے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے سازش کر کے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایک اعلان کے ذریعے بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا سرکاری اعلان کر دیا۔ لیکن مقبوضہ کشمیر میں جنگ آزادی برابر جاری تھی اور کشمیر کی آزادی کے امکانات روشن تر ہو رہے تھے۔ سید نور احمد کے الفاظ میں "۱۹۴۸ء کے شروع میں پنڈت جی کی حکومت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے سامنے لے گئی۔ وہاں اس نے اس اعلان کی پابندی کا اقرار کر کے سلامتی کونسل اور پاکستان کے ساتھ استصواب رائے کے ایک پروگرام پر اتفاق کر لیا جس کے مطابق کیم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔" (۹۱) مولانا ظفر علی خاں اگرچہ ان دنوں صاحب فراش تھے اور بیماری نے انہیں مضمحل کر رکھا تھا تاہم پاکستان اور اس کے مسائل ان کی نظر سے اوجھل نہ تھے۔ چنانچہ کشمیر کے بارے میں بھی انہوں نے کئی بار اپنے حریت آموز خیالات کا اظہار کیا۔ ایک دو حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ اسی طرح ایک موقع پر آپ نے فرمایا۔

کفر کے سر پر عریاں ہو کر جب چمکی حق کی شمشیر
جان حزیں کے پڑ گئے لالے الٹی ہو گئی ہر تدبیر
کہہ دو نہرو سے کہ الجھنا ہم سے تمہارا ہے بے سود
ٹل نہیں سکتا عزم ہمارا لے کے رہیں گے ہم کشمیر (۹۲)

۲۵ جولائی ۱۹۵۱ء کو آپ نے قیام مری کے دوران میں ارشاد فرمایا (ان دنوں آپ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے مری میں مقیم تھے۔)

برہمنوں سے جا کے یہ کہہ دو لے کے رہیں گے ہم کشمیر
ٹل نہ سکے گا عزم ہمارا ہے یہ مسلماں کی پہچان

دی ہے خدا نے ہم کو وہ دولت شرع نبیؐ ہے جس کی اساس
زندہ رہیں گے تا بہ ابد ہم اور ہمارا پاکستان
پاکستانیوں سے ٹکرانا موت کے منہ میں جانا ہے
دیکھ کے جن کو ہو جاتے ہیں بھارتیوں کے خطا اوسان(۹۳)

مری ہی ہیں ۲۔ اگست ۱۹۵۱ء کو آپ نے جو اشعار کہے وہ "پاکستانی سپاہی کا نعرہ" کے عنوان سے 'بہارستان' میں شامل ہیں۔ چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

آ پہنچی وہ ساعت جسے مانگا تھا خدا سے
ہوتا ہے اثر آج ہم آغوش دعا سے
تھی ایک زمانے سے تمنا یہ ہماری
نسبت ہو میسر ہمیں قومی شہدا سے
عاشق کو ہوا کرتا ہے معشوق سے جو عشق
وہ عشق سپاہی کو ہے میدان دغا سے(۹۴)

۱۴۔ اگست ۱۹۵۱ء کو آپ نے مری میں یہ اشعار کہے یہ اشعار بہ عنوان 'ابلیس کا ترانہ' بہارستان میں شامل ہیں(۹۵)

ڈالا کسی نے ڈاکہ مارا کسی نے چھاپا
رٹتے ہیں اس سبق کو جرنیل کیری آپا
روتی ہے تجھ کو بھارت کشمیر کی یتیمی
اور تجھ کو پیٹتا ہے پنجاب کا رنڈاپا
انصاف اور ایماں ہم کو نظر نہ آئے
مشرق کو ہم نے چھانا مغرب کو ہم نے ماپا
گاتے ہیں اس کو نہرو ٹنڈن کے ساتھ مل کر
پنچم کی لے میں جو راگ ابلیس نے الاپا

کیری آپا' جیسا کہ بہارستان کے نسخہ کارواں کے مرتب جناب نظیر لودھیانوی نے وضاحت کی ہے' بھارت کے سابق کمانڈر ان چیف تھے۔ ۱۳۔ اگست ۱۹۵۲ء کے زمیندار میں حضرت مولانا کے درج ذیل اشعار اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے کہ یہ اشعار مظفر نگر (کشمیر) میں کہے گئے۔

اگر منظور ہے کشمیر کی گتھی کا سلجھانا
نہ ہونے دو جدا کشمیر سے پیوند جموں کا

الٹ دو ڈوگروں کے ظلم پرور راج کا تختہ
اور اس میں حصہ لے بڑھ چڑھ کے ہر فرزند جموں کا

متذکرہ بالا شواہد و حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا ظفر علی خاں مجاہدین تحریک آزادی اور معماران پاکستان کے سابقون الاولون میں سے تھے۔ وہ ان برگزیدہ اکابر کی صف اول کے رکن رکین ہیں جنہوں نے پاکستان کے اس خواب کو جو حضرت علامہ اقبال نے دیکھا تھا نہایت ایثار و اخلاص اور جرات و استقامت کے ساتھ ایک حسین اور جاں نواز تعبیر سے ہمکنار کیا۔ اس کے لیے ملت اسلامیہ بالعموم اور مسلمانان پاک و ہند بالخصوص ہمیشہ ان کے زیر بار احسان رہیں گے۔ متعدد اکابر پاکستان نے حضرت مولانا کی ان خدمات کا اعتراف و استحسان کیا ہے۔ یہاں خوف طوالت کے پیش نظر صرف چار حضرات کی آرا پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

قائداعظمؒ

i- جناب قائداعظم نے کیم مئی ۱۹۳۶ء کو شاہی مسجد لاہور کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاں جیسے دوچار آدمی دے دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں پھر مسلمانوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔"(۹۶)

ii- ۲۹- ستمبر ۱۹۴۳ء کو جناب قائداعظم نے پنجاب کے مسلم طلبہ کے نام اپنے ایک پیغام میں فرمایا:

"میں خوش ہوں کہ آپ کو پنجاب کے زعمائے کرام مثلاً ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، ملک برکت علی صاحب اور نواب سر محمد شاہ نواز ممدوٹ کی طرف سے کامل تعاون اور حمایت حاصل ہے۔ میں آپ سب کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔"(۹۷)

حسین شہید سہروردی (سابق وزیر اعظم پاکستان)

"مولانا ظفر علی خاں نے برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی آزادی کے لیے جو جدوجہد کی ہے اس کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی"(۹۸)

مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا

"امید ہے کہ مرور ایام کے ساتھ ساتھ حق و انصاف کا احساس برتر و وسیع تر ہوتا چلا جائے گا اور آخر کار وہ دن بھی آ جائے گا جب اس برعظیم کی آئندہ نسلیں اپنی آزادی کی کہانی پھر سے پڑھیں گی اور اس کے اوراق میں انہیں ظفر علی خاں کا نام سب ناموں سے زندہ و پائندہ اور تابندہ و درخشندہ نظر آئے گا۔"(۹۹)

ابو سعید انور (سیکرٹری مجلس اتحاد ملت)

"یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جدوجہد آزادی اور سیاسی بیداری میں مولانا مرحوم کا نام ہمارے قائدین میں سر فہرست ہے..... سیاست میں ان کا نام گاندھی آں جہانی سے پہلے روشناس ہو چکا تھا اور پھر اسلامیان ہند کی تحریک نشاۃ ثانیہ میں تو ان کا نام بے حد اجاگر ہوا۔ قائداعظم کی دعوت اتحاد اور تنظیم مسلم لیگ میں مولانا نے وزن دیکھا اور پھر مسلم لیگ کے احیا اور اسے عوامی جماعت بنانے میں جو گراں قدر خدمات مولانا نے انجام دیں وہ تاریخ پاکستان کا ایک زریں ورق ہے۔"(۱۰۰)

ایک گزارش

معروف ادیب و شاعر اور مکتبہ کارواں لاہور کے مالک جناب حمید جالندھری کا کہنا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کے دور آخر کی بیشتر منظومات دراصل جناب خدا بخش اظہر امرتسری کی تخلیق کردہ ہیں اور یہ بات خود جناب اظہر نے حمید صاحب کو بتائی تھی۔ ممکن ہے جناب اظہر امرتسری کے اس دعوے میں کچھ نہ کچھ صداقت ہو۔ ایسی ہی ایک اور روایت ہمیں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے بھی ملتی ہے۔ وہ مولانا ظفر علی خاں کے ایک مضمون بعنوان "عہد حاضر اور اردو" کا ذکر کرتے ہیں جو ۲۶۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو رات کے آٹھ بجے پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "راقم کے پاس اس مضمون کا اصل مسودہ محفوظ ہے۔ یہ مضمون 'زمیندار' کے پیڈ پر لکھا ہوا ہے۔ غالباً ظفر علی خاں نے یہ مضمون لکھوایا ہے (معلوم ہوا کہ اظہر امرتسری نے اسے قلم بند کیا ہے) دو تین جگہ اصلاح بھی کی گئی ہے جو شاید مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ہے"(۱۰۱) ڈاکٹر صاحب کے اس بیان میں "غالباً" اور "شاید" کے الفاظ اس امر میں خاصے حارج ہو رہے ہیں کہ متذکرہ بالا مضمون کا انتساب مکمل اور یقینی طور پر مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے کیا جائے۔ بایں ہمہ' ہماری رائے میں یہ مضمون مولانا کا ہے اور اسکا انتساب کسی

اور سے نہیں ہو سکتا۔ مضمون کی تسوید کی جو بھی صورت ہو' یہ مضمون بہرحال مولانا ہی کے زیر فرمان و ہدایت لکھا گیا اور انہوں نے اسے اپنے ہی مضمون کے طور پر پنجاب یونیورسٹی کی اردو کانفرنس میں پڑھا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مضمون ان کا نہیں بلکہ کسی اور کا ہے؟

تحریر و انشا کے جہان میں یہ مسلمہ اصول ہے کہ تحریر اسی کی شمار ہوتی ہے جس کے دستخطوں سے وہ جاری کی جاتی ہے۔ بڑے بڑے سربراہان مملکت کی تقریریں اور بیانات عموماً ان کے سیکرٹری صاحبان لکھتے ہیں لیکن ان تقریروں اور بیانوں کا انتساب متعلقہ سربراہان مملکت ہی سے ہوتا ہے ان کے سیکرٹریوں سے نہیں۔ دنیائے ادب میں بھی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بڑے لکھنے والوں نے اپنے شاگردوں' عزیزوں یا علمی معاونوں سے ابتدائی نوعیت کا کام کرایا اور پھر اس پر نظرثانی کر کے اسے مکمل کیا اور اپنے نام سے شائع کرایا۔ جناب حمید جالندھری کی روایت کو اس تناظر میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی آخری اور طویل علالت کے زمانے میں شاید بعض نظمیں اظہر صاحب نے حضرت مولانا کے زیر ہدایت یا جناب اختر علی خاں وغیرہ کی فرمائش سے کہی ہوں یا مولانا کی بعض نامکمل نظموں کو مکمل کر دیا ہو یا ان کی بعض نظموں پر کوئی مشورہ دیا ہو' لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کلام بھی حضرت مولانا کی تائید و اجازت ہی سے اخبار میں حضرت مولانا کے نام سے شائع ہوتا ہو گا' اس لیے کم از کم فکری سطح پر ایسے کلام کے خطا و صواب کا انتساب بھی حضرت مولانا ہی سے ہونا چاہئے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ لطیف احمد شروانی ایم۔اے حرف اقبال۔ نومبر ۱۹۴۵ء ص ۳۰

۲۔ محمد جہانگیر عالم (مترجم) مکاتیب اقبال بنام قائداعظم۔ جناب قائداعظم کے دیباچہ کا اصل انگریزی متن جناب بشیر احمد ڈار کی مرتب کردہ کتاب لیٹرز آف اقبال میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ تحسین فراقی' ڈاکٹر۔ مضمون۔ مشمولہ سہ ماہی سیارہ نمبر ۳۴۔ بابت فروری ۱۹۹۴ء ص ۴۰۸

۴۔ رفیع الدین ہاشمی' ڈاکٹر۔ مضمون مشمولہ اقبال ریویو بابت جنوری ۱۹۸۳ء

۵۔ اشرف عطا۔ مولانا ظفر علی خاں ص ۱۲۶۔ ۱۲۷

۶۔ شریف الدین پیر زادہ' سید (مرتب) فاؤنڈیشنز آف پاکستان۔ حصہ اول نیشنل پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ۔ کراچی ص ۱۰

۷۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان۔ حصہ اول ص ۳۵۵

۸۔ ایضاً ص ۳۴۳ ۔ ۳۴۴

۹- ایضاً ص ۳۵۳ تا ۳۵۵

۱۰- ایضاً ص ۳۸۳ - ۳۸۴

۱۱- فاؤنڈیشنز آف پاکستان- حصہ دوم ص ۲۷- ۲۸

۱۲- ایضاً ص ۲۸

۱۳- ایضاً ص ۱۱۴ تا ۱۲۵

۱۴- ایضاً ص ۱۲۵- ۱۲۶

۱۵- زمیندار- بابت ۱۴- نومبر ۱۹۲۸ء

۱۶- فاؤنڈیشنز آف پاکستان حصہ دوم ص ۱۴۵

۱۷- ایضاً ص ۱۴۷

۱۸- نسیم عنایت اللہ سوہدروی- ظفر علی خاں اور ان کا عہد ص ۴۷۳- افسوس ہے سوہدروی صاحب نے قائداعظم کی تاریخ تقریر درست درج نہیں کی قائداعظم نے شاہی مسجد میں کیم مئی ۱۹۳۶ء کو خطاب فرمایا تھا-

۱۹- بشیر احمد ڈار- (مرتب) لیٹرز آف اقبال- اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۸ء ص ۲۳۹- ۲۴۰

۲۰- "ایکس شاعر" حضرت علامہ اقبال کا خفیہ قلمی نام تھا- جناب م- ش مرحوم نے اس بات کا ذکر متعدد احباب مثلاً احمد بشیر' میاں عبدالرشید' اور کلیم اختر صاحبان سے بھی کیا اور تحریری طور پر بھی یہ شہادت دی چنانچہ اپنے ایک مضمون بعنوان "اقبال- چند یادیں" مشمولہ اوراق گم گشتہ (مرتبہ رحیم بخش شاہین) میں وہ فرماتے ہیں کہ "اخباروں میں روزنامہ احسان' اور اخبار نویسوں میں مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس دور میں موخر الذکر کی وساطت سے مقدم الذکر میں حضرت علامہ کا سیاسی کلام "ایکس شاعر" کے قلمی نام سے شائع ہوا کرتا تھا-" ڈاکٹر صابر کلوروی نے اپنے ایک مضمون بعنوان "اقبال کا غیر مدون کلام- ایک نئی دریافت" مطبوعہ سہ ماہی 'ادبیات' اسلام آباد بابت اپریل تا جون ۱۹۸۸ء میں متعدد حوالوں اور دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ 'ایکس شاعر' حضرت علامہ اقبال ہی کا قلمی نام تھا- کلوروی صاحب نے 'ایکس شاعر' کی ان بارہ نظموں کو جو روزنامہ 'احسان' لاہور میں شائع ہوئیں' ضروری تحقیق اور مفید حواشی کے ساتھ اپنے مضمون میں پیش کیا ہے- ان سے پہلے اس سلسلہ منظومات کی تین نظمیں (جو ڈاکٹر صابر کلوروی کے مضمون میں بھی درج ہیں) جناب کلیم اختر اپنے ایک مسلسل مضمون بعنوان "یاد ایام--- دوسرا رخ" کی پانچویں قسط مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۰- اپریل ۱۹۸۴ء میں شائع کرا چکے تھے- افسوس ہے ان نظموں کے متذکرہ بالا دونوں متون میں کتابت وغیرہ کی متعدد غلطیاں راہ پا گئی ہیں- راقم نے تحقیق و قیاس کی مدد سے صحیح متن پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے-

۲۱- بڑے بول پنجابی اسم صفت "بڑبولا" کی ایک شکل ہے بمعنی بڑا بول بولنے والا یا بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والا-

۲۲- جناب ڈاکٹر صابر کلوروی نے اس پر بلا حوالہ یہ حاشیہ دیا ہے
"سر فضل حسین نے ظفر علی خاں کو یہ پیغام بھیجا تھا
If you want Shaheed Ganj. Come to me."
۲۳- یہ شعر شیخ سعدی شیرازی کا ہے اور بوستاں' کے دیباچہ میں آیا ہے۔
۲۴- ئی = چائے۔ سر فضل حسین بٹالے کے رہنے والے تھے۔ یہ اشعار بقول جناب کلیم اختر روزنامہ احسان لاہور بابت ۲۲- مئی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے تھے۔
۲۵- بشیر الدین محمود قادیانی
۲۶- صابر کلوروی- مضمون مشمولہ سہ ماہی ادبیات' اسلام آباد جلد ا- شمارہ ۴- ص ۱۱۹- ۱۲۰ نیز روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۰- اپریل ۱۹۸۴ء
۲۷- مولانا ظفر علی خاں کے درج ذیل شعر کی طرف اشارہ ہے

میں نے دی اس کو لگام اور ہو گیا اس پر سوار
ورنہ کس کو مانتی تھی مادیان قادیاں

یہ نظم مولانا کی کتاب "ارمغان قادیاں" میں دیکھی جا سکتی ہے۔
۲۸- "ارمغان قادیان" کی اشاعت کا اعلان ۱۹۳۴ء میں کیا گیا تھا اس سلسلے میں مولانا نے ۱۱- اپریل ۱۹۳۴ء کو وہ نظم کہی تھی جس کا مطلع ہے۔

تم کو گر منظور ہے سیر جہان قادیاں
اے مسلمانو خریدو ارمغان قادیاں'

کتاب کی اشاعت میں بوجوہ تاخیر ہو گئی۔
۲۹- مراد مرزا بشیر الدین محمود
۳۰- پنڈت جواہر لال نہرو ۲۹- مئی ۱۹۳۶ء کو لاہور آئے تھے۔ اسی دن چھ بجے شام انہوں نے بریڈ لا ہال میں لیکچر دیا تھا۔ قادیانی وا لنٹیرز لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان کے استقبال کو پہنچے تھے۔ وجہ ظاہر تھی کہ ان دنوں پنڈت نہرو قادیانی مسئلے پر علامہ اقبال کے بیانات کا جواب دے رہے تھے (ڈاکٹر صابر کلوروی)
۳۱- کلیم اختر (مضمون نگار) روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۰- اپریل ۱۹۸۴ء نیز صابر کلوروی' ڈاکٹر (مضمون نگار) ادبیات- اسلام آباد جلد ا- شمارہ ۴- ص ۱۳۱
۳۲- ادبیات اسلام آباد- جلد ا- شمارہ ۴- ص ۱۲۷
۳۳- اقبال کے آخری دو سال ص ۳۴۶
۳۴- چمنستان ص ۵۹
۳۵- ایضاً ص ۵۶
۳۶- ایضاً ص ۶۲

۳۷- مجلّہ چناب- ظفر علی خاں نمبر- ص ۸۳
۳۸- محمد یامین خان' سر' نامہ اعمال ص ۶۸۳
۳۹- پاکستان ناگزیر تھا- ص ۱۹۶ نیز فاؤنڈیشنز آف پاکستان ص ۲۷۴- ۲۷۵
۴۰- فاؤنڈیشنز آف پاکستان- ص ۲۷۸
۴۱- علی اکبر گھمن- مولانا ظفر علی خاں کے حالات زندگی اور کارنامے مقالہ ایم اے ص ۱۰۵
۴۲- عاشق حسین بٹالوی- چند یادیں چند تاثرات- جلد دوم واجد علیز لاہور- ۱۹۵۸- ص ۲۸
۴۳- چمنستان- ص ۱۰۱- ۱۰۲
۴۴- مختار مسعود- آئی ونٹس آف ہسٹری ص ۵۲- ۵۳-
۴۵- ایضاً ص ۵۰
۴۶- ایضاً ص ۷۲
۴۷- روزنامہ انقلاب لاہور بابت ۳- جنوری ۱۹۳۸ء
۴۸- فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد سوم ص ۲۶۲
۴۹- چمنستان ص ۱۱۶
۵۰- ایضاً ص ۱۳۴
۵۱- زمیندار- ترکی نمبر- ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء
۵۲- چمنستان- ص ۱۳۶- ۱۳۷
۵۳- روزنامہ زمیندار ۷-۸ فروری ۱۹۵۷ء (ظفر علی خاں کی ڈائری)
۵۴- چمنستان- ص ۱۳۹
۵۵- مولانا ظفر علی خاں کی ڈائری کے چند اوراق- زمیندار- ۲۴- مارچ ۱۹۵۷ء
۵۶- چمنستان- ص ۱۵۶
۵۷- نامہ اعمال- ص ۴۷۷
۵۸- روزنامہ زمیندار- لاہور بابت ۲۱- مارچ ۱۹۴۰ء ص ۷
۵۹- رحیم بخش شاہین پروفیسر (مرتب) نقوش قائداعظم بار اول نومبر ۱۹۷۶ء شیخ اکیڈیمی بل روڈ لاہور- ص ۱۳۸
۶۰- عاشق حسین بٹالوی- چند یادیں چند تاثرات- آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۹ء - ص ۲۴۵- ۲۴۶
۶۱- عاشق حسین بٹالوی- ایضاً- جلد دوم- واجد علیز لاہور ۱۹۸۵ء ص ۲۹
۶۲- فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد سوم ص ۳۴۰
۶۳- نقوش قائداعظم ص ۱۳۹
۶۴- چند یادیں چند تاثرات- جلد اول ص ۲۵۱- ۲۵۲
۶۵- فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد سوم- ص ۳۴۳

۶۶- علی اکبر گھمن- مولانا ظفر علی خاں کے حالات زندگی اور کارنامے- مقالہ ایم اے ص ۱۱۱- ۱۱۲

۶۷- چمنستان- ص۱۶۵

۶۸- زمیندار- ۲۲- مئی ۱۹۴۰ء- ص ۱۵

۶۹- نامہ اعمال ص ۷۹۵ تا ۷۹۸

۷۰- ماہر القادری' مولانا- یاد رفتگاں- مرتبہ طالب الہاشمی- جلد اول- البدر پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۴ء- ص ۳۹۹ تا ۴۰۳

۷۱- فاؤنڈیشنز آف پاکستان- جلد سوم ص ۳۵۶ تا ۳۵۸

۷۲- اشرف عطا- مولانا ظفر علی خاں ص ۱۷۱- ۱۷۲

۷۳- پروسیڈنگز آف دی سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی- دہلی- بابت ۱۶- ستمبر ۱۹۴۲ء جلد سوم ص ۲۱۷

۷۴- جناب علی اکبر گھمن نے اپنے مقالہ ایم اے بعنوان "مولانا ظفر علی خاں کے حالات زندگی اور کارنامے" اور ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی نے اپنی کتاب "مولانا ظفر علی خاں احوال و آثار" (ص - ۲۱۹) میں لکھا ہے کہ خاکساروں کے بارے میں ریزولیشن سر محمد یامین خان نے پیش کیا تھا- دراصل یہ قرارداد جیسا کہ خود سر یامین خاں نے نامہ اعمال (ص ۸۶۵) میں اطلاع دی ہے' ۲۲- ستمبر ۱۹۴۲ء کو سر سید رضا علی نے پیش کی تھی اور ۲۳- ستمبر کو یہ متفقہ طور پر پاس کی گئی-

۷۵- فاؤنڈیشنز آف پاکستان- جلد سوم- ص ۳۸۳

۷۶- اشرف عطا- مولانا ظفر علی خاں- ص ۱۷۴' ۱۷۵

۷۷- پروسیڈنگز آف سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی جلد اول ص ۴۰۳ بحوالہ علی اکبر گھمن- مولانا ظفر علی خاں کے حالات زندگی اور کارنامے- مقالہ ایم اے

۷۸- نامہ اعمال- ص ۸۷۸

۷۹- فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد دوم- ص ۳۷۶

۸۰- نامہ اعمال- ص ۹۰۷

۸۱- نوائے وقت- ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء- بحوالہ اکرام علی ملک- اے بک آف ریڈنگز آف دی ہسٹری آف دی پنجاب- ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور- اپریل ۱۹۸۵ء

۸۲- اشرف عطا- مولانا ظفر علی خاں- ص ۱۷۶- ۱۷۹

۸۳- غلام حسین ذوالفقار' ظفر علی خاں- ص ۱۰۴- ۱۰۵

۸۴- اشرف عطا- مولانا ظفر علی خاں- ص ۱۷۹

۸۵- مصباح الحق صدیقی- تسنیم کوثر گیلانی (مرتبین) قائداعظم کے حضور میں-

۸۶- زمیندار- ۶- مارچ ۱۹۵۸ء

۸۷- بہارستان- نسخہ کارواں ص ۵۸۶

۸۸- زمیندار- ۱۵- اگست ۱۹۴۸ء

۸۹- ظفر علی خاں اور ان کا عہد ص ۳۵۷- ۳۵۸

۹۰- زمیندار- ۱۶- جنوری ۱۹۵۱ء

۹۱- مارشل لا سے مارشل لا تک- ص ۳۵۱

۹۲- بہارستان ص ۵۸۷

۹۳- ایضاً ص ۵۸۸

۹۴- ۹۵- ایضاً ص ۵۸۹- ۵۹۰

۹۶- عنایت اللہ نسیم سوہدروی- ظفر علی خاں اور ان کا عہد ص ۳۷۴- حضرت قائداعظم کی تاریخ تقریر میں سوہدروی صاحب کو تسامح ہوا- یہ تقریر ۲۱- مارچ ۱۹۳۷ء کو نہیں بلکہ یکم مئی ۱۹۳۶ء کو ہوئی تھی-

۹۷- احمد سعید' پروفیسر (مرتب) گفتار قائداعظم

۹۸- پیغام تعزیت بنام اختر علی خاں روزنامہ آفاق ۳۰- نومبر ۱۹۵۶ء

۹۹- اشرف عطا- مولانا ظفر علی خاں ص ۲ (دیباچہ)

۱۰۰- چناب (مولانا ظفر علی خاں گورنمنٹ ڈگری کالج وزیر آباد کا علمی و ادبی مجلہ) ۱۹۸۴ء ظفر علی خاں نمبر ص ۸۱

۱۰۱- غلام حسین ذوالفقار' پروفیسر ڈاکٹر- ظفر علی خاں ادیب و شاعر- ص ۱۰۸

اقبال و ظفر — معاملات من و تو

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے مولانا ظفر علی خاں کو "موم کی ناک" قرار دیا ہے کچھ اور اصحاب نے بھی ان کی جوش و جذبہ سے چھلکتی ہوئی اسلامی شخصیت کو استخفاف آمیز اسلوب بیان کا مستحق گردانا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ کچھ زیادتی ہو رہی ہے اور معترضین کرام مولانا کی پرجوش اور والہانہ شخصیت کا تجزیہ کچھ زیادہ ہی جذباتی انداز میں فرما رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت میں سرگرم حجازی روح کارفرما تھی وہ راست فکر اور راست اظہار بزرگ تھے اور مصلحت اندیشی سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ خود بھی فرماتے ہیں۔

نکل جاتی ہے سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

رسول امین و صادق کا وہ صداقت پرست مدحت نگار' حق گوئی کے اس بلند مقام پر فائز تھا جہاں صداقت اپنے ساتھ رمز و ایما کی آمیزش بھی پسند نہیں کرتی۔ بعض اہل نقد نے اس وصف کو 'برہنہ گوئی' سے تعبیر فرمایا ہے میں اسے 'صراحت نگاری' کہتا ہوں۔ اپنے اٹل اصولوں کی تبلیغ و ترویج میں وہ البتہ نہایت پرجوش اور جذباتی تھے۔ اور ان کے اٹل اصول کیا تھے؟ احد پرستی۔ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام سے غیر مشروط اور غیر متزلزل عقیدت و ارادت اور حریت کیشی۔ اس 'موم کی ناک' نے کسی سطح پر بھی شرک کو گوارا نہ کیا۔ اس نے اسلام اور اس کے آخری نبیؐ کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے دریدہ دہنوں کے ناطقے بند کر دیے۔ اس موم کی ناک نے عمر بھر ختم نبوت کا تحفظ کیا اور اس سلسلے میں کسی مصلحت اور لچک کو روا نہ رکھا۔ آزادی کے محاذ پر لڑتے لڑتے کئی ایسے مواقع آئے جب محصوری اور تنہائی اس کا مقدر بن گئی لیکن یہ 'موم کی ناک' نہ پسپا ہوئی نہ اسے کسی طرح کا احساس پشیمانی ہوا۔ غرض مولانا ظفر علی خاں کی پوری

زندگی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے اصول و معتقدات کے تحفظ میں ان تھک مبارز اور اس شعر کا صحیح مصداق تھے۔

گریزد از صف ما ہر کہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست

جہاں تک مولانا ظفر علی خاں اور ان کے معاصرین کے بعض سیاسی اختلاف کا تعلق ہے' یقیناً مولانا کے سیاسی مخالفین اپنے نقطہ نظر کو خلوص اور دیانت داری کے ساتھ صحیح تر سمجھتے ہوں گے اور ممکن ہے کئی معاملات میں آج ہم بھی انہی کی تائید کریں لیکن عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں مولانا کے بارے میں بھی یہی حسن ظن رکھنا چاہئے کہ وہ بھی کامل دیانت داری اور انتہائی خلوص نیت کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کی صحت پر اصرار کر رہے تھے۔ ہاں یہ درست ہے کہ اپنے اصول و معتقدات کی پاسبانی کے معاملہ میں مولانا بہت پرجوش تھے۔ اتنے پرجوش اور اتنے پرولولہ کہ اس سلسلے میں بڑی سے بڑی شخصیت کی مخالفت مول لینے سے بھی نہیں گھبراتے تھے اور یہی ان کا المیہ تھا۔ حد یہ ہے کہ ان کی یہ جرات اختلاف اور بے باکی اظہار' حضرت علامہ اقبال جیسے محترم دوست کے معاملہ میں بھی محجوب نہ رہ سکی۔

تخالف و تنازع کے ان ہنگاموں اور جوش و جذبہ کے ان ہیجانی لمحات میں ان اکابر کے اسلوب فکر و عمل کے مطالعہ سے ظاہر ہو گا کہ خروش احساس اور طغیان جذبات کی اشتعال آگیں کیفیات میں بھی ان کے ہاں حسن اختلاف اور تمکین و انضباط کی کیا شان ہوتی تھی۔ بعض سیاسی معاملات مثلاً نہرو رپورٹ' سائمن کمیشن' مخلوط انتخابات وغیرہ کے ضمن میں اقبال و ظفر کے اختلافات کا ذکر تحریک آزادی اور قیام پاکستان سے متعلقہ باب میں ہو چکا ہے۔ چند دیگر فکری و علمی اور سیاسی و عمرانی اختلافات لیکن دوستانہ اختلافات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

وطن مازنی کے میدان

حضرت علامہ اقبال سے مولانا ظفر علی خاں کے اختلاف کی ایک چھوٹی سی مثال 'نگارستان' کی ایک نظم کے توضیحی نوٹ سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ حضرت علامہ نے ۱۹۰۸ء میں اٹلی کے محب وطن قومی رہنما جوزف میزنی (۱۸۰۵- ۱۸۷۲ء) کو خراج پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں کو دسمبر ۱۹۱۲ء کے اواخر میں

سیاحت یورپ کے سلسلے میں سمندر کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس بحری سفر کی کیفیات کو انہوں نے ۷- جنوری ۱۹۱۳ء کو ایک نظم میں ڈھال دیا جو 'سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی' کے عنوان سے 'نگارستان' میں شامل ہے۔ اس نظم کے ایک شعر میں "مسینا" کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس پر توضیحی نوٹ لکھتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں۔

"اس آبنائے مسینا ہی میں سے گزرتے وقت اقبال نے یہ شعر کہا تھا

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

لیکن یہ زمانہ اور تھا۔ اس وقت ہمارے شاعر کو حضور سرور کون و مکاں کے دربار میں اس آبگینہ کی نذر گزراننے کا حسرت اندوز شرف حاصل نہ ہوا تھا جس کی نسبت وہ کہتا ہے

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

آج اگر اس مقام سے اس کا گزر ہوتا تو وہ مازنی کی اولاد و اسفار کے کارناموں کی یاد سے متاثر ہو کر شاید یوں کہتا

جلے رہو وطن مازنی کے میدانو
کہ دور ہی سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں"

ظاہر ہے حضرت اقبال کے شعر میں مولانا کا تصرف کرنا دراصل تغیر حالات کا نتیجہ ہے اور اس میں طنز یا تعریض کا کوئی پہلو نہیں۔

مولانا ظفر علی خاں اور حیدر آباد

۱۹۱۸ء میں مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد دکن سے واپس لاہور آئے تو ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گرم تھیں۔ اس موقع پر حضرت علامہ اقبال نے مولانا عبداللہ العمادی کے نام ایک خط میں' جس کا سال تحریر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے ۱۹۱۸ء قیاس کیا ہے' مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں اظہار تاسف و ہمدردی کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس خط سے مولانا کے طرز عمل پر یک گونہ تنقید بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت علامہ نے لکھا تھا۔

"مولوی ظفر علی خاں صاحب سے شملہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اب کرم آباد میں ہیں۔ لوگ چونکہ پہلے سے ان کی نسبت بدظن ہیں۔ ان کے حیدر آباد سے واپس آ جانے کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ ایک حیدر آبادی راوی نے ایک

عجیب و غریب واقعہ ان کا بیان کیا یعنی یہ کہ وہ حضور نظام کے دربار میں "یا امیر المومنین" کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ راوی کے طرز بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب کی بے ہوشی مصنوعی تھی۔ واللہ اعلم۔ میں نے ان کو جاتی دفعہ کہہ بھی دیا تھا کہ وہ حیدر آباد میں سوائے اپنے کام کے اور کسی سے سروکار نہ رکھیں۔ مگر افسوس کہ وہ میری نصیحت پر عمل نہ کر سکے اور نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔"

"مولانا ظفر علی خاں اور حیدر آباد دکن" کے عنوان سے جناب شفقت رضوی کا ایک قابل قدر مضمون سہ ماہی مجلّہ اقبال بابت اپریل تا جولائی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے جس سے اس تاثر کی تغلیط ہوتی ہے کہ ۱۹۱۸ء میں مولانا کو حیدر آباد سے نکال دیا گیا تھا۔ رضوی صاحب نے شواہد سے ثابت کیا ہے کہ مولانا کو ان کی اپنی مرضی کے مطابق لاہور میں رہ کر تراجم کا منفوضہ کام کرنے کی اجازت دی گئی تھی اور نہ صرف ان کی تنخواہ برقرار رکھی گئی تھی بلکہ وہ پانچ سو روپے ماہانہ بھی بحال رکھے گئے تھے جو بمطابق حکم مصدرہ ۲۔ رجب ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) مولانا کو ملا کرتے تھے۔ تاہم تقریباً پونے دو سال بعد حکومت ہند کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے دباؤ کے باعث مولانا کی ملازمت اور تمام دیگر مراعات میر عثمان علی خاں کے حکم سے بند کر دی گئیں۔

ایک منظوم مکالمہ

جناب اصغر حسین نظیر لودھیانوی فرماتے ہیں:

"۱۹۱۹ء میں جب پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپی اتحادیوں نے ترکی کے تمام مقبوضات اور عرب ممالک پر قبضہ کر کے پورے عالم اسلام پر اپنی سیادت قائم کر لی تو دنیا بھر کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ برصغیر پاک و ہند میں تحریک خلافت شروع کی گئی۔ ان دردناک حالات میں جناب محمد حسین عرشی امرتسری نے ایک فارسی نظم میں علامہ اقبال سے التجا کی کہ وہ موجودہ قیامت خیز حالات میں خاموش نہ رہیں' قوم کی رہنمائی کے لیے کچھ فرمائیں۔ عرشی کی نظم طویل ہے۔ آخری اشعار یہ تھے۔

خیز و گلبانگ دہل در گنبد خضرا فگن
از قبور آیند خلقے شور صور آسا فگن
خیز و صوت خود بہ آہنگ رجز تبدیل کن
قطرہ داری بیاور در شرر تحلیل کن

خیز ازیں کنج متانت، جلوہ برما فگن
ہاں بیا ہمچو سنائی گوئے در میداں بزن"(۱)

"یہ نظم روزنامہ "زمیندار" کے شمارہ بابت ۱۳- مئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم اخبار زمیندار کا یہ پرچہ لے کر خود علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے عرشی امرتسری کے پیغام کے جواب میں جو اشعار مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے حوالے کیے، وہ علامہ کے کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ میں یہ اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں

دانی کہ چیست شیوہ مردان پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دارم ہنوز از کرم ساقی حجاز
آہ درونہ تاب کہ خیزد زسینہ مست
از شاخسار فطرت من می دمد ہنوز
آں لالہ کہ موج نسیمے دلش نہ خست
لیکن شنیدۂ کہ دم گردش شراب
پیر عجم چہ گفت بہ رندان مے پرست
"دانا کہ دید شعبدہ چرخ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و در گفتگو بہ بست"(۲)

.... علامہ کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے دوسرے روز مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کہا:

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیر فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اتر رہی ہے کہ باطل کو دے شکست
مانا کہ ان کو جو نظر آتے ہیں سر بلند
چرخ ستیزہ کار کرے گا زبون و پست
لیکن نہ قول سعدی شیراز بھولیے
چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سر رشتہ الست
"رفتن بہ پائے مردئ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است"

حکیم طغرائی امرتسری نے بھی علامہ کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے ایک نظم کہہ ڈالی جس کے آخری دو شعر یہ تھے:

گیرم کہ گنج فلسفہ و حکمت است کس
اما چہ سود مہر سکوت ار بش بہ بست
پندیر اعتذار ز طغرائی حزیں
دانی کہ او ز بند الم ہیچ گہ نہ رست

آخر علامہ نے عرشی امرتسری' مولانا ظفر علی خاں مرحوم اور حکیم طغرائی امرتسری کے اصرار کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم کو بتایا کہ انہوں نے ایک نظم شروع کر دی ہے' جس کا مطلع یہ ہے:

شعلہ در آغوش دارد عشق بے پروائے من
بر نہ خیزد یک شرار از قسمت نازائے من

یہ نظم بھی جس کے چند اشعار میرے پاس محفوظ ہیں' علامہ مرحوم کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔(۳)

فوجی بھرتی

پہلی جنگ عظیم کے سلسلے میں فوجی بھرتی کی تحریک بڑے زور شور سے جاری کی گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اس بھرتی کے خلاف تھے چنانچہ مولانا کے خلاف جو استغاثہ ۱۹۲۰ء میں مجسٹریٹ کیمبل پور کی عدالت میں پیش کیا گیا تھا' اس میں کہا گیا تھا کہ۔

۱۴ یا ۱۴ اگست کے قریب ملزم ظفر علی خاں نے حضرو ضلع اٹک میں ایک تقریر کی جس کے دوران میں حسب ذیل الفاظ استعمال کیے:

"ہم وہ مسلمان ہیں جنہوں نے مکہ کو آگ لگائی ہے اور ہم بے وفا لوگوں نے مسلمانوں کو دس گیارہ روپے کی خاطر گولیوں سے مار دیا اور مقامات مقدسہ کو سر کرنے کے بعد عیسائیوں کے حوالے کر دیا.... اب سوال یہ ہے کہ حالات حاضرہ میں کیا کیا جائے؟ ہر مسلمان پر ہجرت کرنا فرض ہے اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجنے سے روک دیں۔ کوئی شخص فوج میں بھرتی نہ ہو۔ ذیلدار اور نمبردار اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیں..... اب لگاؤ نعرہ کہ ہم فوج میں بھرتی نہ ہوں گے۔"(۴)

اس وقت انگریز عالم اسلام کو اپنی نو آبادیاتی ہوس کے شکنجے میں کستے چلے جا رہے تھے

انگریزوں کی اس روش کے خلاف مولانا نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے بارہا صدائے احتجاج بلند کی مثلاً ۱۹- جون ۱۹۲۰ء کے 'زمیندار' میں آپ کے یہ اشعار شائع ہوئے۔

اس آب سرخ کا ساقی ادھر بھی ایک کنٹرلا
لنڈھا کر جس کے خم کے خم ہوئے سرشار بونرلا
سرنا کی مئے گلرنگ اگر تیزی میں کچھ کم ہو
حرم میں جا کے یورپ کے لیے خون کبوتر لا
اے آشامان مغرب کو اگر ساغر کی حاجت ہو
کسی مسلم کا مٹی میں ملا اک کاسہ سر لا

انہی دنوں آپ نے یہ بھی فرمایا

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
تثلیث کو یہ جا کے سنا دو کہ آج سے
نگنی کا ناچ ہم کو نچایا نہ جائے گا
اے کفر ہاتھ پاؤں کٹے تیری راہ میں
سر رہ گیا ہے سو وہ کٹایا نہ جائے گا(۶)

حضرت علامہ کے یہاں فوجی بھرتی کے خلاف کوئی ایسا صریح بیان نہیں ملتا بلکہ انہیں تو ۱۹۱۸ء میں بھرتی کے سلسلے میں ہونے والے مشاعرہ میں شریک ہونے اور 'پنجاب کا جواب' کے عنوان سے نو بند کا ایک مسدس پڑھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا جس کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

ہنگامہ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

سر (نائٹ) کا خطاب

حضرت علامہ اقبال کو یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو نائٹ یعنی سر کا خطاب ملا- اس سے ملک کے حریت پسند طبقوں کو شدید دھچکا لگا- اور اس سلسلہ میں مختلف اطراف سے حضرت علامہ اقبال پر اعتراضات ہوئے- مولانا عبدالمجید سالک کی سات شعر کی بے قافیہ نظم اس زمانے میں خاصی مشہور ہوئی تھی- اس نظم کی ردیف "سر ہو گئے اقبال" تھی اور یہ غالباً ۴- جنوری ۱۹۲۳ء کو کہی گئی اور ۸- جنوری کے 'زمیندار' میں شائع ہوئی تھی- اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں-

لو مدرسہ علم ہوا قصر حکومت
افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو مسلمانوں کے سر ہوتے تھے اکثر
تنگ آ کے اب انگریز کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال
سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا
سرکار کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبال
سودائے غم عشق سے سالک تو ہوا قید
اور خوبیِ قسمت ہے کہ سر ہو گئے اقبال

مولانا عبدالمجید سالک ۴- نومبر ۲۱ء کو اپنے ایک سامراج دشمن اداریہ کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تھے اور انھیں ایک سال قید کی سزا ملی تھی- ۲۲ کے اواخر میں وہ رہا ہو چکے تھے- مولانا ظفر علی خاں اس زمانے میں منٹگمری (ساہیوال) جیل میں تھے- انھیں بھی اس بات کا ملال تھا کہ حضرت علامہ نے سر کا خطاب کیوں قبول کیا- 'سر' کے عنوان سے ان کی ایک نظم بھی 'بہارستان' میں موجود ہے- اس نظم کی تاریخ تحریر ۲۹- دسمبر ۱۹۲۷ء ہے- بظاہر یہ نظم مولانا نے قید فرنگ سے رہائی (۱۹۲۴ء) کے بعد کہی- اس مختصر نظم میں مولانا نے حضرت علامہ کو 'عافیت کوشی' کا طعنہ بھی دیا اور انہی کا ایک مصرع اس نظم میں تضمین کر کے انھیں آئین مردانگی اپنانے کی تلقین کی ہے- دراصل اس نظم کو بھی سائمن کمیشن وغیرہ کے سلسلہ میں دونوں حضرات کے سیاسی اختلافات کی ایک موج غبار سمجھنا چاہیے- نظم درج ذیل ہے-

سر فروشوں کے ہیں ہم 'سر' آپ سر سرکار کے
آپ کا منصب ہے سرکاری ہمارا خانگی
فیصلہ کر لے گی دنیا ہم میں افضل کون ہے
آیئے چل کر دکھا دیں اپنی اپنی بانگی
پاؤں میں زنجیر ہے زنداں سے گھبراتے نہیں
ہم محبان وطن کا شیوہ ہے دیوانگی
عافیت کوشی ہے پہلے دن سے مسلک آپ کا
اور اسی میں مستتر ہے آپ کی فرزانگی

چھوڑ کر اپنوں کو غیروں کا دیا ساتھ آپ نے
بات ہے یہ عقل کی یا عقل سے بیگانگی
"مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو"
چھوڑ دے اس بزدلی کو اور دکھا مردانگی(۷)

حضرت علامہ کے بعض دیگر دوستوں اور بہت سے عام مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ شاید یہ خطاب قبول کرنے کے بعد حضرت علامہ اپنے شیوہ حق گوئی کو قائم نہ رکھ سکیں۔ جب میر سید غلام بھیک نیرنگ نے ایک خط کے ذریعے اس خدشے کا اظہار حضرت علامہ سے کیا تو حضرت علامہ نے ۴۔ جنوری ۱۹۲۳ء کو انہیں لکھا۔

"باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان و آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں' دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ۔"(۸)

دوستانہ شکوہ

بسیات (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) میں حضرت علامہ اقبال سے مولانا کے ذیل کے دو دوستانہ شکوے شائع ہوئے۔ اس سلسلہ میں پہلی نظم 'شکوہ' کے عنوان سے ہے جس میں مولانا فرماتے ہیں:

عرض کر حضرت اقبال سے جا کر یہ صبا
اے کہ دنیائے سخن میں تری تمثال نہیں
ماجرا کیا ہے کہ کچھ روز سے خاموش ہے تو
گرم پرواز ترا فکر سبک بال نہیں
بزم کہتی ہے کہ تو جب سے نہیں زمزمہ سنج
کسی آہنگ میں وہ سر نہیں وہ تال نہیں
باندھنے کے لیے مضموں نہیں ملتے تجھ کو
یا روانی پہ تری طبع ہی فی الحال نہیں
کونسا دن ہے کہ سر پر کوئی بجلی نہ گری
کونسی شب ہے کہ آیا کوئی بھونچال نہیں

کونسا گوشہ ہے ماتم نہیں جس میں برپا
کون سا خطہ ہے جو مضطرب الحال نہیں
شاہزادے سے عقیدت نہیں کس بستی کو
کشور ہند کے کس شہر میں ہڑتال نہیں
یہ مباحث ترے نزدیک ہیں فرسودہ اگر
تو خلافت کے مضامین تو پامال نہیں
ان معارف ہی سے کر آکے جہاد اکبر
شرع کو تجھ سے تقاضائے زر و مال نہیں
کب جنوں مصلحت اندیش ہوا کرتا ہے
آج کیوں یاد تجھے اپنے ہی اقوال نہیں
تنت کے وقت میں اپنوں سے نہ منہ پھیر کہ تو
دولت اسلام کی ہے کفر کا اقبال نہیں

دوسری نظم بعنوان "زندگی" میں حضرت مولانا حضرت علامہ کے یوں چٹکی لیتے ہیں۔

ہے اسیری مجھ ستم کش کے لیے لطف حیات
حضرت اقبال کو لطف سخن ہے زندگی

اقبال اور انقلاب

۱۹۲۷ء میں روزنامہ انقلاب' جاری ہو چکا تھا اور اس کے مدیران شمیر مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کی مولانا ظفر علی خاں سے سیاسی اور صحافتی چھیڑ چھاڑ بھی شروع ہو چکی تھی۔ ادھر سائمن کمشن کے سلسلہ میں حضرت علامہ اقبال سے بھی مولانا ظفر علی خاں کے سیاسی اختلافات زوروں پر تھے۔ مولانا کو شبہ تھا کہ حضرت علامہ اقبال اور ملک فیروز خان نون انقلاب کی پشت پناہی کر رہے ہیں چنانچہ ۴۔ فروری ۱۹۲۷ء کو انہوں نے لکھا۔

یہ کیا نیا غضب ہے کہ ہڑتالیوں کے ساتھ
شامل ہیں 'انقلاب' کے دونوں مدیر بھی
پیٹیں گے سر شفیع اب ان کی جفا کا ڈھول
اور ساتھ ہی پرانی وفا کی لکیر بھی

مجموعہ "انقلاب" کا اقبال و نون تھے
دونوں کی تاک میں تھا مگر چرخ پیر بھی

اسی سیاسی پس منظر میں مولانا نے ۱۲- اکتوبر ۲۸ء کو ذیل کے اشعار بھی کہے جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئے۔

کہہ دو یہ اس سے تم کو 'خودی' کا جو درس دے
رکھا ہی کیا ہے تیری فعولن فعول میں
کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
'بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں'

نادر شاہ

افغانستان میں حبیب اللہ خاں امیر افغانستان کے قتل (فروری ۱۹۱۹ء) کے بعد غازی امان اللہ خان بادشاہ بنا۔ اس نے ملک میں اصلاحات کرنے کی کوششیں کیں لیکن اس کی آزاد خیالی کو بعض حلقوں نے ناپسند کیا۔ شنواریوں کے ایک قبیلے نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ پھر حبیب اللہ نامی ایک ڈاکو جو ایک بہشتی کا لڑکا تھا اور عوام میں بچہ سقہ کے نام سے مشہور ہوا ملک کا بادشاہ بن گیا۔ برطانیہ بچہ سقہ کی پشت پناہی کر رہا تھا امان اللہ خان جلا وطن ہو کر اٹلی پہنچ گیا۔ ملک کو بچہ سقہ کے تسلط سے جنرل نادر خاں نے آزاد کرایا لیکن بعد میں ۱۷- اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اس نے جرگے کی حمایت سے خود مختار بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ نادر خاں کے اس اقدام کو دغا دشمنی سمجھا گیا کیونکہ نادر خاں امان اللہ خاں کے جرنیل کے طور پر ہی شنواریوں اور بچہ سقہ کی شورشوں کو فرو کرنے کے لیے آیا تھا۔ چنانچہ مولانا حسرت موہانی نے فرمایا تھا۔

"انہیں (جرنیل نادر خاں کو) جرنیل ہی رہنا چاہئے تھا۔ نادر شاہ ثانی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے تھی۔" (زمیندار۔ ۲۷- اکتوبر ۱۹۲۹ء) حضرت علامہ اقبال نادر خاں کے حق میں تھے۔ انہوں نے نادر خاں کی بھرپور مالی اور اخلاقی مدد کی اور اس کے بادشاہ افغانستان بننے پر بھی اس کی بھرپور تائید کی۔ انہوں نے دیگر اکابر کو ہمنوا بنا کر برطانوی حکومت پر زور دیا کہ وہ نادر خاں کی حکومت کو تسلیم کرے چنانچہ ایک طویل مشترکہ بیان میں کہا گیا

"گورنمنٹ انگریزی کا فرض ہے کہ ہندوستان اور افغانستان کے باشندوں کی متحدہ خواہشات کے مطابق سپہ سالار غازی جنرل محمد نادر خاں کو افغانستان کا جائز بادشاہ تسلیم کرنے میں کسی قسم کا (کی؟) تاخیر و التوا کو راہ نہ دے۔"(۹) اور جب نادر خاں کی حکومت کو تسلیم کر لیا گیا تو حضرت

علامہ نے وزیر خارجہ افغانستان کے نام برقی پیغام بھیجا جس میں کہا گیا" بیرونی حکومتوں اور علی الخصوص برطانیہ کی طرف سے تسلیم حکومت پر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں مخلصانہ مبارک باد عرض کر دیجئے۔"(۱۰) ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے تعلیمی معاملات میں مشورہ کے لیے حضرت علامہ اقبال' سید راس مسعود' سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی چنانچہ یہ حضرات اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اس تعلیمی اور سرکاری دورہ پر کابل پہنچے اس سفر میں ایک موقع پر حضرت علامہ نے شاہ کی امامت میں نماز عصر بھی ادا کی۔ اور جب نومبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کو شہید کر دیا گیا تو حضرت علامہ نے وزیر اعظم افغانستان کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں کہا "میں نے اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے غدارانہ قتل کی خبر سے نہایت شدید رنج و اندوہ محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت شہید کی روح کو خلعت مغفرت عطا فرمائے۔ آپ نجات دہندہ افغانستان اور زمانہ حاضر کے جلیل ترین حکمرانوں میں سے تھے اور آپ کے انتقال کا نقصان تمام دنیائے اسلام میں محسوس کیا جائے گا۔ اعلیٰ حضرت شہید کی ذاتی شجاعت' ذاتی تقویٰ اور اسلام اور افغانستان سے محبت' آئندہ نسلوں کے لیے بہت بڑی ہمت افزائی اور تحریک عمل کا باعث ہو گی۔"(۱۱) حضرت علامہ نے اپنی مثنوی مسافر (طبع اول ۱۹۳۶ء) میں بھی نادر شاہ شہید کو زبردست خراج محبت و ارادت پیش کیا ہے۔ چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

نادر افغاں شہ درویش خو
رحمت حق بر روان پاک او
کار ملت محکم از تدبیر او
حافظ دین مبیں شمشیر او
چوں ابوذر خود گداز اندر نماز
ضربتش ہنگام کیں خارا گداز
عہد صدیقؓ از جمالش تازہ شد
عہد فاروقؓ از جلالش تازہ شد

دوسری طرف بعض اکابر برعظیم غازی امان اللہ خاں کے حق میں تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت حسرت موہانی کا بیان پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی امان اللہ خاں کے ہوا خواہوں میں تھے چنانچہ انہوں نے محمد نادر شاہ کی تخت نشینی پر کسی خوش گوار ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ نادر شاہ کے اقتدار اور امان اللہ خاں کی معزولی کو برطانوی استعمار کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ نادر شاہ اور نور المشائخ ملائے شور بازار کے خلاف ان کی نظموں میں یہ نقطہ نظر کارفرما ہے

چنانچہ انہوں نے اپنی ایک نظم بعنوان "شور بازاری شریعت کے پرستاروں کا اسلام" میں فرمایا۔

ایک ڈاکو کو دیا مرد مجاہد کا خطاب
شور بازاری رذالو کیا یہی اسلام ہے!
جھوٹی قسمیں کھانے والے کو بنایا بادشاہ
شرع پر مر مٹنے والو کیا یہی اسلام ہے
اپنے محسن کو ڈسا جس افعی خوش رنگ نے
آستیں میں اس کو پالو کیا یہی اسلام ہے
جس نے روندا پاؤں میں ارشاد اوفوابالعقود
اس کو آنکھوں پر بٹھا لو کیا یہی اسلام ہے
جس نے افغانوں کی عزت میں لگائے چار چاند
اس کو یوں گھر سے نکالو کیا یہی اسلام ہے
پھیر لیں آنکھیں امان اللہ خاں غازی سے کیوں
گوری رنگت والے کالو کیا یہی اسلام ہے(۱۲)

مولانا ظفر علی خاں کی اس پالیسی کے سلسلہ میں مولانا کے ایک ہم عصر اور ہم خیال شاعر جناب راجہ محمد عبداللہ نیاز (حضرت مصور) کی ایک نظم بعنوان "جرنیل نادر خاں کی تصویر" خصوصاً قابل ذکر ہے۔ حضرت مصور کی طنز و احتجاج سے لبریز یہ نظم روزنامہ "زمیندار" نے دوبار چھاپی۔ اس نظم کے تین اشعار نذر قارئین ہیں۔

لیکن یہ بات سن لو مری گوش ہوش سے
کہتا ہوں برملا جو ہر اک مرد و زن سے آج
سقا ہزار پیکر وحشت سہی مگر
نادر بھی کم نہیں ہے کسی راہزن سے آج
ڈاکو برا ہے کور نمک اس سے بھی برا
ہر چند کامگار ہو تزویر و فن سے آج(۱۳)

روزنامہ 'زمیندار' کی اسی نادر دشمنی کی بنا پر دس جولائی ۱۹۳۱ء کو زمیندار کے دوسرے مدیر مسئول چودھری عبدالحق کو نادر شاہی آرڈی نینس کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا اور زمیندار کے ۲، ۵، ۱۲، اور ۲۸ جون کے پرچے بھی ضبط کر لیے گئے تھے۔ اس گرفتاری اور ضبطی کی وجوہات میں سے ایک وجہ نیاز صاحب کی متذکرہ بالا نظم بھی تھی جو ۲۔ جون ۱۹۳۱ء کو دوبارہ شائع ہوئی تھی۔

حسین احمد مدنی

مولانا حسین احمد مدنی نے مسلم لیگ کی مخالفت کی تو مولانا نے ۱۶ مئی ۱۹۳۹ء کو ان کے خلاف بھی نظم داغ دی- اس نظم کا پہلا شعر یہ تھا-

وطن جس کی رو سے ہے بنیاد ملت
میں اس شرع کی کر رہا پیروی ہوں

اس شعر کی بنیاد' حضرت علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے درمیان ہونے والی ایک معرکہ آرا بحث ہے- مولانا حسین احمد صاحب نے ۸- جنوری ۱۹۳۸ء کی رات کو دہلی میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں-" حضرت علامہ اقبال نے مولانا کی تقریر کی رپورٹ سے جو اخبار 'انصاری' میں شائع ہوئی تھی' یہ نتیجہ اخذ کیا-

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

ظاہر ہے حضرت علامہ کا نظریہ یہ تھا کہ ملت کی اساس وطن نہیں دین ہے- لیکن جب اس سلسلے میں طرفین سے علامہ طالوت کی مراسلت ہوئی تو مولانا حسین احمد نے وضاحت کی-

"میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیت کا کہا ہے- ملت کا نہیں کہا ہے- دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے- ملت کے معنی شریعت یا دین کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں..... میں نے کب کہا کہ ملت یا دین کی اساس وطن پر ہے"(۱۴)

حضرت طالوت کے نام اپنے دوسرے خط میں مولانا حسین احمد صاحب نے لکھا "میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں- یہ اس زمانہ کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے- یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہئے- خبر ہے انشا نہیں ہے-"(۱۵) مولانا حسین احمد مدنی کی وضاحت کے بعد حضرت علامہ اقبال نے روزنامہ احسان' میں اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں فرمایا:

"مولانا (حسین احمد مدنی) اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا- لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان

پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔"(۱۶)

ارباب برہان و بصیرت میری اس آشفتگی کو معاف فرمائیں کہ حضرت علامہ اقبال کے اس فقرے میں لفظ "اعتراف" مجھے کچھ ستم ظریفانہ معلوم ہوتا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کو "اعتراف" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یوں لگتا ہے کہ حضرت علامہ یہ لفظ ارتجالا بجائے "وضاحت" لکھ گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سہو کتابت کا شاخسانہ ہو۔ خود حضرت علامہ نے اپنے ماقبل فقرے میں مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے لیے لفظ "انکار" استعمال کیا ہے جو مولانا کے سیاق بیان کے لحاظ سے زیادہ موزوں لفظ ہے۔

جہاں تک مولانا حسین احمد مدنی کے خلاف حضرت علامہ کے تین اشعار مشمولہ "ارمغان حجاز" کا تعلق ہے، حضرت علامہ کے دیگر بے شمار نیازمندوں کی طرح مجھے بھی جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے اس موقف سے اتفاق ہے۔

"قوم کی بدقسمتی سے ۲۱۔ اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا جب کہ ان کا آخری مجموعہ کلام موسوم بہ "ارمغان حجاز" نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کر دیتے یا حاشیئے میں اس حقیقت حال کو واضح کر دیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بنا پر لکھے تھے۔ بعد ازاں حضرت مولانا نے اخباری رپورٹ کی تردید کر دی اس لیے ان اشعار کو کالعدم یا مسترد سمجھنا چاہئے لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس لیے نہ ان اشعار کو حذف کیا گیا اور نہ حاشیئے میں حقیقت حال کو واضح کیا گیا نتیجہ اس غفلت اور کوتاہی کا یہ نکلا کہ گزشتہ تیس سال سے (اور اب کہ ۱۹۹۲ء ہے، گزشتہ چون سال سے۔ جعفر) مسلمانان عالم بالعموم اور مسلمانان پاکستان بالخصوص ان اشعار کی بنا پر حضرت اقدس (حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) سے بدگمان ہوتے چلے آ رہے ہیں۔"(۱۷)

اس ساری بحث میں حضرت علامہ کا نقطہ نظر وہی ہے جو ان کے درج ذیل شعر میں پیش کیا گیا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

وطنیت اور قومیت کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں کا بھی یہی نظریہ تھا اور وہ اسے نظم و نثر میں مسلسل بیان کرتے چلے آ رہے تھے چنانچہ اپنی ایک نظم بعنوان "حکم" مشمولہ "بہارستان" (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) میں وہ فرماتے ہیں۔

لیکن میں پرستار نہیں خاک وطن کا
دیتا نہیں اس بت کو کسی شکل میں تعظیم
قائل نہیں میں ہند کے ان فلسفیوں کا
جو ہم کو دلاتے ہیں یقیں ازرہ تحکیم
جب تک کہ نہ ہو تابع خاک وطن' ایماں
اس ملک میں ممکن نہیں اک قوم کی تنظیم
ایمان تو اک نور ہے دل جس سے ہے روشن
اس نور پہ کب خاک کو ہو سکتی ہے تقدیم
میں پہلے مسلمان ہوں بعد اس کے ہوں کچھ اور
وہ تھی مری تخصیص تو یہ ہے مری تعمیم
ازبسکہ رعیت ہوں میں شاہؒ دوسرا کی
بستی ہے مری مشرق و مغرب کی ہر اقلیم
بخشی گئی دنیا بھی ملا دین بھی مجھ کو
جس وقت کہ اسلام کی دولت ہوئی تقسیم

اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں مولانا کی اسی رائے کو راجح سمجھا جانا چاہئے جو انہوں نے نگارستان' میں دی ہے۔ نگارستان' کا پہلا ایڈیشن خود مولانا کے زیر نگرانی غالباً ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ نگارستان کے نسخہ یونائیٹڈ پبلشرز کے ص ۵۵ کے نوٹ سے یہی سال اشاعت مستنبط ہوتا ہے۔ اگر مولانا کو ۱۹۳۳ء کی اس پرانی رائے سے اتفاق نہ ہوتا تو وہ اسے ۱۹۴۱ء میں اپنی کتاب میں کیوں شامل کرتے؟ بہرحال اس نظم میں مولانا 'دیوبند' کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

شادباش و شاد زی اے سرزمین دیو بند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
اسم تیرا بامسمّٰی ضرب تیری بے پناہ
دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند
اس میں قاسم ہوں کہ انورشہ کہ محمود الحسن
سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمی ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایات سلف کا سر بلند

غرض حضرت علامہ اور مولانا ظفر علی خاں میں مختلف مواقع پر متعدد قومی و ملی مسائل کے سلسلہ میں فروعی اختلافات ہوتے رہتے تھے اور ان میں دوستانہ نوک جھونک چلتی تھی۔ حضرت علامہ کے بارے میں مولانا کے متعدد اشعار اس باب میں پیش کیے گئے ہیں۔ ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ نے بھی مولانا کے خلاف اپنے "ایکس شاعر" کے خفیہ نام سے کئی شعر کہے جو ایک اور باب میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ بہرحال یہ سب ایک دوستانہ چھیڑ چھاڑ تھی۔ اس سلسلے میں ایک بار راقم نے مولانا ظفر علی خاں کے بھائی مولانا حامد علی خاں سے استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا۔

"کبھی کبھی مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کے درمیان کسی سیاسی مسئلے پر اختلاف بھی ہو جایا کرتا تھا اور مولانا ظفر علی خاں حضرت علامہ کے خلاف بھی کبھی کبھار ایک آدھ شعر کہہ جایا کرتے تھے لیکن علامہ اقبال ایسے شعروں یا مصرعوں کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ جب ایسے مصرعے ان تک پہنچتے اور اس کے بعد ان کی ملاقات مولانا ظفر علی خاں سے ہوتی تو وہ ہنس کر کہتے کہ مولانا آپ نے میرے بارے میں وہ شعر خوب کہا اور بات اسی ہنسی اور دل لگی میں رفع ہو جاتی دراصل مولانا ظفر علی خاں بہت پرجوش انسان تھے اور جب انہیں کوئی قافیہ سوجھ جاتا تو جوش جذبات میں اسے باندھے بغیر نہ رہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں اپنے ایک اور بھائی غلام حیدر خاں کا یہ قول مجھے ایسے موقعوں پر اکثر یاد آتا ہے کہ بھائی صاحب (مولانا ظفر علی خاں) کو قافیہ ملنا چاہئے' چاہے اس سے اگلے کا بیڑا ہی کیوں نہ غرق ہو جائے۔"

لیکن اس سلسلے میں خود مولانا کا بیان بھی دلچسپ اور چشم کشا ہے۔ جب کسی نے ان سے کہا کہ "آپ نے تو کئی ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں اقبال پر چوٹ کی گئی ہے۔" تو مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا۔ "یہ چوٹ کا لفظ بے محل ہے۔ میں نے جو کچھ بھی اقبال کے متعلق لکھا اس کا ایک خاص رخ ہے اور تمام تر سخن گسترانہ ہے۔ ہم دونوں ہم عصر تھے۔ ہمارے تعلقات کا رشتہ آپ کی طرح نہ تھا۔ بلکہ ہمارے روابط دو دوستوں کے سے تھے۔ ایسے دوست جن میں روایتی تکلف نام کو بھی نہیں ہوتا۔ میں نے جب بھی علامہ مرحوم سے شاعرانہ نوک جھونک کی تو اس کا پس منظر دوستانہ ہی ہوتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھار عمل کے بعض گوشوں میں ان کی علیحدگی سے بہ نظر ظاہر جو خلا سا محسوس ہوتا تھا' اس سے میرے قلم کی زبان پر ان کے متعلق کہیں کہیں طعن آ گیا مگر اس کا طول و عرض وقتی تحریکوں کی شاعرانہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ نہ ہوتا

تھا۔"(۱۸)

انہی خیالات کا اظہار مولانا نے ہفت روزہ قندیل لاہور کے ایک نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی کیا۔ آپ نے فرمایا:

"اقبال کا ظرف بہت بلند تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہرگز رنجیدہ نہ ہوتے تھے اور نہ ان کا کچھ خیال کرتے تھے۔ اس کے برعکس وہ اپنے مخالفوں تک کی بات کو بڑی توجہ اور سکون سے سنتے تھے اور بڑے ہی مدلل اور نپے تلے انداز میں اس کا جواب دیتے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے اقبال کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس کا مقصد ہرگز ان کی مذمت نہ تھا۔ اسے آپ ایک دوست کا شکوہ و شکایت کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی ایک مخلص دوست کا۔"(۱۹)

حوالے اور حواشی

۱۔ اقبال کے ہم نشیں مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی ص ۴۰
مکمل نظم کے لیے دیکھیں باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔ مجلس اقبال کراچی س ن ص ۱۳۴۔ ۱۳۵ آخری مصرع نظم کے اس متن کے مطابق ہے جو جناب رحیم بخش شاہین نے اپنی تالیف "اوراق گم گشتہ" کے صفحات ۲۰۰ تا ۲۰۳ میں پیش کیا ہے۔

۲۔ یہ اشعار باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ آئینہ ادب لاہور میں شامل ہیں۔ آخری شعر خواجہ حافظؒ کا ہے۔ خواجہ حافظ کے شعر کا پہلا مصرع' دیوان حافظ میں یوں ہے۔

دانا چو دید بازی ایں چرخ حقہ باز

۳۔ اقبال کے ہم نشیں ص ۴۰ تا ۴۲۔ حضرت علامہ کی یہ غزل (پروائے من نازائے من) یکم جون ۱۹۲۰ء کے 'زمیندار' میں شائع ہوئی تھی۔ نظیر لودھیانوی مرحوم کا یہ کہنا درست نہیں کہ یہ غزل حضرت' علامہ کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں۔ یہ غزل نظرثانی اور ترمیم کے بعد "پیام مشرق" میں شامل کی گئی ہے۔

۴۔ پیسہ اخبار۔ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۲۰ء۔ مقدمہ کی مکمل کارروائی پیسہ اخبار کے ۲۱۔ ۲۸۔ ۲۹ اور ۳۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھی۔

۵۔ بہارستان۔ ص ۱۱۵

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۱۸۔ ۱۱۹

۷۔ ایضاً۔ ص ۵۳۹

۸۔ اقبالنامہ۔ حصہ اول ص ۲۰۶-۲۰۷

۹- اقبال کا سیاسی سفر- از محمد حمزہ فاروقی- بزم اقبال لاہور جون ۱۹۹۲ء ص ۱۸۸
۱۰- ایضاً ص ۱۹۱
۱۱- گفتار اقبال ص ۱۸۱
۱۲- روزنامہ زمیندار ۱۰- نومبر ۱۹۲۹ء - بہارستان ص ۲۵۹
۱۳- روزنامہ زمیندار ۱۵- نومبر ۲۹ء
۱۴- نظریہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی و علامہ اقبال مرتب طالوت ص ۲۲- ۲۳
۱۵- ایضاً ص ۴۱
۱۶- ایضاً ص ۴۸ نیز اقبال کے ممدوح علما مرتب قاضی افضل حق قرشی- ۱۹۷۷ء ص ۸۷
۱۷- اقبال کے ممدوح علما- ص ۷۶
۱۸- ہفت روزہ چٹان- لاہور- بابت ۲۵- اپریل ۱۹۴۹ء
۱۹- ہفت روزہ قندیل- لاہور بابت ۲۱- اپریل ۱۹۵۰ء

ضمیمہ — ۱

مکاتیب علامہ اقبال بنام مولانا ظفر علی خاں

مکتوب نمبر ۱۰

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب 'زمیندار'

عدن کے عنوان سے جناب قبلہ آنریبل مولوی جسٹس شاہ دین صاحب جج عدالت عالیہ پنجاب کی ایک نظم جو نہایت معنی خیز ہے' اتفاق سے میرے ہاتھ آ گئی ہے- یہ نظم جس کو اشاعت کے لیے آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں' مولوی صاحب موصوف نے ۱۵- اگست ۱۹۱۲ء کے روز لکھی تھی جب کہ وہ ولایت تشریف لے جا رہے تھے- عدن دیکھ کر ان کے قلب میں ان تمام روایات کی یاد تازہ ہو گئی جو اس سرزمین کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان اشعار میں ایک نہایت دلفریب طریق میں انہوں نے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں خوابیدہ یا بیدار ہیں- مجھے یقین ہے کہ یہ نظم نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی-

محمد اقبال

عدن

نہیں گو لائق توصیف منظر اے عدن تیرا
مگر تو ہے عرب میں اور یہی ہے بانکپن تیرا
مسلماں کی نظر میں پھول ہے خار چمن تیرا
زباں شیریں تری' مرغوب انداز سخن تیرا

پہاڑوں میں ترے غار حرا کا راز پنہاں ہے
کہاں وہ باب عالی ہے کہ تو اک جس کا درباں ہے

وہ دن ہیں یاد تجھ کو جب عجب دنیا کی حالت تھی
ہر اک قوم اور ملت غرق دریائے جہالت تھی
مشائخ میں حسد تھا اور قبیلوں میں عداوت تھی
عرب کی سرزمیں سب تشنہ آب اخوت تھی

یکایک جانب بطحا سے اٹھا ابر رحمت کا
ہرا کشتِ جہاں کو کر گیا دریا رسالت کا

صداقت ہو گئی عریاں کہ دنیا اس کو پہچانے
نہ بت خانے رہے باقی نہ بت خانوں کے افسانے
مہذب بن گئے علم و عمل سے تھے جو بیگانے
ہوئے ہم رشتہ پھر بکھری ہوئی تسبیح کے دانے

بنی آدم بنا انساں جہاں میں انقلاب آیا
سوال اولیں کا عرش اعظم سے جواب آیا

مگر افسوس فصل گل کا انجام آ گیا جلدی
مہ اسلام پر ابر تنزل چھا گیا جلدی
وہ مذہب قوم یخ بستہ کو جو گرما گیا جلدی
برنگ نور آیا بن کے پھر سایا۔ گیا جلدی

چمک کر چھپ گئی بجلی جہاں کی آنکھ حیراں ہے
جو تھا باغ ارم وہ آج اک اجڑا بیاباں ہے

عدن پھر تجھ میں آبادی کے آثار اب نمایاں ہیں
پھرے دن ان کے بھی اسلام کے جو خانہ ویراں ہیں
پڑے ہر سو نظر آتے جو کچھ تنکے پریشاں ہیں
عجب کیا خوش نما سے اک نشیمن کے یہ ساماں ہیں

ہمایوں اس چمن میں پھر بہار آئے عجب کیا ہے
نکل کر گرد سے اک شہسوار آئے عجب کیا ہے

(زمیندار۔ ۲۹۔ نومبر ۱۹۱۲ء)

مکتوب نمبر ۲

مخدومی جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار' السلام علیکم!

آج کے "زمیندار" میں جنرل کونسل انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ منعقدہ ۱۴/ نومبر ۲۰ء کی کارروائی پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے' اس میں ایک آدھ فروگزاشت ہو گئی ہے۔ جس کا ازالہ عام مسلمانوں کی آگاہی کے لیے ضروری ہے لہٰذا یہ چند سطور لکھتا ہوں مہربانی کر کے اپنے

اخبار میں درج فرما کر مجھے ممنون کیجئے۔

اراکین کونسل کے سامنے تین تجویزیں تھیں۔

(۱) اسلامیہ کالج لاہور کا الحاق یونیورسٹی پنجاب سے جاری رکھا جائے۔ محرک میاں فضل حسین صاحب سکرٹری کالج۔ موید مولوی فضل الدین صاحب وائس پریذیڈنٹ انجمن۔

(۲) انجمن حمایت اسلام لاہور اپنے طور پر علماء پنجاب و ہندوستان کی ایک کانفرنس کرے جس میں حالات حاضرہ سے واقف کار لوگ بطور مشیر کام کریں تاکہ حضرات علماء مسائل متنازعہ فیہ کے ہر پہلو پر پوری بحث و تمحیص کے بعد نتائج پر پہنچیں۔ علماء کی اس بحث میں مشیروں کو رائے دینے کا کوئی حق نہ ہو گا اور فیصلہ کثرت آراء سے ہو گا۔ اختتام کانفرنس تک اسلامیہ کالج کا الحاق یونیورسٹی سے قائم رہے۔ محرک مولوی ابراہیم سیالکوٹی۔

(۳) جمعیت علماء کا اجلاس دہلی میں عنقریب ہونے والا ہے' ان کے فتوے کا انتظار کیا جائے اور چند حضرات انجمن کی طرف سے بطور وفد اس جلسے کی بحث و مباحثہ میں شریک ہوں۔ محرک ڈاکٹر کچلو۔

پہلی تجویز میں قطعاً کوئی مباحثہ نہیں ہوا۔ نہ مذہبی نقطہ خیال سے نہ تعلیمی نقطہ نگاہ سے۔ اس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اگر ارکان کونسل مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس تجویز پر بحث مباحثہ نہیں کر سکتے' تو تعلیمی نقطۂ نگاہ سے اس پر معقول و مدلل بحث ہو سکتی ہے۔ عدم تعاون یا ترک موالات سے قطع نظر کر کے بھی تعلیم کو "نیشنلائز" کرنے کے دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ مولوی غلام محی الدین صاحب نے بھی صدر جلسہ سے اجازت بحث کی چاہی مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اجازت نہ دی۔ اصل بات یہ ہے کہ میاں صاحب کی تجویز کے فوراً بعد دوسری اور تیسری تجاویز پیش کر دی گئیں اور بحث انہیں تجاویز پر ہوتی رہی۔ بہر حال تجویز اول پر ووٹ لیے گئے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ کثرت آراء میاں فضل حسین کی تجویز کے حق میں تھی۔ ۲۱ ممبروں نے جن میں مولوی عبدالقادر صاحب قصوری' حاجی شمس الدین صاحب اور خاکسار شامل تھے ووٹ دینے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان ممبروں کی رائے میں معاملہ زیر بحث کا ایک نہایت اہم مذہبی پہلو ہے جس کا فیصلہ علماء سے استفتا کیے بغیر ایک ایسی انجمن کے لیے ناممکن ہے جو انجمن حمایت اسلام کے نام سے موسوم ہو۔ پہلی تجویز کے فیصلہ ہو جانے پر باقی دو تجاویز پر ووٹ لینا ضروری نہ سمجھا گیا۔ مذکورہ بالا ۲۱ ممبران میں سے بعض ڈاکٹر کچلو صاحب کی تجویز کے موید تھے اور بعض مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کے موید تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کے مطابق انجمن خود علماء کی ایک کانفرنس مدعو کرے تاکہ اس نازک مسئلے کے ہر پہلو پر پوری بحث

ہو سکے- جو فتوے دفتر انجمن میں موصول ہوئے ہیں ان کو حضرات علماء سے فرداً فرداً حاصل کیا گیا ہے اور نیز بعض نہایت ضروری سوالات ان سے پوچھے ہی نہیں گئے مثلاً حضرت مولانا محمود الحسن کے فتویٰ میں الحاق کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا گیا- اسی طرح مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی خانقاہ کا فتویٰ یا مضمون ترک موالات کے مسئلے پر ایک عام بحث ہے جس میں استفتا بھی درج نہیں- علیٰ ہذا القیاس علمائے سندھ کے فتوے میں زر امداد یا الحاق کے متعلق کوئی سوال علماء سے نہیں کیا گیا- کفار سے ترک موالات مسلمانوں کے لیے کوئی نیا حکم نہیں اور اس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا- ہاں اس کے مدارج اور جزویات مختلف ہیں- کفار محارب ہوں تو ان کے لیے اور احکام ہیں' غیر محارب ہوں تو ان کے لیے اور احکام ہیں- اس فرق کو کسی فتوے میں نمایاں نہیں کیا گیا جس سے میرے خیال میں سخت غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے-

مثلاً آج شام ہی میں نے ایک دوست سے سنا کہ پروفیسر حاکم علی صاحب اسلامیہ کالج نے اپنے فتوے کی تصدیق میں مولوی احمد رضا صاحب بریلوی سے ایک فتویٰ حاصل کیا ہے- پروفیسر صاحب خود بریلی تشریف لے گئے تھے- لاہور واپس آنے پر انہوں نے مولوی اصغر علی صاحب روحی سے استدعا کی کہ وہ بھی مولوی احمد رضا صاحب کے فتویٰ پر دستخط کریں لیکن چونکہ حضرات دیوبند و مولوی اشرف علی تھانوی پر اس فتوے میں سب و شتم کیا گیا تھا اس واسطے مولوی اصغر علی صاحب روحی نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا- حاکم علی صاحب آنریبل میاں فضل حسین سے ایک دستی خط لے کر پھر مولوی احمد رضا صاحب کی خدمت میں پہنچے اور ان سے التماس کی کہ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ علمائے دیوبند وغیرہ پر جو لے دے آپ نے اپنے فتوے میں کی ہے' اسے فتوے سے نکال ڈالیے' لیکن مولوی صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور میاں صاحب کے خط کے جواب میں کہا کہ وہ سب لوگ مرتد ہیں- میرے دوست نے یہ فتویٰ خود پڑھا ہے اور مولوی احمد رضا صاحب کا وہ خط بھی دیکھا ہے جو مولوی موصوف نے میاں صاحب کے جواب میں لکھا ہے- خیر یہ تو جزوی امور تھے- میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ آیا اس فتوے میں محارب و غیر محارب کفار کا امتیاز کیا گیا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں- اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ضروری سوالات ہی نہ کیے جائیں تو مفتی کا کیا قصور ہے-

اس امتیاز کے علاوہ بعض نہایت اہم اقتصادی سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا پوچھنا مفتی سے ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے لیے ایک پورا نظام عمل مرتب ہو اور ہر خیال کے مسلمان پر اتمام حجت ہو سکے- غرض یہ کہ جس طرح مفتی کے لیے علم و تقویٰ کے ضروری شرائط ہیں اسی طرح مفتی کے علم سے مستفیض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سائل نکتہ رس' معاملہ فہم اور زیرک

ہو- بالخصوص ایک ایسے معاملے میں جس کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر پڑتا ہو' پوری چھان بین اور تحقیق و تدقیق ضروری ہے اور اس تحقیق و تدقیق کے لیے بھی وہی راہ اختیار کرنی چاہئے جو شریعت حقہ نے بتائی ہے- فرداً فرداً فتویٰ لینے سے کبھی کام نہ نکلے گا- اس وقت مسلمانوں کی بدنصیبی سے اس ملک میں یا اور اسلامی ممالک میں کوئی واجب الاطاعۃ امام موجود نہیں- مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے فرمایا تھا کہ واجب الاطاعۃ امام نہ ہونے کی صورت میں خلافت کمیٹی کا فتویٰ واجب الاطاعۃ ہے میں نے ان کے دلائل نہیں سنے- اس وقت تک مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں- ممکن ہے ان کے دلائل سننے کے بعد میری رائے بدل جائے- فی الحال تو میرے نزدیک یہی راہ کھلی ہے اور یہی راہ شریعت کی رو سے بھی انسب و اولیٰ ہے کہ حضرات علماء ایک جگہ جمع ہو کر ہر قسم کا اعتراض سننے اور پورے بحث و مباحثے کے بعد مسلمانوں کے لیے ترک موالات کا ایک پروگرام مرتب کریں- اس جمعیت میں حضرات مشائخ' بڑے بڑے حنفی علماء اور اگر ضروری ہو تو شیعہ اور اہل حدیث علماء بھی جن کے علم و تقویٰ پر قوم کو اعتماد ہو' طلب کیے جائیں- میرے خیال میں ایسے حضرات کا انتخاب کوئی مشکل امر نہیں- مسلمان وکلاء بھی اس بحث میں شریک ہو کر کم از کم سائل کی حیثیت سے مدد دیں- حضرات علماء کے لیے بھی یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ آپس کے اختلافات کو رفع کر کے امت مرحومہ پر اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کریں- خدا تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ یہ بھٹکا ہوا آہو پھر خود بخود حرم کی طرف آ رہا ہے-

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز

ایسے حالات قوموں کی زندگی میں شاذ ہی پیدا ہوا کرتے ہیں اور اگر ان حالات سے حضرات مشائخ و علماء نے فائدہ نہ اٹھایا اور مسلمانوں کی رہنمائی کر کے ان کو اپنے بچھڑے ہوئے محبوب یعنی شریعت حقہ اسلامیہ سے نہ ملا دیا تو اس ملک میں مسلمانوں کا بحیثیت ایک مذہبی جماعت کے خاتمہ تصور کرنا چاہئے اور وہ مسلمانان ہند کی اس ہلاکت کے لیے قیامت کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے سامنے جواب دہ ہوں گے اگر اس کانفرنس میں علماء کے انتخاب اور اس کے مجموعی عمل میں دیانت و امانت سے کام لیا گیا تو مسلمانان ہند کی زندگی میں وہ عظیم اخلاقی اور روحانی انقلاب پیدا ہو گا' جس کے لیے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی روح تڑپتی تھی-

میں جانتا ہوں کہ اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے وقت اور روپیہ کی ضرورت ہے لیکن ایسے اہم مسئلے کے تصفیہ کے لیے وقت اور روپے کا سوال خارج از بحث ہے اراکین جنرل کونسل نے تو یہ سلامتی کی راہ اختیار نہیں کی اور حمایت اسلام کہلا کر بے دردی سے اسلام کو

نظرانداز کر دیا ہے لیکن مسلمانان پنجاب سے میری التماس ہے کہ وہ اس کام کو توکل بخدا اپنے ذمہ لیں اور لاہور یا باہر کے مسلمانوں میں سے کوئی اللہ کا بندہ اور نبی امی کا عاشق ایسا نکلے کہ اس کانفرنس کا تمام خرچ اپنے ذمہ لے لے۔ اس کا یہ خرچ بیکار نہ جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس پر فلاح و برکت کے دروازے کھول دے گا اور آخرت میں وہ اس کی بارگاہ میں باریاب ہو گا جس کی آستان بوسی کو دنیا کے عظیم ترین شہنشاہوں نے اپنا طغرائے امتیاز تصور کیا ہے۔

شاید آپ کے بعض ناظرین کے دل میں یہ خیال گزرے کہ جب جمعیت علماء کا جلسہ دہلی میں عنقریب ہونے والا ہے تو ایسی کانفرنس قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر کچلو صاحب کی تجویز میں سردست کسی خرچ اور وقت کی ضرورت نہیں لیکن جب جنرل کونسل میں ان تجاویز پر بحث ہو رہی تھی تو بعض صاحبان کی گفتگو سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ دہلی کی کانفرنس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس بناء پر کہ یہ کانفرنس ایک خاص خیال کے علماء کا مجموعہ ہو گی۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اس خیال کے اور بھی مسلمان ہیں اور میں مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کی اس بناء پر تائید کرتا ہوں کہ کوئی شائبہ بھی کسی قسم کے شک و ظن کا نہ رہے اور ایک ایسی کانفرنس قائم کی جائے جس کا فتویٰ ہر خیال کے مسلمانوں کے لیے حجت ہو اور کسی کو بھی کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہ رہے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالات حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور پختہ کاران سیاست ہی اس کے فیصلہ کے اہل ہیں اور مسندنشینان پیغمبر کو ان حالات سے کچھ سروکار نہیں' وہ میری رائے ناقص میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر فقہائے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو اگر مسلمان اس خدا کے دیے ہوئے قانون سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی بدنصیبی ہے۔ شارع امی (بابی انت و امی) نے تو وہ اصول بتائے ہیں کہ ان کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہا کا تفقہ جس پر ہمارے وکیلوں اور بیرسٹروں کو ناز ہے ایک طفل مکتب کی ابجد خوانی نظر آتا ہے۔

رسالت محمدیہ کا مقصد صرف یہی نہیں کہ بندوں کو اپنے رب سے ملائے بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بندوں کو اس چار عناصر کی دنیا میں رہنے اور انفرادی و ملی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مکمل آئین بھی عطا فرمائے اور یہ آئین خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس وقت تک مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے۔ اس سے مستفید ہونے کے لیے قوت استدلال اور پاکیزگی

عمل کی ضرورت ہے اور ان اوصاف کی متاع گراں مایہ ابھی تک بکلی مفقود نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے لیے نہ مسٹر گاندھی کی زندگی اسوہ حسنہ ہے نہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہدایت نامہ ان کے لیے دلیل راہ ہو سکتا ہے۔ ان کو اپنے ہر فعل کے لیے خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں نظام کار تلاش کرنا چاہئے اور جو نظام کار ان دو مواخذ سے ملے اسی پر عمل پیرا ہونا چاہئے اور اس بات کا خیال تک بھی نہ کرنا چاہئے کہ ان کا نظام عمل مسٹر گاندھی کے پروگرام کے مطابق ہے یا اس سے مختلف ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس وقت جو معاملات زیر بحث ہیں محض سیاسی ہیں وہ جمعیت اسلامیہ کی ہیئت اور اس کے مقاصد سے بالکل بے خبر ہیں۔ اسلام کے نزدیک مسلمان کا کوئی فعل انفرادی ہو یا اجتماعی مذہب کی ہمہ گیری سے آزاد نہیں اور برخلاف دیگر مذاہب کے اسلام نے زندگی کے ہر پہلو کے لیے احکام وضع کیے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے عقیدے کی رو سے انفرادی، ملی اور بین الملی قانون کا اصل الاصول الہام الہی پر مبنی ہے اور اسلام کا ہر فعل اگر اس کا محرک اللہ اور رسول کی رضا جوئی ہے تو وہی فعل قرب الہی کا باعث ہے۔ خواہ اس کا اثر فاعل کی اپنی ذات پر پڑتا ہو خواہ دیگر اقوام پر۔ وہ سیاست جو مذہب سے معرا ہو ضلالت و گمراہی ہے اور وہ مذہب جو اپنے احکام میں تمام ضروریات انسانی کو ملحوظ نہیں رکھتا ایک قسم کی ناقص رہبانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مغربی خیالات ایک نامحسوس زہر کی طرح ہمارے دماغوں میں سرایت کر گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ نوجوان بے تحاشا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں اور قوم کو بھی اسی پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ یہ خیال کم از کم اسلام کے لیے زہر قاتل ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود یورپ کے حکماء جو اس خیال کے بانی ہیں اور جن سے ہمارے نوجوانوں نے یہ سبق سیکھا ہے اب اس ہیبت ناک جنگ کے بعد جو اسی شیطانی اصول کا نتیجہ تھی اس خیال کی صحت میں متامل نظر آتے ہیں۔

افسوس ہے کہ اراکین انجمن حمایت اسلام نے بھی معاملات زیر بحث کے فیصلہ میں اسی اصول پر عمل کیا ہے مجھے ان سے یہ شکایت نہیں کہ انہوں نے کیوں الحاق کی تجویز پاس کی بلکہ یہ شکایت ہے کہ انہوں نے کیوں فیصلہ کرنے سے پیشتر فقہائے اسلام سے استصواب نہیں کیا اگر تمام حالات کو سننے کے بعد فقہائے اسلام کی یہی رائے ہو کہ الحاق قائم رکھا جائے تو میں بھی نہایت خوشی کے ساتھ اراکین انجمن کا ہم نواہوں قطع نظر اس کے کہ انہوں نے اپنا ایک اہم مذہبی فرض ادا نہیں کیا۔ میری رائے ناقص میں اس سوال کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کر دینے

سے اراکین کونسل نے خود انجمن کے لیے ایک زندگی و موت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔

میں نے آپ کے اخبار کی بہت سی جگہ لے لی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ فراخدلی سے مجھے معاف فرمائیں گے۔ اب میں اس طویل خط کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا حامی و ناصر ہو اور اپنے حبیب پاک کے صدقے میں ان کی تمام مشکلات کا خاتمہ کرے۔

۱۵۔ نومبر ۱۹۲۰ء

آپ کا مخلص

محمد اقبال

روزنامہ زمیندار ۱۸۔ نومبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۱، ۲ نیز اقبال اور انجمن حمایت اسلام مرتبہ محمد حنیف شاہد۔ شاہد صاحب کی مرتبہ کتاب میں اس خط کا متن متعدد اغلاط کی وجہ سے خاصا مجروح ہو گیا ہے۔

مکتوب نمبر ۳

۲۳۔ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ "زمیندار" میں "انقلاب" کے سابق مدیر شمس الدین حسن کا ایک مضمون شائع ہوا (موصوف سرگرم اشتراکی تھے۔ "انقلاب ان کے بقول" اشتراکی خیالات کی تبلیغ کے لیے نکالا گیا تھا مگر جلد ہی مالی خسارے اور محدود دائرہ مقبولیت کی وجہ سے بند ہو گیا) جس میں انہوں نے کامریڈ غلام حسین کا دفاع کرتے ہوئے (کامریڈ غلام حسین ایڈورڈز کالج پشاور میں استاد تھے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے اور "انقلاب" کی پالیسیوں میں شریک کار رہے ۱۹۲۳ء میں بالشویک سازش کے مقدمے میں گرفتار ہوئے) یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اشتراکیت کی حمایت کوئی جرم نہیں کیونکہ علامہ اقبال بھی بالشویک خیالات رکھتے ہیں۔ انہوں نے لکھا: "بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاست کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ بھی ہیں، پیام مشرق میں "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" اور "نوائے وقت" کے عنوان سے جو مختصر سی نظمیں لکھی ہیں

ان سے قطع نظر کر کے ص ۱۵۶ کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزو ست
بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزو ست

کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں ہیں۔ (زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء ص ۳)

"زمیندار" میں مذکورہ بالا مضمون چھپا تو علامہ اقبال کو کسی نے اطلاع دی کہ آپ سے "بالشویک خیالات" منسوب کیے گئے ہیں۔ علامہ موصوف کی نظر سے مذکورہ بالا مضمون یا اخبار نہ گزرا تھا اور انہیں اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ ان سے بالشویک خیالات منسوب کرنے والے صاحب کون ہیں۔

بہرحال "بالشویک خیال" سے اعلان برات کے لیے انہوں نے بلا تاخیر' اسی روز ذیل کا مفصل مضمون مدیر "زمیندار" کے نام ارسال کیا جو اگلے روز اخبار میں شائع ہوا۔

مکرم بندہ جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار'

السلام علیکم! میں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بولشویک خیالات منسوب کئے ہیں۔ چونکہ بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث' حرمت ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بولشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ

داری اور روسی بولشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بناء پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کے قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے "فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ یورپ اس نکتہ کو نظر انداز کر کے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجود نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانمی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔

محمد اقبال

بیرسٹرایٹ لاء، لاہور

مکتوب نمبر ۴

نومبر ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل (مجلس قانون ساز پنجاب) کا انتخاب ہونے والا تھا۔ علامہ اقبال طبعاً" سیاسی سرگرمیوں اور ہنگاموں سے چنداں دلچسپی نہ رکھتے تھے تاہم دوستوں اور مداحوں کے اصرار پر انہیں انتخاب میں حصہ لینا پڑا۔ ان کے مداح دوست چاہتے تھے کہ وہ بلا مقابلہ ممبر منتخب ہو جائیں مگر تین حضرات (میاں عبدالعزیز ملک محمد حسین اور خان بہادر ملک محمد دین) ان کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے' دوستوں کے سمجھانے بجھانے پر میاں عبدالعزیز نے اپنا نام واپس لے لیا۔ بعد ازاں بلدیہ کے صدر ملک محمد حسین بھی علامہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ان کا اعلان دستبرداری ۳ اکتوبر کے "زمیندار" میں شائع ہوا تو علامہ موصوف نے ذیل کا مکتوب ایڈیٹر "زمیندار" کو بغرض اشاعت ارسال کیا۔

خان بہادر ملک محمد دین بیرسٹر ایٹ لاء آخر وقت تک مقابلے پر ڈٹے رہے۔ ان کا تعلق ارائیں برادری سے تھا۔ بعض نمایاں اصحاب مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولوی محرم علی چشتی نے بھی اقبال کے خلاف کام کیا مگر علامہ موصوف بفضل تعالیٰ خان بہادر کو تین ہزار دونوں کی اکثریت سے شکست دے کر ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہو گئے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

جناب ایڈیٹر صاحب 'زمیندار'

السلام علیکم!

آج آپ کے پرچے میں یہ خبر پڑھ کر کہ ملک محمد حسین صاحب صدر بلدیہ لاہور' پنجاب کونسل کی امیدواری سے میرے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں' مجھے بہت مسرت ہوئی۔ میں ملک صاحب کی اس عنایت فرمائی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اور ان کے اس جذبے کو بے انتہا قابل تعریف سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں میں برادریوں کے افتراق کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور اتحاد مسلمین کے مقصد عزیز کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اسی قسم کی درد مندی اور ایسے ہی ایثار کی توفیق بخشے۔"

لاہور ۳۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء

محمد اقبال

(خطوط اقبال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

مکتوب نمبر ۵

ادارہ 'زمیندار' کے رسیدی نوٹ کے ساتھ حضرت علامہ کا مکتوب ذیل ۱۵- مئی ۱۹۲۷ء کے زمیندار میں شائع ہوا- یہ مکتوب فسادات لاہور (مئی ۱۹۲۷ء) کے سلسلہ میں تحریر کیا گیا- لاہور ۱۴- مئی ہمیں جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرف سے ذیل کا مکتوب موصول ہوا ہے- (ادارہ زمیندار)

"مسلمانان مزنگ نے مسلم ریلیف کمیٹی کو اس سے پہلے پانسو روپیہ کی رقم بھیجی ہے- آج دوسری قسط سات سو روپے کی بذریعہ چک ان کی طرف سے موصول ہوئی ہے- یہ بارہ سو روپے کی رقم خان بہادر میاں چراغ الدین صاحب اور ان کے احباب کی مساعی کا نتیجہ ہے- میں تمام مسلمانان شہر لاہور کی طرف سے میاں صاحب موصوف اور ان کے احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں- خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے- محمد اقبال-"

مکتوب نمبر ۶

تحریک خلافت اور ترک موالات کی ناکامی کے ساتھ ملک بھر میں فرقہ وارانہ تعصب اور فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا- لاہور میں بھی وسیع پیمانے پر ہنگامے ہوئے اور لاتعداد نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا- مظلومین کی امداد کے لیے "مسلم ریلیف فنڈ کمیٹی" قائم کی گئی- مخیر اور اسلامی حمیت رکھنے والے مسلمانوں نے دل کھول کر چندے دیئے- ملک محمد حسین کو سرکار کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب ملنے پر ککے زئی برادری نے انہیں پارٹی دینے کے لیے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم جمع کی تھی- ملک صاحب کے ایما پر یہ رقم "مسلم ریلیف فنڈ کمیٹی" کو بھیج دی گئی- ملک صاحب کے اس قابل تقلید ایثار سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے حسب ذیل مکتوب ایڈیٹر کے نام تحریر فرمایا:

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار

السلام علیکم- مسلمانان لاہور کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج ککے زئی برادری کی طرف سے مبلغ ایک ہزار روپیہ "مسلم ریلیف فنڈ کمیٹی" کو عطا کیا گیا ہے- یہ روپیہ برادری مذکور نے خان بہادر ملک محمد حسین صاحب پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی لاہور کو حکومت کی طرف سے خطاب ملنے کے موقع پر ان کی دعوت کے لیے جمع کیا تھا- میں اہل لاہور کی طرف سے ملک صاحب موصوف اور ان کی برادری کو اس بلند ہمتی پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ

انہوں نے مسلمانان لاہور کی فوری ضروریات کو مقدم سمجھا اور سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ یہ رقم خطیر اعانت مجروحین و مظلومین کے لیے دے دی جائے۔ اس روپیہ کو پہلی قسط تصور کرنا چاہئے۔ ملک صاحب کے وارڈ میں الگ چندہ ہو رہا ہے جو عنقریب وصول ہو گا۔
اللہ احسن الجزاء

ڈاکٹر سر محمد اقبال
(زمیندار۔ ۳۱ مئی ۱۹۲۷ء
نیز نقوش اقبال نمبر ۱۹۷۷ء ص ۴۸۸۔ ۴۸۹)

مکتوب نمبر ۷

مسلمانان اندور کی اعانت

۱۹۲۷ء میں مسلمانان اندور کی اعانت کے لیے مسلم ریلیف کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ملک بھر کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد کی۔ یہی نہیں بیرون ملک سے بھی مسلمانوں نے اندور کے مسلمانوں کے لیے رقوم بھیجیں۔ ایسی ہی دو رقوم آبادان (ایران) کے ہندی مسلمانوں نے علامہ اقبال کی معرفت ارسال کیں۔ جو انہوں نے حبیب دار خاں، جائنٹ سیکرٹری مسلم ریلیف کمیٹی اندور کو بھجوا دیں۔ مندرجہ ذیل خط علامہ اقبال نے اسی ضمن میں ایڈیٹر زمیندار کے نام ارسال فرمایا جس میں تحریر فرمایا:

لاہور
۲۷۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار

السلام علیکم۔ "آبادان" (ایران) کے ہندی مسلمانوں نے جو رقوم میری معرفت "اندور" کے مسلمانوں کی اعانت کے لیے ارسال کی تھیں، وہ ان کو پہنچ گئی ہیں اور باقاعدہ رسیدیں مسلم ریلیف کمیٹی اندور کی طرف سے موصول ہو گئی ہیں اور ساتھ ہی ایک خط بھی حبیب دار خاں صاحب جائنٹ سکرٹری ریلیف کمیٹی کی طرف سے موصول ہوا ہے جس میں مندرجہ ذیل اقتباس اپنے اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں چھاپ کر ممنون فرمائیں۔

"مورخہ ۴۔ اکتوبر و ۲۰۔ اکتوبر کو مبلغ تین سو اور ڈھائی سو روپیہ کی دو رجسٹریاں یکے بعد دیگرے موصول ہوئیں.... یہ دونوں رجسٹریاں ایسے آڑے وقت پر پہنچی ہیں کہ کمیٹی کو ایک پیسہ بھی مہیا کرنا محال تھا۔ اس امداد غیبی کے پہنچنے سے جو خوشی ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے لیکن ان

تمام مسرتوں سے زائد جس شے نے دل کو قوی کیا وہ یہ تھی کہ اب بھی مسلمانوں میں اسلامی حمیت باقی ہے کہ کوسوں دور بیٹھے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی حالت زار کو فراموش نہیں کرتے۔ خداوند کریم ہمارے آبادان کے بھائیوں کو آباد شاد رکھے اور انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔"

رسیدات منسلک ہذا ہیں۔ ہم جناب سے ملتجی ہیں کہ جناب ہماری جانب سے ایک شکریہ کا خط ان بھائیوں کے نام ضرور تحریر فرمائیں۔

مخلص (سر) محمد اقبال

(روزنامہ زمیندار ۶۔ نومبر ۱۹۲۷' ص ۵۔ نیز نقوش اقبال نمبر ۱۹۷۷ء ص ۴۸۹)

مکتوب نمبر ۸

بخدمت مولانا غلام مرشد' مولانا احمد علی' مولانا ظفر علی خاں' سید حبیب' مولوی نور الحق' سید عبدالقادر' مولانا مہر صاحبان

جناب مکرم

السلام علیکم۔ ایک نہایت ضروری امر میں مشورہ کرنا ہے۔ آج آٹھ بجے شام غریب خانہ پر تشریف لا کر مجھے ممنون فرمایئے۔ مشورہ طلب امر نہایت ضروری ہے۔ امید کہ آپ تکلیف معاف فرمائیں گے۔

مخلص محمد اقبال۔ بیرسٹر لاہور

۵۔ ستمبر ۲۹ء

(انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۹۳۔۹۴)

مکتوب نمبر ۹

لاہور ۲۶۔ جون ۱۹۳۲ء

ڈیر مولانا ظفر علی خاں۔ السلام علیکم "زمیندار" کے تین نمبر جو آپ نے بہ کمال عنایت ارسال فرمائے تھے' مجھے مل گئے ہیں۔ اس عنایت کے لیے بہت شکرگزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ زمیندار کے اجرائے مکرر سے ملک کے ادب' صحافت اور سیاسیات میں مزید اضافہ ہو گا۔ جو تجویز آپ نے اس کے بنیاد کو زیادہ مضبوط کرانے کے لیے اختیار کی ہے' میں اس کی کامیابی کے لیے دست بدعا ہوں۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص محمد اقبال

(زمیندار ۲۹- جون ۱۹۳۲ء)

مکتوب نمبر ۱۰

۱۹۳۳ء میں روزنامہ زمیندار تحفظ ختم نبوت کی پاداش میں عارضی طور پر بند رہنے کے بعد پھر جاری ہوا تو حضرت علامہ نے ۸- جولائی ۱۹۳۳ء کو مولانا ظفر علی خاں کو یہ خط لکھا۔

ڈیر مولانا ظفر علی خاں

السلام علیکم- زمیندار کی حیات ثانیہ مبارک ہو- امید ہے کہ گزشتہ تجربہ نے آپ کو موجودہ حالت اور اس کے مقتضیات کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد دی ہو گی- میں آپ کے لیے دست بدعا ہوں-

محمد اقبال

(زمیندار- ۱۰- جولائی ۱۹۳۳ء)

ضمیمہ — ۲

نگارشات مولانا ظفر علی خاں

بہ سلسلہ علامہ اقبال

علامہ اقبال کی شاعری

مولانا ظفر علی خاں

یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور سے ۱۳ جنوری ۱۹۳۸ء کو نشر کی گئی تھی! (مدیر پیغام حق)

فلسفہ شعر

خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ لطف و کرم سے انسان کو جو گوناگوں ملکات مرحمت ہوئے ہیں' ان میں سے ایک کا نام شاعری ہے۔ شاعری کی تعریف مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے حکماء نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔

یونان کا زاویہ نگاہ

یونانیوں کا نقطہ نظر ارسطو نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ شاعری ایک قسم کی اعلیٰ مصوری ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف بیرونی دنیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے لیکن شاعر اس اندرونی دنیا کی تصویر کھینچنے پر بھی قادر ہے۔ جس میں خیالات' جذبات اور احساسات آباد ہیں' چمکتا ہوا سورج' دمکتے ہوئے ستارے' کوندتی ہوئی بجلی' گرجتے ہوئے بادل' پھیلتا ہوا صحرا' بہتا ہوا دریا' لہکتا ہوا سبزہ' چہکتا ہوا بلبل' آسمان کی پہنائی' زمین کی گیرائی' ہوا کا فراٹا' جنگل کا سناٹا' معشوق کا ناز' عاشق کا نیاز' وصل کی گھاتیں' ہجر کی راتیں' محبت کے کرشمے' عداوت کے افسوں' خوشی کے قہقہے' غم کی کہانیاں' پامردی کا ماجرا' نامردی کی داستان' یہ اور ان جیسی ان گنت باتیں موزوں الفاظ میں جن کے ساتھ ساتھ ترنم بھی ہو' اگر اس انداز سے بیان کی جائیں کہ سننے والوں کی آنکھوں میں ان کی صورت پھر جائے اور دلوں میں ان کا اثر اتر جائے تو اسی کو شاعری کہا جاتا ہے۔

عرب کا نقطۂ نظر

پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کے دربار کے شاعر حسانؓ بن ثابت کے کمسن بچے کو ایک دن بھڑ نے کاٹ کھایا' وہ روتا ہوا باپ کے پاس پہنچا- حسانؓ نے کاٹنے والے جانور کا نام پوچھا- بچہ نام نہ جانتا تھا- کہنے لگا کہ مجھے جس جانور نے کاٹا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دوزرد دھاری دار چادروں میں لپٹا ہوا تھا- بھڑ کے پروں پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں- لہٰذا اس سے بہتر تشبیہ ہو نہیں سکتی- حسانؓ فرط مسرت سے پکار اٹھا کہ خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا- بچہ کا کلام موزوں نہ تھا لیکن ازبسکہ تشبیہ تام تھی اور برجستہ تھی' حسانؓ نے خیال کیا کہ ان کے بیٹے میں شعر کہنے کی قابلیت موجود ہے- شاعری کے متعلق یہ عرب کا زاویہ نگاہ تھا-

شعر کی حقیقت ایران کی نظر میں

فردوسی ابھی چار سال کا بچہ تھا کہ گھر میں مرغی نے انڈا دیا باہر مردانہ میں اس کا باپ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا- فردوسی دوڑتا ہوا آیا اور بے ساختہ پکارا کہ

بابا بابا ماکیاں درخانہ مابیضہ داد

فردوسی کے باپ کے ایک سخن شناس دوست نے جو شریک محفل تھا اس برجستہ فقرہ پر جس کی موزونیت اپنا جواب آپ تھی' باپ کو یہ کہہ کر کہ مبارک باد دی کہ تمہارا بیٹا بڑا ہو کر دنیائے سخن کا تاجدار ہو گا- اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایران میں قدما کے نزدیک شاعری کی کیا حقیقت تھی-

علامہ شبلی نعمانی کا نظریہ

علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب شعر العجم میں شاعر کی تعریف یوں کی ہے :

"دنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں' خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ' بیاباں' باغ دریا وغیرہ- خواہ غیر مادی' وصل' ہجر' تحسین' نفرین- ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں بعض اشخاص پر کم بعض پر زیادہ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اس اثر کو الفاظ سے ادا کر سکتا ہو وہی شاعر ہے-"

اس تعریف میں علامہ ممدوح نے اپنے نکتہ سنج بھائی مولانا حمید الدین مرحوم کے اس بیان کا

اضافہ کر دیا کہ شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے۔

شعر کی حقیقت

شعر کی جو حقیقت میں سمجھا ہوں وہ بھی ملاحظہ ہو۔

شعر کیا ہے خیال کی تصویر بال اور اس کی کمال کی تصویر
نہ فقط نقش عارض زیبا نہ فقط خط و خال کی تصویر
بلکہ کل کائنات کی رونق اور اس کے جمال کی تصویر
سوز کی اور ساز کی تمثال ہجر کی اور وصال کی تصویر
ملتوں کی حیات کا نقشہ امتوں کے مال کی تصویر
چند الفاظ دل کش آ جائیں
بن کے سحر حلال کی تصویر

اقبال جس کے کلام کے ایک حصہ پر مجھے اس وقت تبصرہ کرنا مقصود ہے، شاعری کے اس معیار پر پورا اترتا ہے اور اس کی ذات میں تمام وہ صفات جمع ہیں، جن سے متصف ہو کر کوئی جادو نگار شاعر ان تمام حقیقتوں کے روشن چہرہ سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔ جن کے جلوے فرش سے لے کر عرش تک بکھرے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے باکمال صورت گر روز روز پیدا نہیں ہوتے ان کا انتظار حق نگر نگاہوں کو مدتوں کرنا پڑتا ہے۔

قرنہا باید کہ تایک مرد حق پیدا شود
بوسعیدؒ اندر خراساں یا اویسؒ اندر قرن
عمرہا باید کہ تایک کودکے از لطف طبع
فارس میدان شود یا شاعر شیریں سخن

غالب کے بعد اقبال

غالب کے بعد میری رائے میں اقبال وہ پہلا شاعر ہے جس کی حکیمانہ ژرف نگاہی نے ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چھپی اور کھلی حقیقت کا جائزہ لیا۔ اس نے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے گوشہ گوشہ کو ٹٹولا اور اس کا کوئی راز اس کی عقابی نگاہ سے اوجھل نہ رہ سکا۔ اس کا طائر فکر زمین سے اڑا اور بیک پرواز آسمانوں کی اس نورانی خلوت گاہ تک جا پہنچا جس کے قریب فرشتوں کو بھی پر مارنے کی مجال نہیں۔ جہان باطن اور جہان ظاہر کی اس دوگونہ سیر میں اس نے

جو کچھ دیکھا اس کی تفصیل اسی کے فسوں ساز موقلم کا حصہ ہے۔

اقبال فن شاعری کا امام ہے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے اس کی طبع موزوں کو جو موقعے نصیب ہوئے' وہ دوسروں کو کم ملتے ہیں۔ اس کو مشرق اور مغرب کی کئی علمی زبانوں پر عبور کامل حاصل ہے اردو کی طرح فارسی میں بھی وہ اپنے خیالات اس بے تکلفی اور روانی کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ غالب کی غلطی اس سے سرزد ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جس نے اپنی مادری زبان کو بنگاہ حقارت دیکھ کر اور زور طبع کا بیشتر حصہ فارسی کے لیے وقف کر کے کہا تھا کہ :

فارسی بیں تا بہ بنی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

ہفت زبان اقبال اور اردو

اگر اقبال نکتہ سنج احباب کے اصرار کے باوجود صرف فارسی ہی کا ہو رہتا' اور اس کے حکیمانہ خیالات کا ذریعہ اظہار "اسرار خودی" "رموز بیخودی" اور "پیام مشرق" ہی جیسی بدیع المنزلت تصانیف ہوا کرتیں تو "آل انڈیا ریڈیو" کے کارپردازوں کو مجھ سے یہ فرمائش کرنے کی نوبت نہ آتی کہ "ضرب کلیم" اور "بال جبریل" پر تنقید کے لیے قلم اٹھاؤں جو "بانگ درا" کے بعد اقبال کی قادر الکلامی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور جرمن زبانوں میں اقبال نے مدتوں جرمنی اور انگلستان میں رہ کر دستگاہ وافی بہم پہنچائی ہے۔ عربی کی دولت سے بھی اس کا گنج شائگاں خالی نہیں۔ اس طور پر مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کے تمام اسرار کی کلید اقبال کے ہاتھ میں آ گئی۔

اور دنیا اگر اسے ترجمان حقیقت یا حکیم مشرق کا پرغرور لقب دیتی ہے تو وہ اس لقب کا ہر طرح سے سزاوار ہے۔

اقبال کی ساری شاعرانہ زندگی پر تبصرہ کرنے کے لیے ضخیم دفتر چاہئے۔ جس کے کھولنے کی اس مختصر سی صحبت میں مطلق گنجائش نہیں۔ اس لیے ان انمول موتیوں میں سے جو اس کی راہ میں بکھرے پڑے ہیں۔ صرف چند دردانوں کے رولنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اقبال اور وطنیت

اقبال جس وطن میں بستا ہے' وہ زمان اور مکان اور نسل اور رنگ اور اونچ اور نیچ کی حدود سے بہت پرے واقع ہوا ہے۔ خدا کا جو تصور اس کے دماغ میں ہے وہ عجمی نہیں بلکہ عربی ہے۔

جس طرز زندگی کے اختیار کرنے کی تعلیم وہ دنیا کو دیتا ہے- وہ بادشہانہ نہیں بلکہ قلندرانہ ہے- اسلام کے ساتھ اس جہت سے کہ وہ اقوام عالم کی باہمی عداوتوں اور تفرقوں کا قلع قمع کرنے اور انہیں مساوات و اخوت کی ریشمی ڈوری سے باندھنے آیا' اس کی والہانہ محبت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ہے' اور اسی لیے مغرب اسے ترجمان اسلام کا لقب دیتا ہے لیکن یہ ساری حقیقتیں بتدریج اس پر منکشف ہوئیں- اول اول وہ بھی ویسا ہی خالی وطن پرست تھا- جیسا دنیا کے اور وطن پرست ہوتے ہیں اور ہم اسے یہ ترانہ گاتے ہوئے سنتے ہیں-

وطنیت کا پہلا تصور

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

لیکن زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھنے والا اقبال اس بت کو یوں توڑتا ہوا دیکھا گیا:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وطنیت کے پہلے تصور سے اس شدید بیزاری کی وجہ اقبال نے یہ بیان کی ہے:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

محبت کی اچھوتی تصویر

نظام عالم کو جس ہمہ گیر اور ہمہ رس آسمانی کشش نے ربط دے رکھا ہے' اسے اہل نظر کی اصطلاح میں محبت کہتے ہیں- اس مقناطیسی جذبہ کی گہرائی کے گن ہر زمانہ میں ہر قوم نے گائے ہیں- انگلستان کا شہرہ آفاق شاعر اور فسانہ نویس سر والٹر اسکاٹ کہتا ہے کہ :

Love is heaven and heaven is love

ایران کے سحر نگار شاعر عرفی نے محبت کی سرگرمیوں کی بے پناہی کی کیفیت یوں بیان کی ہے :

گر محبت حملہ بر ناموس کفار آورد
برہمن را رشتہ در گردن بہ زنار آورد

لیکن اقبال نے محبت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا جواب شاید کسی سے کبھی بھی نہ بن پڑے- ملاحظہ ہو :

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانہ سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاق زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے
سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعی پیہم سے
پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسائے مسیح ابن مریمؑ سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی' افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمہ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستی نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کار عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

آزادی وطن

وطن کی آزادی کامل کا نعرہ آج شیخ کی زبان پر بھی ہے اور برہمن کی زبان پر بھی ہے۔ ہر چھوٹا بڑا وطن عزیز کو آزاد و مختار دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے۔ ہمارا شاعر اسی آرزو کو یوں ظاہر کرتا ہے:

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

آزادی کے لیے حالات کی سازگاری شرط ہے۔ حالات کو خدا کا فضل اور ملت کی صلاحیت سازگار کرنے پر قادر ہے اور اس کی طرف سے مایوس ہونا اقبال کے مذہب میں جائز نہیں۔ وہ کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کشت ویراں سے مراد ہندوستان ہے۔ جس کی زرخیزی میں کلام نہیں بشرطیکہ ابر کرم کا کوئی چھینٹا اسے سیراب کر دے۔ اقبال ابر کا احسان اٹھانا نہیں چاہتا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو وہ "نم" پیدا کر سکتے ہیں، جس سے خاک ہند زرخیز ہو سکتی ہے۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

اقبال اور مولانا رومؒ

اقبال کی شاعری کو جن اثرات نے اپنے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان میں مولانا روم کے تخیل تصرف کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ مولانا کی مشہور غزل ہے۔

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست
زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست

بے عمل اپاہجوں سے مولانا روم کی روح بیزار تھی۔ مسجد نشین ملاؤں، خانقاہ نشین درویشوں کی جگہ جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں ایسے مردان مجاہد کی تلاش تھی، جو سر سے کفن لپیٹ کر میدان غزا میں علی مرتضیٰؓ اور رستم دستاں بن کر نکلیں۔ مولانا کا روحانی شاگرد اقبال بھی ملت کو یہی رجزیہ درس دیتا ہے۔ سنئے:

صحبت پیر رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف
مثل کلیمؑ ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لا تخف

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

بلند ہمتی کا سبق

اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا سبق اقبال نے اچھوتے انداز میں دیا چیونٹی اور عقاب کا مکالمہ بزبان حال لکھا ہے۔ چیونٹی پوچھتی ہے۔

میں پائمال و خوار و پریشان و درد مند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب جواب دیتا ہے:

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

(پیغام حق۔ اگست ء نیز علامہ اقبال اپنوں کی نظر میں'
مرتبہ مصباح الحق صدیقی)

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

(مولانا ظفر علی خاں سے ایک انٹرویو)

میں نے جس زمانے میں "ستارہ صبح" نکالا' اقبال اس زمانے میں انارکلی بازار میں رہا کرتے تھے' وہ خیال کے اعتبار سے تو عمر بھر جوان رہے' مگر یہ وہ زمانہ تھا جب وہ خود بھی جوان تھے اور ان کے چہرہ کا شگفتہ پن جوانی چنانکہ افتد و دانی کی انمول حکایت کہا کرتا تھا- میں حیدر آباد سے لاہور پہنچا' زمیندار کی ادارت سنبھالی' تو میرے لیے لاہور اپنی تمام ہماہمی کے باوجود ایک لحاظ سے نیا تھا- گو لاہور سے میرے ادبی تعلقات کا سانچہ ایک مدت پہلے تیار ہو چکا تھا اور رسالہ مخزن وغیرہ سے قلم کے مراسم حیدر آباد ہی میں قائم ہو گئے تھے' مگر پھر بھی یہاں پہنچ کر مجھے احباب کا ایک حلقہ پیدا کرنا پڑا- اسی حلقے میں علامہ مرحوم بھی تھے- ان کی شاعری کے نکھار میں اس وقت بھی کوئی شک نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کا شعر "فلسفہ" ہو تا گیا اور انہوں نے ایک ایسے پیام کی صورت اختیار کر لی کہ آج ایشیا میں ملت اسلامیہ بالخصوص ان کے فکر سے متاثر نظر آتی ہے اور تو اور ان کے ناقدوں کا لب و لہجہ بھی اس امر کا غماز ہے کہ ان کی فکر میں جو کچھ ہے' وہ بہرحال اپنے اندر ایک ابھرتی ہوئی زندگی کی حرارت ضرور رکھتا ہے میں سمجھتا ہوں- اقبال نے جو کچھ پیش کیا- وہ مستقبل کے معاشرے کی اساس ہے- انہوں نے ایک قوم کی کایا پلٹ کر دی- آج جس درجہ بھی مسلمانوں میں زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں اور ان کے دل و دماغ میں جس حد تک بھی اسلامیت سے شغف کا جذبہ موجود ہے اس کا معتدبہ حصہ محض علامہ اقبال کے شعرو فلسفہ کا مرہون اثر ہے— یہ جواب تھا- جو حضرت مولانا ظفر علی خاں نے میرے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ آپ پہلے پہل اقبال سے کب ملے تھے؟ اور پہلی ملاقات میں آپ نے کیا محسوس کیا تھا— میں اپنے مخصوص رنگ میں تقاضا کر رہا تھا کہ آپ اقبال نمبر کے لیے ضرور کچھ لکھیے نثر نہ سہی' نظم- نظم نہ سہی دو شعر' مگر مولانا کے ہاتھوں میں رعشہ آچکا ہے اور کمر جھک کر جوانی کا سراغ لگا رہی ہے- فرماتے رہے' میں نے ایک عرصہ سے شعر و انشا کا مشغلہ ترک کر رکھا ہے اب ہم لوگ ایک تماشا ہیں اور آپ تماشائی' ہمارا زمانہ بیت گیا ہے اور اس

کے ساتھ ہی قلم و دوات کے وہ معرکے بھی ٹھنڈے پڑ گئے ہیں' جن کے زمانہ شباب کی کہانی تاریخ کے صفحوں میں "گاہے گاہے بازخواں" کا نقش بن کر بیٹھ گئی ہے۔ ہاں کبھی یہ ضرور کہا تھا۔

ادب کا ذوق ہے جن کو مرے اشعار سن سن کر
مخمور بنتے جاتے ہیں مخنداں ہوتے جاتے ہیں

مگر یہ تب کا قصہ ہے جب آتش جوان تھا۔ اب تو یہی غنیمت ہے کہ عمر کی گھنی چھاؤں کے سایہ میں زندگی بسر ہو رہی ہے اور قافلہ حیات سکون کے ساتھ اپنا سفر پورا کر رہا ہے۔ ہمارے وقت کا آفتاب ڈوب گیا' اس زمانے کی صحبتیں لیل و نہار کے ساتھ ختم ہو گئیں جن لوگوں کی رہنمائی میں شعر و انشا کا سفر شروع کیا تھا' وہ قبر کی گود میں سو گئے اور جو ہمارے ہم عصر تھے' ان میں سے بھی تقریباً تمام اٹھ گئے۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

عرض کیا۔ مولانا میں نے کچھ سوالات لکھ لیے ہیں۔ آپ ان کے جواب ہی لکھوا دیجئے۔ پہلے تو چپ سے ہو گئے اور پھر خود ہی ارشاد فرمایا۔ کونسے اور کتنے سوال ہیں۔ میں نے عرض کی۔ یہی دو چار سوال — جب میں نے سوالات کی نوعیت بتائی تو کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر کہا' اچھا لکھو! میں نے پہلا سوال کہ نسبتاً آسان تھا — دریافت کیا۔

"یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال اور آپ داغ دہلوی کے شاگرد ہیں؟"

علامہ اقبال کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور میرا خیال ہے کہ وہ شاگرد نہیں تھے ممکن ہے ایک آدھ غزل پر رسماً" اصلاح لی ہو لیکن جہاں تک استاد شاگرد کے حقیقی مفہوم کا تعلق ہے وہ داغ کے شاگرد نہ تھے' رہا میرا معاملہ تو میں نے داغ سے کبھی اصلاح نہیں لی۔ وہ حیدر آباد میں ملک الشعرا تھے اور میر محبوب علی خاں کے استاد۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بے حد وسیع تھا مگر میں ان میں نہ تھا اور یوں بھی شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں۔ داغ مرحوم کی عادت تھی کہ جو شخص بھی ان کے پاس بیٹھا۔ اس نے شاعری کے ایک آدھ نکتے پر بات چیت کی یا ایک آدھ غزل سنا کر مشورہ طلب کیا تو وہ اس کو اپنے شاگردوں کی فہرست میں شامل کر لیتے اور پھر شاگردی کا سارٹیفکیٹ بھیج دیتے تھے۔ ادھر میں نوجوان تھا مولانا نے عمر رفتہ کا تصور باندھ کر فرمایا — "حیدر آباد کا ماحول تھا۔ داغ کے ہاں اکثر شعر و سخن کی محفلیں جمتیں میں بھی شریک ہوتا ممکن ہے میرے قلم کے تیور دیکھ کر انہوں نے مجھے بھی' جیسا کہ ان کے بعض شاگردوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ اپنے شاگردوں میں شامل کر لیا ہو' ہاں یہ ضرور ہے کہ

میں نے لارڈ کرزن کی کتاب خیابان فارس کا اردو میں ترجمہ کیا تو انہیں بھی سنایا اور شاید انہوں نے ایک آدھ جگہ زبان کے معاملہ میں مشورہ بھی دیا مگر یقینی نہیں' اس سے انہوں نے یا ان کے بعض تلامذہ نے مجھے بھی شاگرد سمجھا- اس سے قیاس پڑتا ہے کہ اقبال کا معاملہ بھی شاید ایسا ہی تھا- داغ کی شہرت کا عہد تھا- اقبال نے... بہ قول شیخ عبدالقادر ایک آدھ غزل بھیج دی ہو گی اور انہوں نے اصلاح کر کے فہرست میں نام لکھ لیا ہو گا- میرے اور اقبال کے شاگرد ہونے کی غلط فہمی اس سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم دونوں نے داغ کے مرثیے لکھے ہیں ہم نے جو کچھ لکھا وہ ان کی سخنوری کو خراج تھا مگر لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم ان کے شاگرد ہیں-- خیر اس سے کیا ہوتا ہے کہ ہم داغ کے شاگرد تھے یا نہیں' داغ- اقبال اور میرے حدود شعر' ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ہم نے جو کچھ کہا- وہ شعریت کی یکسانیت کے باوجود بہ لحاظ اسلوب مختلف المعنی ہیں--- "آپ نے تو کئی ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں- جن میں اقبالؒ پر چوٹ کی گئی ہے-" میں نے ذرا ہمت سے پوچھا!

"یہ چوٹ کا لفظ بے محل ہے"-- مولانا نے ذرا تیزی میں فرمایا میں نے جو کچھ بھی اقبال کے متعلق لکھا- اس کا ایک خاص رخ ہے- اور تمام تر سخن گسترانہ ہے- ہم دونوں ہم عصر تھے- ہمارے تعلقات کا رشتہ آپ کی طرح نہ تھا بلکہ ہمارے روابط دو دوستوں کے سے تھے- ایسے دوست جن میں روایتی تکلف نام کو بھی نہیں ہوتا ہے- میں نے جب بھی علامہ مرحوم سے شاعرانہ نوک جھونک کی- تو اس کا پس منظر دوستانہ ہی ہوتا تھا- یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھار عمل کے بعض گوشوں میں ان کی علیحدگی سے بہ نظر ظاہر جو خلا سا محسوس ہوتا تھا- اس سے میرے قلم کی زبان پر ان کے متعلق کہیں کہیں طعن آ گیا مگر اس کا طول و عرض وقتی تحریکوں کی شاعرانہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ نہ ہوتا تھا مثلاً تحریک خلافت کے زمانے میں اقبال سے مخاطب ہو کر میں نے لکھا تھا-

عرض کر حضرت اقبال سے جا کر یہ صبا
اے کہ دنیائے سخن میں تری تمثال نہیں
ماجرا کیا ہے کہ کچھ روز سے خاموش ہے تو
گرم پرواز ترا فکر سبک بال نہیں
بزم کہتی ہے کہ تو جب سے نہیں زمزمہ سنج
کسی آہنگ میں وہ سر نہیں وہ تال نہیں

باندھنے کے لیے مضموں نہیں ملتے تجھ کو
یا روانی پہ تری طبع ہی فی الحال نہیں
کونسا دن ہے کہ سر پر کوئی بجلی نہ گری
کونسی شب ہے کہ آیا کوئی بھونچال نہیں
کونسا گوشہ ہے ماتم نہیں جس میں برپا
کونسا خطہ ہے جو مضطرب الحال نہیں
شاہزادے سے عقیدت نہیں کس بستی کو
کشور ہند کے کس شہر میں ہڑتال نہیں
یہ مباحث ترے نزدیک ہیں فرسودہ اگر
تو خلافت کے مضامین تو پامال نہیں
ان معارف ہی سے کر آکے جہاد اکبر
شرع کو تجھ سے تقاضائے زر و مال نہیں
کب جنوں مصلحت اندیش ہوا کرتا ہے
آج کیوں یاد تجھے اپنے ہی اقوال نہیں
تنت کے وقت میں اپنوں سے نہ منہ پھیر کہ تو
دولت اسلام کی ہے کفر کا اقبال نہیں

—— "آپ میں اور علامہ اقبال میں اکثر و بیشتر سیاسی اختلاف رہا"—— میں نے ضمناً سوال کیا۔

سیاسی اختلاف کیا' وہ اصل میں علم تھے۔ عمل نہ تھے خود بھی کہہ گئے ہیں۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

ہم ملکی جدوجہد کے ہنگاموں میں شریک ہوئے تو ان کے گرد و پیش ایسے لوگ جمع ہو گئے جن کے بارے میں زمیندار کا سہ لیسان سرمدی کی اصطلاح وضع کر چکا تھا۔ یہ لوگ دلچسپ خاکے بنا کر انہیں ایسے راستے پر ڈال دیتے تھے جو عموماً ہم سے مختلف ہوتا تھا چونکہ وہ ایک باعظمت فرد تھے۔ اس لیے ان کے اس طرز عمل سے نتائج پر بھی کافی اثر پڑتا تھا اور انہی اثرات کی وجہ سے وہ طنزیں یا ہجویں نظم کے سانچہ میں ڈھل گئیں جن کے جواب میں علامہ مرحوم ہمیشہ طرح دے گئے۔ البتہ ملتے تو کہا کرتے۔ وہ نظم آپ نے خوب کہی ہے—— میں

پوچھا کونسی نظم۔۔ فرماتے بھائی وہی جس کا مطلع ہے۔۔۔

قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے
قبر آزادی کی کھو دی کس نے سر اقبال نے

لاہور میں سائمن کمیشن کی آمد پر ۳۔ فروری ۱۹۲۸ء کو ہڑتال ہوئی۔ اس ہڑتال کے برخلاف سر محمد شفیع' سر ذوالفقار علی خاں اور سر عبدالقادر کے ساتھ ساتھ سر اقبال بھی تھے اور محض اس وجہ سے تھے کہ اول الذکر تینوں اصحاب سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ہم۔۔۔ مولانا نے فرمایا۔۔۔ ہڑتال کو کامیاب بنانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اقبال کی مخالفت ہمیں گوارا نہ ہوئی' قلم جھوما اور نظم ہو گئی۔

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے' سر اقبال نے
دشمنان ہند کو خوش کرنے کی خاطر شکست
آپ اپنی فوج کو دی کس نے سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے
آبرو ملت کی کھو دی کس نے سر اقبال نے
تھی ضرورت جس کو مرہم کی اس آلے زخم میں
سوئی اور الٹی چبھو دی کس نے سر اقبال نے
ہند کے ناموس کی تذلیل سے لاہور میں
بھر دی انگلستاں کی گودی کس نے سر اقبال نے
کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے آج
قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے

جس زمانے میں انہیں سر کا خطاب ملا' تو جمعیت احرار (مجلس احرار نہیں) میں اس کا خیر مقدم نہ کیا گیا' بلکہ سب نے اس کو برا محسوس کیا اور میں نے اسی احساس کو بالفاظ ذیل نظم کیا۔

سرفروشوں کے ہیں ہم سر' آپ ہیں سرکار کے
آپ کا منصب ہے سرکاری ہمارا خانگی
فیصلہ کر لے گی دنیا ہم میں افضل کون ہے
آیئے چل کر دکھا دیں اپنی اپنی بانگی!

پاؤں میں زنجیر ہے زنداں سے گھبراتے نہیں
ہم محبانِ وطن کا شیوہ ہے مردانگی
عافیت کوشی ہے پہلے دن سے مسلک آپ کا
اور اسی میں مستتر ہے آپ کی فرزانگی
چھوڑ کر اپنوں کو غیروں کا دیا ساتھ آپ نے
بات ہے یہ عقل کی یا عقل سے بے گانگی
"مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو"
چھوڑ دے اس بزدلی کو اور دکھا مردانگی

شعر و شاعری کی بات چھڑ گئی تو کچھ وہ شعر بھی سن لیجئے' جو عموماً علامہ اقبال کی تحریک پر موزوں ہوتے تھے' ستارہ صبح میں پیروں اور صوفیوں کی جو خبر لی گئی۔ وہ تمام تر آپ ہی کے مشورہ سے تھا۔ صبح و شام ملاقاتیں ہوتیں۔ بہت سے موضوع زیر بحث آتے اور عموماً انہی مباحث کا نتیجہ ستارہ صبح کی فکاہی نظمیں ہوتیں۔ جولائی ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ ہمارے درمیان کچھ حسرت آفرین حقیقتیں زیر بحث تھیں۔ میں نے ارتجالاً" یہ شعر کہہ ڈالے۔

جب سے ہم میں آزیبل اور سر پیدا ہوئے
سوئے فتنے جاگ اٹھے اور شر پیدا ہوئے
طاق نسیاں پر اسے اسلامیوں نے رکھ دیا
جس غرض سے حضرت خیرؐ البشر پیدا ہوئے
وانکحوا ما طاب سے کرتے ہیں جو مسلم ابا
کیوں نہ وہ پیٹر کے یا ولیم کے گھر پیدا ہوئے
کیوں نہ سیکھیں عورتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا
مرد جن کے منکر غض بصر پیدا ہوئے
سرمۂ چشم حسیناں بن گئی تہذیب غرب
دل لبھانے کو نئے جادو نظر پیدا ہوئے
آنکھ ہو گی لذت اندوز جمال بے حجاب
خرمن غیرت کے گھر برق و شرر پیدا ہوئے
پردہ دارِ خانۂ مسلم نہ کیوں ہو عنکبوت
انڈیا کونسل کے اندر پردہ در پیدا ہوئے

شرع میں بھی ٹانگ اڑانے میں نہیں ڈرتے ذرا
ہم میں ایسے ایسے گستاخ اور نڈر پیدا ہوئے
دادریغا فطرت مسلم ہوئی جاتی ہے مسخ
بن رہے ہیں لومڑی جو شیر نر پیدا ہوئے
کوڑیوں کے بھاؤ بکتے پھرتے ہیں بازار میں
مسند آراؤں کے لائق جو گہر پیدا ہوئے
پاس ناموس شریعت شرع والوں کو نہیں
حامی دین مبیں سب نیم تر پیدا ہوئے
دیکھنا تھا ہم کو ان آنکھوں سے بھی یہ انقلاب
آدمی سب ہو گئے گم اور خر پیدا ہوئے
دیکھنے کی اور سننے کی توقع ان سے کیا؟
پیٹ ہی سے ماں کے جو کور اور کر پیدا ہوئے
انتخاب ہفت کشور خطہ پنجاب ہے
اس میں کیا کیا نکتہ سنج اور نکتہ ور پیدا ہوئے
حاسدان تیرہ باطن کے جلانے کے لیے
تجھ میں اے پنجاب اقبال و ظفر پیدا ہوئے

۱۶/ جنوری ۱۹۲۵ء کو اقبال کی گائے نے بچھڑا دیا- علی بخش ایک نہایت دیدہ زیب طشت میں گائے کی کھیس بھر کر اس پر اوراق نقرئی لگا کر اور پستہ کی ہوائیاں چھڑک کر دفتر زمیندار میں لایا اس واقعہ کو ان اشعار میں قلمبند کیا گیا ہے-

جو اپنی میٹھی کھیس زمیندار کو کھلائے
دودھوں نہائے ڈاکٹر اقبال کی وہ گائے
فرہاد لا سکا نہ جسے کوہسار سے
وہ جوئے شیر وادی پنجاب میں بہائے
ہو ناظرین کے لئے سرمایہ سرور
صفراء لونا کی جھلک ہند کو دکھائے
سر لاجپت دھنیں تو کریں رقص مالوی
گو سالہ اس کا وجد میں ہر سامری کو لائے

ڈکرائے مال روڈ پر جا کر علی الصباح
اور نغمہ اتحاد کا لاہور کو سنائے
تھن منہ سے گر لگائے تو امرت برس پڑے
موتی جھڑیں اگر وہ کہیں کان پھڑپھڑائے

اس نظم کے لکھواتے ہی مولانا نے ایک آہ سرد بھری' فرمایا-- اور اب

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

پھر بولے' میرے عزیز اقبال نے درست کہا تھا۔

دل ما بیدلاں بردند و رفتند
مثال شعلہ افسردند و رفتند
بیایک لحظہ باعاماں در آمیز
کہ خاصاں بادہ ہا خوروند و رفتند

عجب نہ تھا کہ مولانا جو بڑھاپے کی وجہ سے رک رک کر بول رہے تھے' بات ختم کر دیتے لیکن میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ جو اقبال کو فلسفی شاعر کہا ہے آیا شعرو فلسفہ میں بھی کوئی ربط ہے؟"

مسکرائے اور بولے- خدا معلوم تمہاری فلسفہ سے کیا مراد ہے جب شعر کے لیے فلسفہ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد موضوع کی کلیت اور ہمہ گیری ہوتی ہے- اقبال ان معنوں میں فلسفی شاعر ہے کہ وہ ایک کل تصور حیات پیش کرتا ہے۔

"کیا اس کا تصور حیات سائنٹفک ہے؟"

"یعنی کہ اس کا تصور حیات عمل کے عقلی چوکھٹے میں کس حد تک جوڑا جا سکتا ہے؟"

"تمہارا سوال صاف نہیں' اصل میں تمہارے سامنے مادی فلسفے اور روحانی فلسفے کا کوئی مبہم سا تصور ہے- میرے خیال میں تمہارے سوال کی صورت یہ ہے کہ اقبال جس نظام حیات کو پیش کرتا ہے- آیا وہ عمل کی دنیا میں آ سکتا ہے اور پھر اس کے عقلی دلائل کیا ہیں؟

یاد رکھو سائنس ہمیں ثبوت مہیا کرتا ہے' مگر عقیدہ نہیں دے سکتا- اس کے برعکس مذہب ہمیں عقیدہ دیتا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہی باتیں زندگی کی اصل نہیں کہلاتیں جنہیں ہم ثابت کر سکتے ہیں' بلکہ بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں ہم ثابت نہیں کر سکتے لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

اقبال کی فکر کا رنگ و روغن عقیدہ پر ہے- اور اقبال جس عقیدہ کو پیش کرتا ہے- اس کو

ملحوظ رکھتے ہوئے اگر ہم نوع انسان کی موجودہ بے چینی اور معاشرہ ارضی کے جدید انتشار کو علم و عقیدہ کے ترازو میں تولیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں عقیدہ کا پلڑا زیادہ سے زیادہ جھکا ہوا نظر آتا ہے۔

"دوسرے لفظوں میں اقبال کا تصور حیات مستقبل کا مذہب ہے۔" میں نے ضمناً پوچھا۔

"بالکل! اور وہ بھی صرف اس لیے کہ اقبال نے جو کچھ بھی کہا ہے۔ اس کی اساس اسلام ہے۔ آج اگر اسلام اپاہجوں کے ہاتھ میں ہے۔ تو کل یہ ایک ایسی پود کے ہاتھ میں آنے والا ہے جس کے ذہنی نشو میں اقبال کے فکر نے شبانہ روز حصہ لیا ہے۔ اقبال عظیم انسان تھا۔ اس نے نہ صرف ہماری زندگی کے جمود کو جھنجھوڑا بلکہ ہمارے قدموں کی رفتار معین کر دی اور ہمیں اس گمشدہ منزل کا پتہ دیا۔ جس کے مسافر بھٹک گئے تھے ناقہ گم تھا اور میر قافلہ گمراہ تھے!"

(ہفت روزہ چٹان لاہور۔ اقبال نمبر۔ بابت ۲۵ اپریل ۱۹۴۹ء)

اقبالؒ ـــ میرا دوست

(مولانا ظفر علی خاں سے ایک انٹرویو)

اقبال سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ انار کلی والے مکان میں رہا کرتے تھے اس سے پہلے جب میں حیدر آباد میں تھا تو "مخزن" میں ان کی نظمیں دیکھ کر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج تحسین ادا کیا گیا تھا' اقبال نے بھی اس خط کا جواب بہت دوستانہ پیرائے میں لکھا۔ اور یوں میرے اور ان کے درمیان "قلمی دوستی" قائم ہو گئی۔

جب میں لاہور آیا تو انار کلی والے مکان ہی میں اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں وہ جوان تھے' شباب ان کے چہرے سے پھوٹ پھوٹ پڑتا تھا' پہلی ملاقات میں وہ مجھ سے کھل گئے اور ایسے بے تکلف ہوئے کہ مجھے ان کی دوستی پر مسرت ہونے لگی' اس کے بعد میں ان سے برابر ملتا رہا' ان ملاقاتوں میں اس دور کے مسائل' شاعری' فلسفے اور نہ جانے کن کن مسائل پر گھنٹوں ہماری گفتگو جاری رہتی اور جب میں ان سے مل کر لوٹتا ہمیشہ مجھے یہی محسوس ہوتا کہ اقبال کو محض ایک شاعر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے' وہ ایک عظیم المرتبت فلسفی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ ملت اسلامیہ کی حیات نو کا پیغامبر ہے' اور بعد میں جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میرا یہ خیال پختہ یقین میں تبدیل ہوتا گیا۔

حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب میں نے لاہور سے "زمیندار" نکالا تو اقبال نے میری خواہش پر اس میں پوری پوری دلچسپی لی اکثر وہ "زمیندار" کے لیے کوئی نہ کوئی نظم لکھ دیتے جو اس کے صفحہ اول پر شائع ہوتی تھی اور لوگ اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اقبال میں شعر کہنے کی بے پناہ قوت تھی' اور ان کا دل سوز و گداز سے لبریز تھا وہ جو کچھ لکھتے تھے۔ گہرے درد سے لکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے اشعار دل پر اثر کرتے تھے اور ایک ایسی تڑپ پیدا کرتے تھے جو خود شاعر کے دل میں موجود تھی۔ خود اقبال بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ شعر اس لیے نہیں کہتے تھے کہ اپنے آپ کو شاعر منوائیں بلکہ محض اس لیے کہ جس پیغام کو ملت

اسلامیہ تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کا موثر ذریعہ صرف شعر ہی تھا۔ ویسے بہ حیثیت شاعر کے ان کی شاعری کے تین دور ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جب وہ ایک سچے وطن پرست تھے اور اسی دور میں انہوں نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" جیسی نظمیں لکھیں۔ دوسرا دور وہ ہے جب وہ انگلستان گئے اور وہاں ان پر "پان اسلام ازم" کی تحریک کا رنگ چڑھا اور تیسرا دور وہ ہے۔ جس میں وہ مستقل طور پر اسلامی فلسفہ حیات کی طرف مائل ہو گئے اور آخر دم تک اسی طرف متوجہ رہے۔

اقبال کے مزاج میں ظریفانہ رنگ بھی بہت تھا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں وہ خوب کھل کھیلتے تھے اور ایک ایک نشست میں کئی کئی لطیفے کہہ ڈالتے تھے۔ وہ اکبر الہ آبادی کے مزاحیہ کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور اکثر ان کے رنگ میں لکھا بھی کرتے تھے۔ مجھے اس قسم کے کلام کا صرف ایک مصرعہ یاد ہے۔

"الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا"

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اقبال بیٹھے بیٹھے ایک آدھ مصرعہ کہہ دیتے اور پھر مجھ سے کہتے کہ میں باقی نظم مکمل کر دوں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ہم دونوں نے ایک مشترک نظم کہی جس میں آدھے شعر اقبال کے اور آدھے میرے تھے۔ یہ واقعہ غالباً جولائی ۱۹۱۱ء کا ہے۔ نظم کا موضوع اس دور کے غدار اور ضمیر فروش تھے۔ پوری نظم یہ تھی۔

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں بساط کہنہ و نو ہے
اگر اس کی سلامی کے لیے نواب جھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لو ہے
کئی مسلک کیے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا
احدشہ کا کوئی پٹھو کوئی آغا کا پیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ بچپی الیکشن کی
بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ کو پڑی پو ہے
نہیں ہے بہر اظہار وغا لازم نمود اصلاً
کہ بحر شعر میں پانی نہیں مطلق مگر رو ہے

اقبال بطور دوست ایک بے مثال آدمی تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ "زمیندار" میں' میں نے شعر کی زبان میں ان پر کچھ لطیف چوٹیں کیں مگر انہوں نے کبھی برا نہ مانا بلکہ الٹا میری نظموں کی

تعریف کی۔ یہی "لطیف چوٹیں" تھیں جن کا مطلب بعض لوگوں نے یہ نکالا کہ ہماری دوستی میں فرق آ گیا ہے یا اقبال مجھ سے اور میں اقبال سے کبیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کیونکہ اقبال کا ظرف بہت بلند تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہرگز رنجیدہ نہ ہوتے تھے اور نہ ان کا کچھ خیال کرتے تھے۔ اس کے برعکس وہ اپنے مخالفوں تک کی بات کو بڑی توجہ اور سکون سے سنتے تھے اور بڑے ہی مدلل اور بجے تلے انداز میں اس کا جواب دیتے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے اقبال کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس کا مقصد ہرگز ان کی مذمت نہ تھا۔ اسے آپ ایک دوست کا شکوہ و شکایت کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی ایک مخلص دوست کا۔

(قندیل ۲۱/ اپریل ۱۹۵۰ء)

علم الاقتصاد

(حضرت علامہ اقبال کی کتاب 'علم الاقتصاد' پر یہ تبصرہ مولانا ظفر علی خاں نے 'نقاد' کے قلمی نام سے لکھا تھا۔ جعفر)

اب تک جو لوگ پروفیسر محمد اقبال صاحب کو بحیثیت ایک نازک خیال شاعر کے جانتے ہیں وہ اس اطلاع سے کہ وہ ناثر بھی ہیں گو متعجب ہوں مگر ان کی تازہ تصنیف کے مطالعہ سے کسی قدر مایوس ضرور ہوں گے اور یہ مایوسی ان کی تصنیف کے نقص کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس کا الزام ان کی بلند پایہ شاعری پر ہے اور اگر ہم اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیں تو ان کی یہ کوشش ہر طرح قابل تعریف اور ان کی یہ محنت ہر لحاظ سے داد کے لائق ہے۔ ہندوستان کو جیسے اس علم کی ضرورت ہے شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے ملک کو ہو کچھ تو اس لیے کہ ایک حصہ ملک کا پہلے ہی سے زراعت تجارت اور مزدوری مین مصروف ہے اور کچھ اس لیے کہ موجودہ تمدن روز بروز ان ضرورتوں کو بڑھا رہا ہے اور بغیر اس کے ترقی ناممکن ہے ایسے زمانہ میں اس قسم کی کتابیں لکھنا درحقیقت ملک پر احسان کرنا ہے۔

اس کتاب میں اول انہوں نے علم الاقتصاد پر اور اس کے طریقہ تحقیق پر مختصرا بحث کی ہے بعد ازاں حصول دولت کے وسائل یعنی زمین محنت۔ سرمایہ اور تبادلہ دولت۔ تجارت بین الاقوام زرنقد کی ماہیت۔ لگان۔ سود۔ منافع۔ اجرت۔ مالگزاری۔ جدید ضروریات وغیرہ کار آمد مضامین کو لیا ہے۔

کتاب کے مفید ہونے میں شک نہیں اور خود ان مضامین سے جن پر بحث کی گئی ہے اس کی خوبی ظاہر ہے لیکن اس کا طرز تحریر اور طریق بحث کچھ اس قسم کا ہے کہ پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے اور مضامین سمجھ میں مشکل سے آتے ہیں بعض الفاظ و اصطلاحات جو استعمال کیے گئے ہیں وہ علاوہ اجنبی اور غیر مانوس ہونے کے موزوں اور معنی خیز بھی نہیں ہیں مثلاً پیدائش دولت اور پیداوار دولت اور ان میں جو فرق بتایا گیا ہے اس سے محض جدت اور مفت کی سر دردی معلوم ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح محنت کی کارکردگی۔ دستکار بمعنی مزدور۔ تامین

تجارت- آزاد اشیاء (ان اشیا کے معنوں میں جو قدرت مہیا کرتی ہے) وغیرہ- عبارت میں بھی جا بجا سقم اور دقتیں موجود ہیں- مثلاً

"ایسی زمین کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ وہ کنارہ زراعت پر ہے"

"قطع نظر اس خوشی یا لذت کے جو اس سعی (حصول دولت) کی دوران میں حاصل ہو- قدرت مصالح یا ہیولی مہیا کرتی ہے-"

"کھاد کی طلب جہاں پہلے پانچ ہزار چھکڑا تھی اب شاید چھ ہزار چھکڑا ہو جائے گی" اسی قسم کے اور اسقام جابجا نظر آتے ہیں- ان جملوں میں ہم نے صرف ان پر خط کھینچ دیا ہے- ہمیں مولف سے "اقتصاد ہندی" کے مسئلہ میں بھی اختلاف ہے جبکہ یہ علم خود واقعات کی بنا پر قائم ہے اور واقعات ہی سے نتائج استنباط کیے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر کسی ملک میں واقعات کی صورت بدلی ہو تو ان اصول میں تغیر پیدا نہ کیا جائے خواہ وہ تغیر عارضی ہی کیوں نہ ہو ہمیں اس سے بھی اختلاف ہے کہ یہ غلطی علم اور فن میں تمیز نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کا خیال ملک کے حالات اور واقعات پر غور کرنے سے پیدا ہوا ہے چنانچہ مولف خود اس امر کو تسلیم کرتے ہیں "اگرچہ یہ تسلیم کرنے میں ہمیں عذر نہیں کہ اس کے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیر آنا ممکن ہے جس سے ان کی وسعت زیادہ ہو جائے اور ان کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے" اور ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اس کے نتائج مختلف ممالک کے حالات پر منحصر ہیں- ان ہی امور نے بعض محبان وطن کو اقتصاد ہندی لکھنے پر مجبور کیا ہے جن صاحبوں کو اس سے دلچسپی ہو وہ فاضل راناڈے مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ فرمائیں-"

(دکن ریویو- فروری ۱۹۰۵ء)

ھن لباس لکم و انتم لباس لھن

(رموز بے خودی کا ایک باب)

ایک لباس تو وہ ہے جسے خواجہ شیراز ایک زمانہ میں رہن خرابات کرنے چلے تھے' جو ایران میں کبھی ایک جام شراب کو بھی سستا تھا' جس کی آلودگی پر کرامات کی تر دامنی نثار تھی' جس پر دہلی کے محلہ بلی ماراں یا گربہ کشاں میں چوہوں کے ایسے دانت لگے تھے کہ سارا پیرہن تقوئی تار تار ہو گیا تھا۔

مگر ایک لباس وہ ہے جس کی بہترین شکل "تن کی عریانی" بتائی گئی ہے کہ ع۔ یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا۔ عربوں کی اصطلاح میں صنف لطیف کو بھی "لباس" کہتے تھے جس کی تلمیح رسمی لباس سے تو ظاہر ہی ہے۔ "تن کی عریانی" والا لباس بھی کچھ اسی پر پھبتا ہے اور فرزدق نے عبداللہ بن زبیر کے واقعہ میں اس بنا پر صنف لطیف کو "لباس عریانی" سے تشبیہ دی تھی۔

(۲)

ترجمان اسلام لسان توحید (ڈاکٹر اقبال) نے مثنوی اسرار خودی کے دوسرے حصہ میں جو ہنوز زیر تالیف ہے' اس لباس لطیف کی جھالر میں نئے موتی ٹانکے ہیں اور جنس نازک سے نہایت حکیمانہ بحث کی ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات نذر اہل نظر ہیں ملاحظہ ہو۔

نغمہ کوش از زخمہ زن ساز مرد
از نیاز او دوبالا ناز مرد

عورت ہی تو ہے جس کی وجہ سے مردوں میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور ان میں نغمہ سنجی کی شان آتی ہے [مرد کا ناز اس کی (کے؟) نیاز سے دوبالا ہو جاتا ہے]

جامہ عریانی' مرداں زن است
حسن دلجو عشق را پیراہن است

[مردوں کا جامہ عریانی اگر کوئی ہے تو عورت ہی ہے۔ حسن و جمال کی دلجوئی ہی عشق کے لیے

پیراہن کا کام دیتی ہے۔]

آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمودہ باطیب و صلوٰۃ

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی ہستی پر کائنات کو ناز ہے عورت کا تذکرہ خوشبو اور نماز کے ساتھ کیا ہے۔]

مسلمے کو را پرستارے شمرد
بہرہ از حکمت قرآں نبرد

[جو مسلمان عورت کو لونڈی سمجھے وہ فلسفہ قرآں سے بے بہرہ

(۳)

امومت (فرائض و خصائص مادری) کا فلسفہ ایک نہایت دقیق فلسفہ ہے جو روس میں "الاموسۃ عندالعرب" کے عنوان سے اگر شائع ہوا ہے تو فرانس کے علمائے اجتماع بھی موسیو لشا تیہ کے رسالہ میں اسی موضوع پر مبسوط بحث کر چکے ہیں... کے ترجمے ہم نے "المؤید" میں پڑھے تھے۔ ہمارا نکتہ رس حکیم (اقبال) اس حقیقت پر یوں نظر ڈالتا ہے:

نیک اگر بینی امومت رحمت ست
زانکہ او را بانبوت نسبت ست

[امعان سے اگر تم دیکھو گے تو عورت کی شان مادری کو رحمت پاؤ گے اس لیے کہ شان نبوت کے ساتھ اس کو مناسبت ہے۔]

ہست گر فرہنگ تو معنی رسے
حرف امت نکتہ ہا دارد بسے

[تمہاری عقل اگر دوربیں و دور رس و نکتہ شناس ہے تو خوب سمجھ لو کہ "امت" میں بڑے بڑے نکتے ہیں اور "امومت" کا لفظ اسی سے نکلا ہے۔]

شفقت او شفقت پیغمبرست
سیرت اقوام را صورت گر است

[اس کی شفقت میں شفقت پیغمبری کی شان ہے اور قوم کی سیرت اس کی صورت گری سے بنتی ہے۔]

از امومت پختہ تر تعمیر ما
در خط سیمائے او تقدیر ما

[ہمارے ایوان قومیت کی تعمیر امومت یا شان مادری ہی سے پختہ ہوتی ہے۔ اسی امومت کے خط پیشانی میں ہماری تقدیر مضمر ہے۔]

از امومت تیز رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات

[زندگی کی رفتار امومت ہی سے تیز ہوتی ہے اور اسرار حیات کو منکشف کرنے والی یہی امومت ہے۔]

از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما

[ہماری قومیت کی نہر کے جتنے پیچ و خم ہیں' اسی امومت سے ہیں۔ موج ہے تو یہی ہے گرداب ہے تو یہی ہے' حباب ہے تو یہی ہے۔]

(۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تولید و تکثیر نسل کو موجب مباہات فرمایا تھا۔ امریکہ کے سابق رئیس جمہور (مسٹر روز ویلٹ) بھی اسی نقش قدم پر ہے اور ان کی جانب سے ان عورتوں کے لیے بیش قرار انعامات مقرر ہیں جن کے متعدد اولاد ہو۔ جمہوریہ فرانس بھی سالہا سال سے اس فکر میں ہے اور اب انگلستان بھی اس خیال سے خالی نہیں رہا ہے۔ اقبال نے بھی اس کو ( ) کا علاج بتایا ہے کہ

آں رخ رستاق زادے جاہلے
پست بالائے ستبرے بدگلے

[ان پڑھ نادان جاہل جو دیہات میں پیدا ہوئی ہے' جو قد کی چھوٹی جسم کی فربہ اور نہایت بد قوارہ ہے۔]

ناتراشے پرورش نادادۂ
کم نگاہے کم زبانے سادۂ

[کندۂ ناتراش' غیر تربیت یافتہ بہت کم نگاہ اٹھانے والی بہت کم زبان' بہت ہی سادہ مزاج]

دل ز آلام امومت کردہ خوں
گرد چشمش حلقہ ہائے نیلگوں

[اور جس کا دل فرائض مادری کے درد و الم میں خون ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔]

ملت ار گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمانے غیور و حق پرست

[قوم اگر اس کی آغوش سے ایک ہی غیرت مند حق پرست مسلمان بھی حاصل کر لے۔]

ہستی ما محکم از الام او
صبح ما عالم فروز از شام او

[تو ہماری قومی ہستی اس کے رنج و الم سے استوار ہو جائے کہ صبح عالم فروز اس شام تاریک کا نتیجہ ہے۔]

(۵)

یہ تصویر جو اقبال نے کھینچی ہے' "متنبی" نے بھی صدیوں پیشتر اس کے خط و خال دکھائے تھے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ بداوت کے مقابلہ میں حضارت ہے جس کے مناظر آج ہر ایک شہر میں آپ دیکھ رہے ہیں لیکن جس کی بداہت نگاری کا نظارہ صرف اقبال کے قلم نے دکھایا ہے:

واں تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرورد نگاہش محشرے

[لیکن شہر کی وہ نازنین و نازک بدن عورت جس کے گود میں بچہ تو نہیں ہے مگر فتنہ قیامت اسی کی نگاہ ہی کا خانہ زاد ہے۔]

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا نا آشنا آزادیش

[وہ جس کی شوخ چشم آزادی فتنہ آفریں ہے اور جس کی مطلق العنانی کو شرم چھو تک نہیں گئی۔]

بند ہائے ملت بیضا گسیخت
تاز چشمش عشوہا حل کردہ ریخت

[اسلام کی بندشیں اس نے توڑ دیں اور یہ اس وقت سے ٹوٹیں جب سے کہ آنکھوں نے جادو کے ڈورے ڈالنے شروع کیے۔]

فکر او از تاب مغرب روشن ست
ظاہرش زن' باطن او نازن است

[اس کے خیالات مغرب کی چمک دمک سے روشن ہیں۔ ظاہر میں تو وہ عورت ہے مگر باطن میں اس سے عورت کی نفی مترشح ہے۔]

علم او بار اُمومت بر نتافت
بر سر شامش یکے اختر نتافت

[وہ صاحب علم ہے مگر اس کا علم امومت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا حتیٰ کہ اس کے مطلع ولادت پر ایک ستارہ بھی نہیں چمکتا۔]

ایں گل از بستان ما نارستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ

[یہ گلاب کا پھول سہی مگر ایسا پھول ہمارے باغ میں نہ کھلے تو بہتر۔ قوم کے دامن سے اس کے داغ کا دھل جانا ہی اچھا۔]

(ستارۂ صبح۔ ۸ اگست ۱۹۱۷ء)

جواہر ریزے

حضرت علامہ اقبال کے بعض اشعار کی تفسیر

لاہور آنے کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ گاہے ماہے لسان توحید علامہ اقبال سے نیاز حاصل ہو جاتا ہے اور ان کی حکیمانہ پھلجھڑیاں طبیعت کے انقباض کو جو کثرت کار و ہجوم افکار کا نتیجہ ہے' مبدل بہ انشراح کر دیتی ہیں۔

دو ایک دن ہوئے علامہ ممدوح سے حسب معمول نیاز حاصل ہوا ہم نے کہا کچھ تازہ فکر کی ہو تو فرمایئے۔ کہنے لگے کہ مولانا جامی کے ایک مرصع مطلع پر ایک شعر ہوا ہے سن لیجئے۔

پہلے آپ نے یہ مطلع پڑھا۔

آنکہ از حلقہ زر گوش گرانست اورا
چہ غم از نالہ خونیں جگرانست اورا

کون ہے جو اس بے مثل مطلع کو پڑھ کر سر نہ دھنے گا۔ مولانا جامی کے کلام میں تغزل کا جو رنگ ہے اور اس میں جو حلاوت اور شیرینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے' اس کی کیفیت سے ارباب ذوق سلیم نا آشنا نہیں لیکن اس شعر میں تو مولانا اپنی (اپنے؟) آسمان فکر کے نقطہ نصف النہار پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ لفظی اور معنوی رعایتیں اس مرقص انداز میں دست و گریباں ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار وجد آ جاتا ہے۔

فارسی میں "گراں" کے معنی ایک تو ثقل کے ہیں جو اس لفظ کا مفہوم متعارف ہے اور دوسرے معنی اس حالت میں جب یہ لفظ گوش کی صفت واقع ہوا ہو ثقل سماعت کے ہیں۔

شعر کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ شوخ بے پروا جس کے کانوں میں سونے کی بالیاں پڑی ہوئی ہیں کہ ان بالیوں کے بوجھ سے اس کے کان دہرے ہوئے جاتے ہیں (یا بہ رعایت معنوی بہرے ہوئے جاتے ہیں) ان خونیں جگر عشاق کی آہ و بکا کو کب خاطر میں لانے لگا تھا جو اس پر

مٹے ہوئے ہیں اس لیے کہ اس کی بے نیازی کی کفیل اس کی گراں گوشی ہو چکی ہے۔

یہ شعر کا لفظی ترجمہ ہے' لیکن محال ہے کہ ایک زبان دوسری زبان کی رعایت لفظی کو اصل شان میں ظاہر کر سکے جامی کے شعر کا لطف فارسی ہی میں ہے اور وہی اس سے پوری طرح بہرہ اندوز حلاوت ہو سکتے ہیں جو فارسی جانتے ہیں۔

اب اقبال کا شعر ملاحظہ ہو فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔

سر کند بت اگرش طاقت گفتار دہند
گلہ ہائے کہ ز ہندو پسرانست اورا

اس میں توحید کا ایک نہایت ہی لطیف نکتہ مضمر ہے اور وہ جن کی جبین نیاز آفریندہ کون و مکاں کے آستانہ وحدت پر سجدہ ریز ہے' جن کا سر خدائے قدوس کی بے ہمتائی کی بارگاہ میں جھکا ہوا ہے' جو نطق کو مبدء فیاض کے پیرایہ کمال کی تمیل ترین ادا سمجھتے ہیں اس شعر کی نزاکتوں کی داد دے سکیں گے کاشی اور سومنات کے صنم خانوں میں معبودان ہند کے سنگین ہونٹوں پر ازل سے سکوت کی جو مہر لگی ہوئی ہے اس کا نقش ہزار ہا سال ہوئے' عراق کے ایک ساحلی شہر کے بت کدہ میں بھی مرتسم تھا اور آذر کی صنعت گری نے اس کے ارتسام میں اپنا کمال دکھایا تھا۔ دین حنیف کا وہ وحید العصر موسس' لقب مسلم کا وہ سب سے پہلا حقدار' ابراہیمؑ' جس پر خدا تعالٰی کی سو سو رحمتیں ہوں' ایک دن صنم کدے میں گیا۔ اس سے پہلے انجم و آفتاب و ماہتاب کی آفلیت کا تقابل اس کے سینے میں خلاق ارض و سما کا نور عالم آرا چمکا چکا تھا۔ اب صنم خانے کے معبودان باطل کی خموشی سعادت کے اس فرزند اعظم کو معبود حقیقی کے نطق مطلق کا درس دینے والی تھی اس نے ایک تبر لے کر تمام بتوں کا سر توڑ ڈالا اور صنم شکنی کی اولیت کا یہ شرف حاصل کرنے کے بعد تبر کو سب سے بڑے بت کے گلے میں ڈال دیا۔ جب پجاری آئے اور انہوں نے اپنے دیوتاؤں کی یہ حالت دیکھی تو ابراہیمؑ سے غضب ناک ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ابراہیمؑ نے تعریض منزہ کے اس لہجے میں جو بعض دفعہ بلاغت کی جان ہوتا ہے اور جو مذہب کی تاریخ میں اس موقع سے زیادہ کامیابی کے ساتھ کبھی نہیں برتا گیا' جواب دیا کہ مجھ انسان ضعیف البنیان سے کیا پوچھتے ہو اپنے اس سب سے بڑے خدا سے پوچھو' اگر اس میں نطق ہے تو بتا دے گا کہ بت شکن کون ہے؟

ہماری کج مج بیانی کو یہ توفیق کہاں مرحمت ہوئی ہے کہ ان حقائق عالیہ کا حق ایضاح ادا کر سکے۔ موبمو تصویر قرآن حکیم نے کھینچی ہے ملاحظہ ہو۔

فراغ الی الھتھم فقال الا تاکلون ○ مالکم لاتنطقون ○ فراغ علیھم ضربا" بالیمین ○

فاقبلوا الیہ یزفون ○ قال اتعبدون ماتنحتون ○ واللہ خلقکم وما تعملون ○

ترجمہ : پھر ابراہیمؑ ان کے بتوں کے جمگھٹے میں جا داخل ہوئے اور ان سے کہنے لگے کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتے ہو اور تم کو کیا ہو گیا ہے کہ بولتے چالتے نہیں ہو۔ یہ کہہ کر وہ بتوں پر پل پڑے اور اپنے دہنے ہاتھ سے ان پر ضربیں لگانی شروع کیں۔ وہ اس کام میں مصروف ہی تھے کہ لوگ ان پر دوڑ پڑے۔ ابراہیمؑ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ جن سنگین لعبتوں کو خود تمہارے ہاتھوں نے تراشا ہے ان کو کیوں پوجتے ہو۔ تمہارا پیدا کرنے والا اور تمہارے مصنوعات کا پیدا کرنے والا تو اللہ ہے اس کی پرستش کیوں نہیں کرتے؟

بت کو اگر طاقت گفتار دی جاتی تو وہ جناب خلیل اللہ کا ہم صفیر ہو کر یہی گلہ گزاری کرتا۔ اقبال کا شعر ایک کوزہ ہے جس میں توحید کا یہ دریا بھر دیا گیا ہے۔ فافہم

ایک اور مطلع ہے جو غالباً شیخ علی حزیں کا ہے کہ

از بنارس نروم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است ایں جا

سری رام چندر جی مہاراج اور سری لچھمن جی مہاراج کے حسن معنوی کا زمانہ تو گزر گیا۔ اس حسن لازوال اس جمال بے مثال کا اگر نظارہ کرنا ہو تو رامائن کے بھولے بسرے اوراق کو الٹ کر دیکھیے۔ آج کل تو دنیا میں اس حسن کی صرف شان صوری رہ گئی ہے اور حزیں نے جب یہ شعر کہا تھا تو صبح بنارس کی یہی تجلی اس کی بصارت میں جلوہ ریز ہوئی ہو گی۔

ہمارے شاعر نے زمین "حزیں" کی لی اور اس کی خاک پر اپنے (اپنی جعفر) شراب معنی کا جرعہ اس طرح گرایا۔

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است ایں جا
قسمت بادہ باندازہ جام است ایں جا

"حزیں" کا مطلع لاجواب ہے لیکن "اقبال" نے بھی اپنے مطلع پر کچھ کم زور طبیعت صرف نہیں کیا اور اس کا دوسرا مصرع تو پھڑکا دینے والا ہے۔

دو شعر فرما کر ڈاکٹر اقبال چپ ہو گئے۔ ہم نے کہا کیوں حضرت "اندازہ جام" کیا اسی قدر تھا۔ ہنس کر فرماتے ہیں۔

بہ فہم ہیچ مضموں جز بلب بستن نمے آید
خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید

ہم نے عرض کی کہ حضرت یہ اڑان گھائیاں کسی اور کو بتایئے گا۔ ہم سے یہ فقرے اب نہیں چل سکتے آپ تو دریائے شعر ہیں۔ وہ موتی جو آپ نے تہہ میں ڈال رکھے ہیں' کچھ ان کی بانگی بھی تو دکھایئے۔ مثنوی اسرار خودی کے دوسرے حصے کے صدہا اشعار درر مکنون کی طرح آپ کے حافظہ کی ڈبیہ میں بند ہیں' اس درج گوہریں کا ڈھکنا بھی تو کھولیے اور دو ایک موتیوں کی رخشانی و غلطانی کی بہار اور دکھایئے۔

کہنے لگے کہ بھئی تم بڑے بے ڈھب ہو' میں اپنی دولت سینت سینت کر رکھتا ہوں مگر تم آ کر اس پر چھاپہ مار ہی جاتے ہو اچھا لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ قرآن حکیم کی صفت و ثنا میں دو شعر عرض کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

آنکہ دوش کوہ بارش برنتافت سطوت او زہرۂ گردوں شگافت
بنگر آں سرمایہ آمال ما گنجد اندر سینہ اطفال ما

یہ اشعار آبدار سن کر ہم جھوم جھوم گئے۔ قرآن مجید کی مشہور آیت ہے۔

انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا۔ (الاحزاب۔ ۷۲)

اس آیت کی تفسیر میں ہمارے مفسرین نے اپنی جودت طبع کے گوناگوں کرشمے دکھائے ہیں لیکن جو نکتہ اقبال کی فکر فلک پیما کو سوجھا ہے وہ شاید کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔

جناب باری کا ارشاد ہے کہ ہم نے بار امانت کو آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں کے حوالے کیا لیکن آسمان اس کے ہستی فرسا بوجھ کی تاب نہ لا سکا۔ زمین اس کے بارگراں کی متحمل نہ ہو سکی۔ پہاڑ اس کے تحمل کے تصور سے لرز اٹھے۔ کسی کو بھی اس کے اٹھانے کی توفیق نہ ہوئی۔ سب نے متفق اللفظ ہو کر اس کی حمالی سے انکار کر دیا۔ آخر انسان ظلوم و جہول ہی نے حامی بھری کہ میں اس بار کو اٹھاتا ہوں۔ شیراز کے لسان الغیب نے اس آیت کی تفسیر اپنی شور انگیز ادا میں یوں کی ہے

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

مولانا جامی نے بھی اپنی ادائے خاص میں آیہ کریمہ انا عرضنا الامانۃ کی رنگین تفسیریں کی ہے۔

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسماں
در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ ای

یہ دونوں اشعار رہتی دنیا تک ادب آگھان عجم کی زبان پر رہیں گے لیکن ہمارے لسان توحید کا خیال ہی نرالا ہے۔ "اقبال" نے اپنے شعر میں یہ نزاکت پیدا کی ہے کہ اول تو بار امانت سے مراد قرآن مجید لی ہے اور حقیقت میں اس سے بڑھ کر صحیح اور لطیف مفہوم بار امانت کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ مفہوم ہمارے مفسرین کرام کو بھی سوجھا ہے۔ لیکن ایک بالکل نئی بات جو "اقبال" نے پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ اس بار گراں کو جس سے دب کر آسمان اور زمین اور پہاڑ نالہ کرنے لگے تھے، مسلمان بچوں کے سینے کی ودیعت کر دیا ہے کہ اس کے سمانے کے لیے یہی نہاں خانہ موزوں ہو سکتا ہے اور پھر انسان ظلوم و جہول کی تعریف بچوں پر کیسی صادق آتی ہے لکھ پڑھ کر اور فلسفہ و حکمت سے آشنا ہو کر تو قرآن ایک عاقل و بالغ انسان کے سینے میں سما ہی جائے گا لیکن ایک چار پانچ سال کے بچے کے دل و دماغ میں آیات قرآنی کا اتر جانا شاعرانہ پہلو سے اس بات کا ایک بداعت نواز ثبوت ہے کہ قرآن کا بار امانت انسان ظلوم و جہول نے اٹھا لیا۔ اس لیے کہ انسان کی شان ظلومی و جہولی کی اولیں تصویر عہد طفولیت ہی ہے۔

پھر وہ بچہ جس کا سینہ اس امانت کا گنجینہ بن چکا ہے جب بڑا ہو گا تو کیا سے کیا ہو جائے گا کوئی ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ خلافت و نیابت الٰہی کی تمام شاخیں اس میں جمع ہو سکیں گی۔ اس کے پاؤں زمین کے بجائے آسمان پر ہوں گے۔ اس کا سرعرش بریں کے تکیہ پر ہو گا۔ آفتاب و ماہتاب اس کی محفل جلال و جمال کے مشعل بردار ہوں گے۔ ہوائیں اس کی نامہ بر ہوں گی ابر نوبہار اس کی سقائی کرے گا۔ بلقیس اس کی کنیز ہو گی۔ سلیمان اس کی تصویر شکوہ و احتشام ہو گا سکندر اس کا آئینہ دار بنے گا۔

یہ وہ امکانات ہیں جو قرآن نے ایک طفل مسلم کی چھپی ہوئی قابلیتوں کے نہاں خانے کی ودیعت کر رکھے ہیں اور اقبال کے دونوں شعر اس حقیقت کبری کے چہرہ کشا ہیں۔

قرآن مجید و فرقان حمید کا ذکر مسلمان کے حق میں وہی اثر رکھتا ہے جو حدی خواں کا نغمہ اشتر تیز گام کے لیے اور گراں محملوں کی سبک روی کا یہی علاج ہے۔

نوارا تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اور علامہ اقبال کا عنقائے فکر تو عرفی سے بھی اونچا آشیانہ رکھتا ہے، وہ غالب کے ہمنوا ہو کر کہہ سکتے ہیں۔

ناقہؐ شوقم و جبریل حدی خوان من است

دو شعر ہمیں سنا کر خود بخود وجد میں آ گئے اور کہنے لگے کہ لو اور بھی سنو۔ عرب کے جاہل بدو کو جس اعجازی قوت نے حکیم بنا دیا۔ اس کی بادیہ نشینی کو بزم تمدن کی صدر نشینی سے بدل دیا۔ اس کی شتربانی میں شان جہانبانی پیدا کر دی۔ اس کے پاؤں کی خاک کو اکسیر بنا کر دکھا دیا وہ یہی قرآن ہے۔

آں جگر تاب بیابان کم آب چشم او احمر ز سوز آفتاب
خوشتر از آہو رم جمازہ اش گرم چوں آتش دم جمازہ اش
رخت خواب افگندہ درزیر نخیل صبحدم بیدار از بانگ رحیل
دشت سیر از بام و در ناآشنا ہرزہ گرد و از حضر نا آشنا
تا دلش از گرمی قرآن تپید موج بے تابش چو گوہر آرمید
از جہاں بانی نوازد ساز او مسند جم گشت پا انداز او
شہر ہا از گرد پایش ریختند صد چمن از یک گلش انگیختند

ان اشعار کو سن کر قلب و دماغ میں جن جنوں انگیز لذتوں کا ہجوم ہوا وہ دیر تک اپنا اثر قائم رکھیں گی اور جب اس اثر کا سلسلہ طولانی نقش محو ہونے لگے گا تو ہم پھر علامہ اقبال سے عرض کریں گے کہ اب کچھ اور ارشاد ہو۔ یہ داستان رنگین ذرا طویل ہو گئی لیکن

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

(ستارۂ صبح ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء)

جواہر ریزے

'رموز بے خودی' کے بعض اشعار کی تفسیر

قطاع الطریق دنیا میں یوں تو اور بھی ہوں گے لیکن ہمیں اپنے انداز رہزنی پر ناز ہے۔ علامہ اقبال کے جواہر خانہ پر پرسوں ہم نے پھر چھاپا مارا اور مٹھی بھر جواہرات لے ہی اڑے۔

ہمارے ایک بھائی مولوی اسحاق علی صاحب علوی نے جنہیں دنیا "ظفر الملک" کے زیادہ پر شکوہ لقب کے ذریعہ سے جانتی ہے' ہمیں اقوام جرایم پیشہ کا سردار بنایا ہے یہ خطاب بالکل بجا اور بر محل ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی ہم اتنی شرح اور کیے دیتے ہیں جس میں ہمارا رنگ دوسرے ڈاکوؤں سے الگ ہے کہ ہمارے ہم پیشہ دوست تو جو مال لوٹتے ہیں اس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیتے لیکن ہم ہیں کہ لوٹ کا مال لٹانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور جو موتی کہیں سے ہاتھ آتے ہیں سربازار سر پر نچھاور کرتے چلے جاتے ہیں جو مال غنیمت ہمیں علامہ اقبال کے گنج شائگاں سے ہاتھ آیا ہے' اس کی لٹس میں بھی "ستارہ صبح" کے ناظرین کو ہم برابر کا ساجھی بنانا چاہتے ہیں۔ ہماری شان ایثار ملاحظہ ہو۔

مسلمانوں کا خدا ایک ہے' رسول ایک ہے' روایات ایک ہیں' پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ پرستار توحید اپنی شان نوعی و آن خصوصی میں جوہر فرد نہ ہو۔ مسلمانوں کا خدا لم یلد ہے لم یولد ہے اور لم یکن لہ کفوا احد ہے۔ نہ وہ کسی کے صلب سے پیدا ہوا نہ اس کے صلب سے کوئی پیدا ہوا۔ نہ اس کا کسی کے ساتھ رشتہ ناطہ ہے۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کے پاؤں میں ولدیت اور رشتہ داری کے ان علائق کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں جن کے بغیر دوسری قوموں کا شیرازہ بندھ ہی نہیں سکتا۔ مسلمان مسلمان اس لیے نہیں کہ اس کا باپ فلاں ہے اور ماموں فلاں ہے یا وہ عرب میں رہتا ہے یا چین کا باشندہ ہے بلکہ وہ اس لیے مسلمان ہے کہ توحید اس کا زاد بوم ہے قرآن اس کا گہوارہ ہے اور کائنات اس کی جولاں گاہ ہے۔ انہیں حقائق کا ترانہ لسان توحید نے اس طرح گایا ہے۔

فارغ از باب و ام و اعمام شو
ہمچو سلماں زادہ اسلام شو
عشق ورزی از نسب باید گزشت
ہم ز ایران و عرب باید گزشت
ہر کہ پا دربند اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد لم یولد است
مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرت او برنتابد ہمسرے
آنکہ ذاتش واحد است ولا شریک
بندہ اش ہم درنسازد با شریک(۱)

صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو بھائی سے بے حد محبت تھی۔ بازو کی قوت کے ٹوٹ جانے پر دل پاش پاش ہو گیا۔ کلیجے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ سینہ میں درد کا ایک آتشیں طوفان اٹھا جو زبان پر آکر آبلہ بن گیا۔ اس آبلے کا زہراب اگر دجلہ اور فرات کی موجوں پر ٹپکتا تو ان پر تب خالے ہی تب خالے پیدا ہو جاتے۔ اس عالم گداز میں عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک نوحہ کیا جسے خنسا جو ارثی العرب ہے، اگر سن پاتی تو مدتوں سر دھنا کرتی۔

جناب عبداللہ ابن مسعود اگر دور جاہلیت کا تتبع کرتے تو بھائی کا بین کرتے وقت کہتے کہ ہائے یہ بھائی وہ بھائی تھا جس کی شجاعت کی سارے عرب میں دھاک بندھی ہوئی تھی۔ یہ بھائی وہ بھائی تھا جس کا نیزہ جوشن گزار ہزاروں نبرد آزمایان صف شکن کو ایک ہی وار میں چھید کر رکھ دیتا تھا۔ یہ بھائی وہ بھائی تھا جس کی سخاوت، حاتم طائی سے بھی اس کے مرقد میں داد احسنت و زہ وصول کرتی تھی۔ ان نالوں سے جناب عبداللہ ابن مسعود فضائے عرب میں ایک تلاطم بپا کر سکتے تھے لیکن نہیں۔ جاہلیت جا چکی تھی۔ اسلام آ چکا تھا۔ اخوت و یگانگت کے پرانے عصبی رشتے سب ٹوٹ چکے تھے۔ عبداللہ ابن مسعود اور ان کے برادر مغفور کی یاد ان اعتبارات سے بالا ہو چکی تھی۔ عرش بریں کی سقف میں وہ یہ کہہ کر شگاف ڈالتے ہیں کہ ہائے اب میں نماز کی صف میں جا کر شریک ہوں گا تو میرا بھائی میرے پہلو بہ پہلو نہ کھڑا ہو گا ہائے رسول اللہ کے دربار میں جاؤں گا تو 'اکیلا' ہوں گا اور میرا بھائی میرے ساتھ نہ ہو گا۔

درد اسلامی کے دریائے زخار کی اس موج گوناگوں کو علامہ اقبال نے ایجاز کے بلیغ کوزے

میں بند کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

عشق در جان و نسب در پیکر است
رشتہ عشق از نسب محکم تر ست

مولانا جامیؒ نے بھی اس خیال کو اپنے رنگ میں خوب ظاہر کیا ہے۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن اقبال کی پرواز تخیل بلند تر ہے۔ جامیؒ نے محض ایک حقیقت بیان کر دی تھی کہ عشق ذات کو نہیں پوچھا کرتا اور نسب کی پابندیوں سے آزاد ہے اقبال نے اس حقیقت کا ثبوت بھی دیا ہے اور بتایا ہے کہ عشق کے روئے دل آرام کو مشاطہ نسب کی کیوں حاجت نہیں اور ثبوت کیسا لطیف ہے کہ نسب کا تعلق تو صرف کالبد خاکی سے ہے جو بے اعتبار محض ہے لیکن عشق پیوند جان ہے جو حقیقت اصلی ہے۔ پھر اس کا رشتہ نسب کے مقابلہ میں کیوں نہ استوار تر ہو؟

(ستارۂ صبح ۴ اکتوبر ۱۹۱۷ء)

حواشی

۱۔ یہ اشعار "رموز بے خودی" میں سورہ اخلاص کی تفسیر کے ذیل میں درج ہیں زیر نظر کالم میں جستہ جستہ اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ پہلے شعر کا متن "رموز بے خودی" میں یوں ہے۔

فارغ از باب و ام و اعمام باش ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

حدیث آرزو مندی

گزشتہ یک شنبہ کے روز آنریبل نواب ذوالفقار علی خان صاحب کی نیاز مند نوازی ہمیں شام کے وقت بطریق تفریح و تفرج مقبرہ جہانگیر میں لے گئی۔ علامہ اقبال بھی ساتھ تھے۔ سرو و شمشاد اور سبزہ و گل کی بہار تو وہی ہے جو یہ چرخ فیروزہ گوں صدیوں پہلے دکھا چکا ہے بلکہ لارڈ کرزن کی فیاضانہ آثار پرستی کے صدقہ میں گلگشت کی فضا شاید پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہے لیکن اس گنبد کو دیکھ کر جس میں جہانگیر ابن اکبر محو آرام ہے' دل میں ہزاروں عبرت اندوز حسرتوں کا ہجوم ہو گیا۔ علامہ اقبال نے اس وقت سوز و گداز کے لہجہ میں مولائے روم کی ایک غزل پڑھی جس کے یہ تین شعر ہمیں وجد میں لے آئے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

بعد مغرب ہم شاہدرہ سے لوٹ کر گھر پہنچے تو یہی اشعار زبان پر جاری تھے ادب اردو نے تقاضا کیا کہ ان مطالب عالیہ' پر اس کا بھی کچھ حق ہے طبیعت کو اس مطالبہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ چند شعر بستر پر لیٹے ہی لیٹے موزوں ہو گئے' جو حاضر ہیں۔

میری جاں پر چھائے جاتی ہے فنا کی آرزو
اور زباں پر آئے جاتی ہے بقا کی آرزو
میں خبر جس مبتدا کی ہوں کہاں گم ہو گیا
میری آنکھوں کو ہے میرے نقش پا کی آرزو
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اسلام کو لے کر چراغ
کافر مسلم نما کو ہے خدا کی آرزو

صدق میں صدیق اکبرؓ سے الگ میری روش
لیکن اس پر بھی صداقت کے لوا کی آرزو

عدل میں فاروق اعظمؓ سے جدا میرا شعار
لیکن اس پر بھی خلافت کی قبا کی آرزو

شرم دیں میں ضد ہوں میں عثمانؓ کے آئین کی
لیکن اس پر بھی اسی شان حیا کی آرزو

دست و پا بشکستگی پر بھی مرے دل میں رہی
زور بازوئے علیؓ مرتضٰی کی آرزو

آنکھ ما زاغ البصر کے سرمہ سے بیگانہ ہو
حیف ہے پھر بھی ہو اس کو ما طغٰی کی آرزو

لیس للانسان الا ما سعٰی کو بھول کر
آرزو میری بھی ہے کیسی بلا کی آرزو

اے مسیحا کی نوید اے ابن آزر کی دعا
بلکہ خود خلاق اکبر کی قضا کی آرزو

اٹھ کہ ہے تیری دوا ہی تیری امت کا علاج
ملت بیضا کو ہے تیری دعا کی آرزو

جاگ جاگ اے نیند کے ماتے کہ تیری قوم کو
ہے اسی منزل میں اپنے رہنما کی آرزو

رات اندھیری کا رواں جنگل میں اور چپ ہے جرس
قافلہ کو ہے تری بانگ درا کی آرزو

(ستارہ صبح- ۱۵ نومبر ۱۹۱۷ء)

طریقت کا کلام اللہ

سمرقند میں ایک صوفی بزرگ ابواللیث گزرے ہیں جنھوں نے ارباب طریقت کے افادہ کے لیے ایک قرآن تصنیف فرمایا تھا۔ جناب ابواللیث نے وہ تمام آیات کاملہ درج فرمائی ہیں جو جناب باری نے عرش بریں پر معراج والی رات بدون وساطت جبرئیل امیں اپنے رسول مقبولؐ پر اتاری تھیں۔ طریقت کے اس کلام اللہ کا ایک نسخہ لاہور کی اورینٹل لائبریری میں موجود ہے۔ علامہ اقبال نے اس پر تبصرہ کرنا شروع کیا تھا اور اگر یہ دل کشا تبصرہ شائع ہو جاتا تو مسلمانوں کو معلوم ہو جاتا کہ مکی و مدنی قرآن کی زبان اور سمرقندی قرآن کی زبان میں کیسے کیسے مزے کے فرق ہیں لیکن ہندوستان بھر کے ارباب طریقت نے اس زمانہ میں "ستارہ صبح" کی قائم کی ہوئی تحریک کے اور میرے خلاف جو اعلان جنگ کر رکھا تھا' غالباً اس کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر علامہ ممدوح نے اپنے تبصرہ کی اشاعت کا قصد ملتوی کر دیا۔ اشعار ذیل کا ثواب ہندوستان کے حلقہ متصوفین کرام کی نذر کیا جاتا ہے:

کلام اللہ کی میں بھی تلاوت روز کرتا ہوں
مگر اس کے مصنف ہیں ابواللیث سمرقندی
مری آنکھوں میں نقش مانی و بہزاد پھرتا ہے
مرا مسلک ہے ارژنگی مرا مشرب ہے پاژندی
دکھا دو جلوہ کثرت کا مجھے وحدت کے پردے میں
کہ شرع مصطفیؐ کی ہو سکے مجھ سے بھی پابندی

(لاہور۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۷ء)

نگارستان ص ۵۹

مدعیان تصوف سے دو ٹوک فیصلہ

(خواجہ حسن نظامی کا مطبوعہ گشتی خط بصیغہ راز)

تصوف کی مشہور مثنوی 'سلسلتہ الذہب' میں مولانا عبدالرحمن جامی قدس سرہ' نے ایک تمثیلی حکایت نظم کی ہے.... یہ اور اس قسم کی دوسری صوفیانہ حرکتیں ہیں' جن کی مخالفت پر ہمارا اسلام ہم کو مجبور کرتا ہے' ورنہ وہ روحانیت جسے اسلام 'احسان' کہتا ہے اور غلط العام نے اس کو تصوف سمجھ رکھا ہے' کوئی مسلمان اس کا مخالف نہیں ہو سکتا- بایں ہمہ نام نہاد صوفیوں کو یہ بھی گراں ہے اور اس پر بھی ہمارے خلاف ایک عام تحریک پیدا کی جا رہی ہے جس کا انکشاف ذیل کے خط سے ہوا ہے کہ ابھی ابھی لکھنؤ محلّہ..... سے آیا ہے..." باوجود ان تحریرات کے جو ہمارے خلاف اور ہمارے معزز دوست علامہ اقبال کے فضائل کی تنقیص میں 'خطیب' اور 'کشمیری' اور 'وکیل' میں مختلف پیرایوں اور مختلف طریقوں سے شائع کرائی جا رہی ہیں' ہم جناب خواجہ حسن نظامی اور ان کے گرامی قدر یاران طریقت کے باب میں اس سوءظن کو گناہ سمجھتے ہیں کہ وہ علانیہ اختلاف رائے کے علاوہ کوئی ایسا باطنی ساز و باز ہمارے خلاف کریں گے جو صرف چھوٹی طبیعت والے بزرگواروں ہی کا حصہ ہو سکتی ہے- جناب خواجہ صاحب خدا کے فضل سے ہاتھ میں ایک گلریز قلم اور اس قلم میں بہار آفریں قدرت رکھتے ہیں جو کچھ ہم نے لکھا ہے جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں یا جو کچھ ہم بشرط زندگی لکھیں گے' اس کا ابطال یا تخطیہ بہت ہی آسان ہے' اگر اس میں باطل کی آمیزش یا خطا کا لوث ہو- پھر کیوں نہیں جناب خواجہ صاحب و شرکاء سامنے آ کر ہمیں ہماری مزعومہ خطا کاریوں اور بدکرداریوں پر ٹوکتے ہیں اور کیوں نہیں علیٰ روس الاشہاد ہمیں ہدایت اور رشد کے صراط مستقیم پر ڈالتے ہیں- ہم ان سخن پروروں میں سے نہیں ہیں جنہیں اپنی منطقی لغزشوں پر مہرانہ اصرار ہو- ہم صاف کہتے ہیں اور خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہتے ہیں کہ کسی دلیل معقول' کسی حجت موجہ سے ہمیں قائل کر دیجئے' ہم آمنا و صدقنا کہنے کے لیے تیار ہیں- اس کے علاوہ اگر منطق ایسی ہی سنگ راہ ہو اور استقرا ذریعہ مقصد براری نہ ہو سکے تو پھر ہم اس دوسرے طریقہ افہام و تفہیم کے آگے بھی بطیب خاطر سر تسلیم جھکانے کے

لیے آمادہ ہیں جو حضرات اہل باطن کا صد ہا سال سے مایہ ناز چلا آتا ہے یعنی ہم آپ حضرات کو صلائے عام دیتے ہیں کہ اپنی قوت جاذبہ روحانیہ کی ایک توجہ سے اس میل' اس خبث اس شرارت کو جو ہمارے قلب حزیں سے منسوب کی جا رہی ہے' پاک کر دیجئے' تاکہ جس طرح ہم شریعت کے نام پر مٹے ہوئے ہیں' اسی طرح طریقت پر بھی نثار ہو جائیں اور آپ کا اور آپ کے حلقۃ المشائخ کا راگ گانے لگیں۔

جناب خواجہ حسن نظامی اور دوسرے بزرگان تصوف یقین مانیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' اس کو ازروئے ایمان اسلام کے مطابق سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس آرزو کے حوالہ کر دینے کے لیے از برائے خدا و از برائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم آمادہ پاتے ہیں کہ اگر ہمارے اقوال حق کے خلاف ہوں اور حق کی بے حرمتی کرنے والے ہوں' تو ہمارے کالبد خاکی سے غیرت حق کی برق خاطف کا ایک ہی شرارہ اس خاکدان کو پاک کر دے۔

جناب خواجہ حسن نظامی نے ہز ہولی نس موسیو بشیر الدین محمود کو دعوت مباہلہ دی ہے اور حق و باطل کے جھگڑے کو ایک ہی گھنٹہ کی دعا میں چکا دینے پر تیار ہیں اگر اس گشتی مطبوعہ چٹھی کا مضمون صحیح ہے جسے ہم نے تمام و کمال نقل کیا ہے' تو ظاہر ہے کہ جناب خواجہ صاحب ہم کو بھی ان لوگوں میں داخل سمجھتے ہیں' جنھوں نے دنیائے اسلام میں اشاعت باطل کو اپنا شعار قرار دے رکھا ہے۔ ہم جناب خواجہ صاحب سے منت التجا کرتے ہیں کہ خفیہ چٹھیاں شائع کرنے کے بجائے اور اپنے آپ کو اور اپنے دوستوں کو اس فتنہ کا سر دبانے کی تکلیف دینے کے بجائے' جس کا سرچشمہ ہمیں اور ہمارے احباب کو قرار دیا جا رہا ہے' ایک بد دعا ہمارے حق میں بھی تصنیف فرما دیں خواہ حلقۃ المشائخ میں بیٹھ کر' خواہ خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار فائض الانوار کی چہار دیواری میں رونق افروز ہو کر۔ اس پر "آمین" کہنے کے لیے ہم بھی تیار ہیں اس لیے کہ ہمیں بھی اپنے خدا پر بھروسا ہے۔

واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ وادعوا ربی عسی الا اکون بدعاء ربی شقیا (میں تم سے اور ان سب سے' جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو' کنارہ کش ہوتا ہوں۔ میں اپنے پروردگار سے دعا کروں گا۔ امید ہے کہ اپنے پروردگار سے دعا کر کے میں محروم نہ ہوں گا) (مریم۔ ۴۸)

(ستارہ صبح' ۱۳۔ دسمبر ۱۹۱۷ء)

نوٹ : (مضمون کے آغاز کا حصہ ورق اخبار کے دریدہ ہونے کی وجہ سے نامکمل ہے۔ جعفر)

فکاہات

نادان دوست

نقاش کے قلم سے

کلیلہ دمنہ میں ایک سدھائے ہوئے بندر کا ذکر آتا ہے جسے اگلے زمانہ میں راجہ کشمیر نے اپنے شبستان کا پاسباں بنا رکھا تھا۔ رات بھر یہ بندر ہاتھ میں ننگی تلوار لیے راجہ کے زرنگار چھپر کھٹ کے سرہانے پہرا دیتا رہتا تھا اور اس شمشیر بکف نگہبان کی موجودگی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ محل سرا میں داخل ہو سکے۔ ایک رات ایک بادی چور نے محل میں سیندھ لگائی لیکن نقب کے روزن سے شمع کافوری کی روشنی میں یہ دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا کہ سوئے ہوئے راجہ کی ناک پر مکھی بیٹھی ہوئی ہے۔ بندر اسے اڑانا چاہتا ہے مگر وہ اڑتی ہے اور پھر ناک کے بانسے پر جا بیٹھتی ہے۔ اس پر بندر دانت کنکنا کر تلوار اٹھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک ہی تلے ہوئے ہاتھ میں مکھی کے دو ٹکڑے کر دے۔ تلوار اٹھ چکی تھی اور راجہ کی ناک پر گرا ہی چاہتی تھی کہ چور نے ایک جست میں بندر کو جا دبوچا اور تلوار اس کی مٹھی سے چھین لی۔ اس کشمکش میں راجہ کی آنکھ کھل گئی اور جب اسے کل واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک نادان دوست کی دوستی کے شر سے اسے ایک دانا دشمن کی بروقت مداخلت نے بچا لیا۔

ویسے ہی نادان دوستوں سے ہمارے مایہ ناز شاعر علامہ اقبال کو پالا پڑا ہے۔ علامہ ممدوح کا مشہور شعر ہے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مسٹر داؤد احسن جو مومن مرحوم کے معشوق کی طرح آج کسی کے ہیں تو کل کسی کے' اور نہ کسی کے ہوئے ہیں اور نہ کسی کے ہوں گے' اپنی خو سے مجبور ہو کر کسی بات پر سر اقبال سے بگڑ

گئے اور انتقام کی شکل یہ نکالی کہ اس شعر کو سامنے رکھ کر ایک مقامی مصور سے ایک کارٹون بنوایا اور "مسلم آؤٹ لک" میں چھاپ دیا۔ کارٹون کیا ہے سر اقبال کی تحمیق و تضحیک و تذلیل کا ایک بوقلموں مرقع ہے جسے دیکھتے ہی اہل نظر کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔ مسٹر احسن نے تو جس مقصد سے یہ کارٹون چھاپا تھا وہ ظاہر ہے' لیکن یہ دیکھ کر عقل چکر میں آ رہی ہے کہ مدیران 'انقلاب' نے جو ازراہ غایت عقیدت سر اقبال کو اپنا سیاسی پیرو مرشد' اپنا ادبی قبلہ و کعبہ ظاہر کیا کرتے ہیں' "مسلم آؤٹ لک" کا اگلا ہوا لقمہ بلاتکلف نگل لیا اور ۴۔ نومبر کے "انقلاب" میں اس کو اس فخر سے چھاپا گویا سر اقبال کی مدح میں ایک قصیدہ لامیہ سپرد قلم فرما رہے ہیں۔ عجب نہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے انقلاب کا یہ پرچہ دیکھ کر اور اپنی رسوائی کا ڈھول اس کے ہاتھوں پٹتا سن کر سر پیٹ لیا ہو اور کہا ہو کہ خدا مجھے ایسے دوستوں سے بچائے۔

(زمیندار - ۶-نومبر ۲۸ء)

فکاہات

سائمن کمیشن اور اقبال

(از نقاش)

سرجان سائمن نے مارچ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی مرتبہ اپنے "قدوم میمنت لزوم" سے خاک لاہور کے ذرہ ذرہ کو یمن و سعادت کا ایک ایک آفتاب جہاں تاب بنانا چاہا تو اس شہر غدار کے بے بصران ازلی نے گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرانے کا فیصلہ کر لیا اور ازراہ غایت شوخ چشمی یہ اعلان کر دیا کہ جس دن یہ بن بلائے مہمان ہمارے گھر کی دہلیز پر قدم رکھیں گے ہم سیاہ ماتمی جھنڈیاں بلند کیے ہوئے ان سے پکار کر کہہ دیں گے کہ منہ کالا کیجئے اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر کو واپس تشریف لے جائیے۔

"پیام مشرق" کے شہرہ آفاق مصنف حضرت علامہ اقبال اور ان کے حبیب لبیب سر محمد شفیع کی رائے مبارک میں اہل لاہور کا یہ نامطبوع رویہ نہ صرف مشرقی مہمان نوازی کی شاندار روایات کے لیے باعث صد ہزار توہین تھا بلکہ ملت بیضا کے اغراض و مقاصد کے ساتھ بھی جو برطانوی ملوکیت ہی کے آغوش عاطفت میں پرورش پا کر پروان چڑھ سکتے ہیں، کھلی ہوئی غداری سے کم نہ تھا۔ اسی لیے حضرت علامہ اور دوسرے دیدہ وران ملت نے ایک ہنگامہ خیز اشتہار راتوں رات شہر کی دیواروں پر چپکوا دیا جس میں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا تھا کہ کفار ہنود کے ساتھ مل کر اپنی عاقبت خراب نہ کریں اور سرجان سائمن کے ورود مسعود پر مقاطعہ اور ہڑتال کا نام بھی نہ لیں ورنہ ان کی ہستی یقیناً اسی طرح آج گرد روزگار میں دب کر فنا ہو جائے گی جس طرح بابل و نینوا مٹ کر گم نام و بے نشاں ہو چکے ہیں۔

یہ حکیمانہ ارشادات آب زر سے لکھے جانے کے قابل تھے لیکن افسوس کہ مجلس خلافت

پنجاب کے سر پھرے ارکان پر ان کا خاک اثر نہ ہوا۔ اور انہوں نے سائمن صاحب کے مقاطعہ کی تیاریوں میں دن رات ایک کر کے اسلام کے شرف و مجد کا بیڑا غرق کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بیڑے کی تباہی میں جو رہی سہی کسر تھی وہ مولانا محمد علی نے دہلی سے آکر پوری کر دی اور موچی دروازے کے بھرے جلسے میں جہاں ہزارہا شوریدہ سر مسلمان جمع تھے ایک ایسی آگ لگانے والی تقریر کی جس کا دھنواں ابھی تک مزنگ روڈ اور میکلوڈ روڈ کے اطراف و جوانب سے اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال اور سر شفیع نے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے ہڑتال کے فلسفہ کی شرح یہ کہہ کر فرمائی تھی کہ ہندوستان کے بازاروں کی دکانوں میں تالے اسی وقت پڑا کرتے ہیں جب کوئی بڑا آدمی مر جائے اور اس کا سوگ منانا مقصود ہو۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کسی بطل جلیل کے جنازے کو کندھا نہیں دیا جا رہا ہے پس ہڑتال کرنا بالکل بے معنی ہے۔ مولانا محمد علی نے اس حکمت مشرقیہ کا تار و پود اپنے پنجہ تعریض سے جس خوبصورتی کے ساتھ بکھیرا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ گرج کر بولے کہ اے مسلمانو آج اقبال مر گیا پس اس کے ماتم میں اپنی دکانیں بند کر دو۔ آج شفیع مر گیا اس کے غم میں سیاہ جھنڈیاں بلند کرو آج ذوالفقار علی خاں مر گیا اس کے سوگ میں بازاروں کے اندر خاک اڑاؤ۔

سائمن صاحب ۱۰۔ مارچ کو لاہور آئے اور لاہور والوں نے ان کی جو گت بنائی' وہ علامہ اقبال اور ان کے رفقائے نامدار کو اچھی طرح یاد ہو گی۔ چھ مہینے کے بعد انہوں نے پھر اسی شہر میں قدم رنجہ فرمایا اور اس مرتبہ ان کی جو خاطر تواضع کی گئی اس کا داغ بھی وفا کیشان ازلی کے سینہ پر شمس بازغہ کی طرح چمک رہا ہے لیکن اس چھ مہینے کی مدت میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہو چکے تھے۔ مولانا محمد علی کی قائم مقامی کا شرف اس دفعہ ان کے برادر اکبر مولانا شوکت علی بجمیع القابہ کو حاصل ہوا اور زمانہ کی نیرنگی کے قربان جائیے کہ چھوٹے بھائی نے لاہور کے جس گورستان کے کنارے کھڑے ہو کر مسلمانوں کو دعوت سینہ کوبی دی تھی' بڑے بھائی نے اسی کی چار دیواری میں شب باش ہو کر اور قورمہ پلاؤ اڑا کر موت میں سے زندگی پیدا کرنے کی راہ نکال لی۔ ملاحظہ ہو:

"گزشتہ دنوں مولانا شوکت علی نے ڈاکٹر سر اقبال سے لاہور میں تبادلہ خیالات کیا۔ چند منٹ کی گفتگو میں معاملات صاف ہو گئے۔ آئندہ دونوں متفق طور پر جدوجہد کر کے مسلمانوں کو نئی

قوت کے ساتھ اسلام اور ملت کی خدمت کے لیے آمادہ کریں گے۔" (خلافت)

موت اور زندگی کے اس تعاون کی بوالعجبیوں پر حیران ہو کر امرتسری معاصر "کشمیر" لکھتا ہے :

"اول تو مولانا شوکت علی اور سر اقبال کا اشتراک عمل محال ہے کہ وہ ایک تیز رفتار سپاہی ہیں اور سر اقبال نہایت آہستہ رو مدبر۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو امید نہیں کہ وہ ہنگامہ زار سیاست کو گرم دیکھ کر ڈاکٹر سر اقبال کے ساتھ وابستہ رہ سکیں کیونکہ دونوں کے سیاسی عقائد میں بعد مشرقین ہے۔ مولانا مخلص ہیں۔ فدا کار ہیں ملک و قوم کے درد مند ہیں۔ [یعنی ڈاکٹر اقبال میں نہ اخلاص ہے نہ فداکاری ہے نہ ملک و قوم کی دردمندی ہے۔ کیا "کشمیر" کا مطلب یہی تو نہیں؟] لیکن ان کا تلون طبع دیکھ کر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ

حسینوں کی باتوں کا کیا اعتبار
طبیعت ادھر کی ادھر ہو گئی"

ہمارے معاصر کو اگر روزنامہ "خلافت" کے افتتاحیہ مسترشدہ ۲۰ نومبر کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہوتا تو اس کی مشکلات بہت کچھ آسان ہو گئی ہوتیں۔ مولانا شوکت علی کے جارحانہ اقدام اور علامہ اقبال کی شاندار پسپائی کے درمیان حلیفانہ راہ و رسم کی شکل یوں تجویز کی گئی ہے : "مسلمان مسلمان بہرحال آپس میں بہت قریب ہیں بہ نسبت ہندو اور مسلمان کے یا کسی اور غیر مسلم قوم کے مقابلے میں یہ اپنی نسبت اختلاف آپس میں کم کر سکتے ہیں۔ انتہا پسند مسلمان جنہوں نے ہندوؤں کی دوستی میں مسلمانوں کے جنازوں کو بھی کاندھا نہ دیا اور جامع مسجد دہلی میں ایک تبلیغی ہندو کو خطیب تک بنا دیا' ان حرکات غیر ضروری سے باز آ کر اور ہندوؤں پر بھروسہ کے طلسم کو توڑ کر ذرا نیچے اتر سکتے ہیں۔ اس طرف وہ وفادار مسلمان جو آستانہ حکومت پر ناک رگڑتے رگڑتے عاجز ہو چکے ہیں ذرا بلند ہو کر خودداری اور عزت نفس کی لذت بھی چکھ سکتے ہیں۔"

ہمیں طول و عرض ہند میں کسی ایسے نالائق مسلمان کا علم نہیں جس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں کے جنازوں کو بھی کندھا نہ دیا ہو اور نہ کسی ایسے احمق ہندو کی ہمیں خبر ہے جس کے نزدیک کسی مسلمان کا اپنے ہی کسی ہم مذہب کے جنازہ کو کندھا نہ دینا' ہندوؤں کی کوئی مذہبی یا سیاسی خدمت ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک مسلمان کو ہم جانتے ہیں جس نے بال گنگا

دھر تلک آنجہانی کی ارتھی کو کندھا بھی دیا تھا اور ماتھے پر تلک بھی لگایا تھا اور یہ بزرگ حضرت بابائے خلافت ہیں۔ "خلافت" کے افتتاحیہ نویس کا روئے سخن دراصل حضرت ممدوح کی طرف تھا۔ لیکن یہ "غیر ضروری حرکت" اصل واقعہ پر پردہ ڈالنے کے لیے ان "انتہا پسند مسلمانوں" پر چپیک دی گئی جن کا کہیں وجود نہیں۔ اس صورت حال میں سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اگر حضرت بابائے خلافت اپنی انتہا پسندی کے مقام رفیع سے "ذرا نیچے اتر سکتے ہیں" یعنی اکابر ہنود کی ارتھیوں کو کندھا دینے اور جبین پر قشقہ لگانے کی "حرکات غیر ضروری" سے باز آ سکتے ہیں تو کیا ان کی یہ میانہ روی علامہ سر اقبال کو بھی "جو آستانہ حکومت پر ناک رگڑتے رگڑتے عاجز ہو چکے ہیں' ذرا بلند ہو کر خودداری اور عزت نفس کی لذت" چکھنے پر آمادہ کر سکے گی۔ دیدہ باید۔

(زمیندار' ۲۔ دسمبر ۱۹۲۸ء)

فکاہات

اقبال اور ٹیگور

اشاعت پریروزہ میں ہم نے ایک شذرہ کے ذریعہ سے کجکلاہ ایران کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی تھی کہ جہاں آپ نے ایشیا کے ممتاز شاعر سر رابندرناتھ ٹیگور کی عزت افزائی فرما کر اسلام کی روایات معارف پروری و حکمت نوازی کا احیا کیا ہے' وہاں اسلام کے اس جلیل القدر شاعر کو نظرانداز نہ فرمایئے جو اقبال کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ وہ اپنی تعلیمات اور اپنی صاف گوئی کے جرم میں مغرب کے نزدیک مغضوب و معتوب سہی' لیکن مشرق اور عجم رہتی دنیا تک اس کے احسانات سے سبکسار نہیں ہو سکتے۔ اور ایران نے اس کے خصائص محتسہ کا اعتراف نہ کیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ دنیا شہنشاہ پہلوی کی بالغ نظری کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کرے گی۔

اس شذرہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے کفر و توحید کے امتیاز و تفریق کا سوال پیدا ہو اور کسی کے پیٹ میں جاتی کے حقوق و مفاد کے تحفظ کا مروڑ اٹھنے لگے لیکن قربان جایئے "ملاپ" کے مہاشہ "غبی" کی غیرت و حمیت کے کہ اب ان کا ظرف اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ کسی اسلامی سلطنت کی طرف سے اسلام کے کسی عظیم المرتبت فرزند کی قدر افزائی کے امکان کا تصور بھی ان کے (کی؟ جعفر) طبع نازک کو گراں گزرتا ہے اور ایران کو بھی اپنی آئندہ تگ و تاز کی آماجگاہ تصور کرتے ہوئے وہاں ایک اسلامی شاعر کا غلغلہ بلند ہونے کے تخیل سے ایسے حواس باختہ ہو جاتے ہیں گویا یہ بھی ۵۶ فی صدی حقوق کے مطالبہ کا شاخسانہ ہے اور خدانخواستہ "خسرو ایران" نے "زمیندار" کا مشورہ قبول کر لیا تو جاتی کے نوخیز ماعروں کی وہ جماعت جس کے "جذبات عالیہ" سے "ملاپ" کی دکان کی رونق قائم ہے' ایک زرخیز اسامی سے محروم ہو جائے گی۔ اور اقبال کے افادات عالیہ سے متعارف ہونے کے بعد ایران کا نکتہ رس شہنشاہ آئندہ ٹیگور

کا منہ چڑھانے والوں کے لیے "عرش پیمائی" کے سامان بہم نہ پہنچائے گا۔

ارشاد ہوتا ہے

"زمیندار" نے ایک شذرہ سپرد قلم کیا ہے جس میں شہنشاہ ایران --- رضا شاہ پہلوی پر کوتاہ نظری کا الزام لگایا گیا کہ انہوں نے "ملک الشعرا" ڈاکٹر ٹیگور کی' جو کافر ہیں' قدر افزائی کی' لیکن ڈاکٹر اقبال کو جو فرزند توحید ہیں' فراموش کر دیا۔"

ہم نے ٹیگور کو ایشیا کا ایک ممتاز شاعر لکھا تھا اگر 'ملاپ' کے لغات عصبیت میں ممتاز کے معنی کافر کے ہوں تو یہ اور بات ہے' لیکن ہمارے نزدیک شعر و سخن کا معیار کفر و اسلام سے ہوتا تو ہم اس عقیدہ پر قائم نہ ہوتے کہ مسز سروجنی نائیڈو مضمار سخن میں آپ کے "ملک الشعرا" سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔

"ملاپ" کے 'مغبی' کو کون بتائے کہ آج آپ جس کے کفر پر فخر کر رہے ہیں اس کا باپ دیوان حافظ کا حافظ اور تصوف اسلامی کا عالم متبحر تھا اور ٹیگور کو اس کی تربیت اور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ نے "ایشیا کا ممتاز شاعر" بنایا ہے۔ اور ٹیگور ہی پر موقوف نہیں' آج ہندوستان میں جتنے ممتاز ارباب علم نظر آ رہے ہیں' وہ کسی نہ کسی واسطہ سے اسلام کے مصدر علم و منبع حکمت سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ باقی رہا نوبل پرائز اور اعزازی ڈگریوں کا سوال تو ظاہر ہے کہ سرمایہ داری کے اس منحوس دور میں عز و وقار' وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اپنی شخصیت کے پروپیگنڈہ کے لیے خزانہ قارون رکھتا ہو اور اقبال غریب اس قوم کا فرد ہے جس کی دولت و ثروت پر "ملاپ" کے بھائی بندوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

پھر ٹیگور کے مقابلہ میں جن کی تعلیمات بقول "بندے ماترم" غیر عملی اور قبل از وقت ہیں' شمشیر بے نیام اقبال کو جس کا ہر ہر مصرعہ استعمار کی رگ جان کے لیے زہرناک نشتر کی حیثیت رکھتا ہے' نوبل پرائز کا طعن وہی دے سکتا ہے جس کی عقل میں اتنی موٹی سی بات بھی نہ آئے کہ نوبل پرائز کے مستحقین کا انتخاب کرنے والے بہرحال کسی ایسے شخص کو اس کا اہل نہیں قرار دے سکتے جو ان کے مادی تمدن کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہو' خواہ وہ شخص بجائے خود افلاطون دہر و سقراط عصر کیوں نہ ہو۔

(زمیندار۔ ۲۸/ جون ۱۹۳۲ء)

نوٹ: مولانا ظفر علی خاں کے فکاہی کالموں پر ان کا اصل یا قلمی نام (نقاش) لکھا جاتا تھا۔ مندرجہ

بالا تحریر اخبار زمیندار میں فکاہات کے کالم میں شائع ہوئی تھی لیکن اس پر بطور کالم نگار کسی کا نام درج نہیں ہے۔ اسلوب تحریر کے حوالے سے یہ کالم نگارشات ظفر علی خاں سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے اس لیے قیاساً" اسے مولانا ظفر علی خاں ہی کے رشحات قلم میں شمار کیا جاتا ہے (جعفر)

فکاہات

قادیانیت اور اقبال (۱)

[از نقاش]

"یاد رہے کہ یہ حوا کا گناہ تھا کہ براہ راست شیطان کی بات کو مانا اور خدا کے حکم کو توڑا اور سچ تو یہ ہے کہ حوا کا نہ ایک گناہ بلکہ چار گناہ تھے۔ ایک یہ کہ خدا کے حکم کی بے عزتی کی اور اس کی کو جھوٹا سمجھا دوسرا یہ کہ خدا کے دشمن ابدی' لعنت کے مستحق' اور جھوٹ کے پتلے شیطان کو سچا سمجھ لیا۔ تیسرا یہ کہ اس نافرمانی کو صرف عقیدہ تک محدود نہ رکھا بلکہ خدا کے حکم کو توڑ کر عملی طور پر ارتکاب معصیت کیا۔ چوتھا یہ کہ حوا نے نہ صرف آپ ہی خدا کا حکم توڑا، بلکہ شیطان کا قائم مقام بن کر آدم کو بھی دھوکا دیا۔ تب آدم نے محض اس کی دھوکا دہی سے وہ پھل کھایا جس کی ممانعت تھی۔ اسی واسطے حوا خدا کے نزدیک سخت گنہ گار ٹھہری مگر آدم معذور سمجھا گیا۔" تحفہ گولڑویہ ص ۱۷۴

مولانا عبدالحنان نائب ناظم جمعیتہ العلما پنجاب کی نظر سے جب وہ مرصع قصیدہ گزرا جو جناب مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی نے ابوالبشر حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام کی رفیقہ حیات کی شان میں بہ صفت غیر منقوط تصنیف فرمایا ہے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ الٰہی تیری غیرت کو کیا ہوا۔ لوگ تجھ پر بہتان باندھتے ہیں جو تو نے نہیں کہا وہ تجھ سے منسوب کرتے ہیں اور تو ہے کہ ان کو اور ان کے لگے بندھوں کو اپنی بطش شدید کی آتشیں زنجیروں میں نہیں جکڑتا۔ آدم و حوا علیہا السلام کا قصہ اپنی کلک قدرت سے سپرد لوح محفوظ کرتے وقت تو تو یہ لکھتا ہے کہ فازلھما الشیطان عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ (البقرہ۔ ۳۶)

[پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا کر جنت سے نکال دیا]

مگر مرزائے قادیان تجھے یہ کہہ کر جھٹلاتا ہے کہ آدم کو تیری جنت سے نکالنے والا ابلیس

لعین نہ تھا بلکہ اس مردود ازلیٰ کی قائم مقام حوا تھی۔ پھر اے رب کعبہ تو ہی بتا کہ ہم تیرے کلام کو سچ سمجھیں یا غلام احمد قادیانی کے فرمودہ کو۔

جناب مرزائے قادیانی کی امت بڑے فخر سے کہا کرتی ہے کہ ہمارے نبی نے قرآن کی جو تفسیر کی ہے وہ طبری،اور رازی کے فرشتے خاں کو بھی نہ سوجھی ہو گی لیکن جناب کی وسعت نظر ملاحظہ ہو کر حضرت حوا علیہا السلام کو اپنی عادت کے مطابق گالیاں دیتے وقت کلام مجید کی اس آیت کو آپ نے نظری فرما دیا کہ ۔

فتلقی ادم من ربہ کلمات فتاب علیہ انہ ھو التواب الرحیم۔ (البقرہ۔ ۳۷)
[پس آدم نے اپنے پروردگار سے ایک دعا سیکھی جو مقبول ہوئی اس لیے کہ پروردگار عالم توبہ کا قبول کرنے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔]

وہ دعا بھی ملاحظہ ہو :

ربنا ظلمنا انفسنا فان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین (الاعراف۔ ۲۳)
[ہمارے پروردگار۔ ہم نے (یعنی آدم و حوا دونوں نے) اپنی جانوں پر ظلم کیا پس اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ٹوٹے میں رہیں گے۔]

یہ دعا جب قبول ہو چکی' جیسا کہ خود خداوند عالم و عالمیاں ارشاد فرماتا ہے' تو ظاہر ہے کہ آدم و حوا کی لغزشوں پر بارگاہ خداوندی سے قلم عفو کھینچ دیا گیا۔ اور دونوں کا شمار اس کے بعد سے اور اپنے آئندہ صالحانہ طرز عمل کے لحاظ سے' صلحا و اتقیا میں ہو گیا۔ ایسی حالت میں حضرت حوا کو شیطان کا قائم مقام قرار دینا اور دنیا جہان کے گناہوں کی گٹھڑی ان کے سر اقدس پر لاد دینا مرزا غلام احمد قادیانی جیسے منہ پھٹ شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ خدا کلام کرتا ہے اور جبرئیل کو ہمارے پاس بھیجتا ہے اور ہم اس مقام پر جا پہنچے ہیں کہ محمد مصطفیٰ کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ نعوذ باللہ من تلک الھفوات و الخرافات۔

علامہ اقبال کے سامنے جب اگلے دن حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں قادیانیوں کے قبلہ و کعبہ کا یہ عقیدہ پیش کیا گیا تو علامہ ممدوح نے چمک کر کہا کہ یہ وہی حوا ہے جس کی ایک نواسی محمدی بیگم کی خاطر آپ نے کئی ایک شکم زاد الہام سپرد کاغذ کیے۔ جب الہام پورے نہ ہوئے تو ان کی بیسیوں خندہ آفریں تاویلیں کیں اور بالآخر خسر الدنیا والآخرہ ہو کر راہ گرائے

دارالبوار ہو گئے۔ اور پھر یہ وہی حوا ہے جس کی بیٹیوں نے آپ کے خلف الصدق مرزا بشیر الدین محمود سے فلسفہ مشی فی النوم کے اسرار و خفایا پر ان گنت رنگیلی شرحیں لکھوائیں۔ شیطان کی قائم مقامی کا فرض تو انجام دیں مرزائی' اور الزام اس شیطنت کا چسپک دیں تمام انسانوں کی ماں کے سر۔ معلوم نہیں قادیانی کس قسم کے انسان ہیں اور کس حوا کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟

(زمیندار' ۳۔ جولائی ۱۹۳۲ء)

فکاہات

قادیانیت اور اقبال (۲)

[از نقاش]

(حضرت حوا اور متنبی قادیان)

ابوالبشر آدم صفی اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقہ حیات حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کا گھناؤنا عقیدہ زمیندار کی کسی گزشتہ اشاعت میں قارئین کرام کی طبیعت کے لیے تعفن کا سامان بہم پہنچا چکا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ علامہ اقبال نے اس ناپاک عقیدہ سے اپنی بیزاری کا اظہار سختی سے کیا تھا جسے راقم الحروف نے اپنے الفاظ میں درج کر دیا۔ جن صاحب کی روایت کی بنا پر یہ سارا واقعہ سپرد قلم کیا گیا انہیں راقم کے قلم سے شکوہ ہے کہ وہ شاید موضوع کی رنگینی کی سفارش پر کسی قدر شوخ ہو گیا۔ ان کی خواہش ہے کہ علامہ اقبال کے اصل الفاظ کو علامہ ممدوح ہی کی خشک حکیمانہ متانت کے لباس میں دنیا والوں کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے امتثال امر میں کوئی عذر نہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال کو "تحفہ گولڑویہ" مصنفہ متنبی قادیان کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی گئی جس میں اس مفتری علی اللہ نے قرآن کریم کی آیات کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حوا نے شیطان کی قائم مقام بن کر آدم کو جنت سے نکال دیا اور علامہ ممدوح سے استفسار کیا گیا کہ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے تو انہوں نے فرمایا :

> "یہ عقیدہ مسلمانوں کا تو نہیں البتہ عیسائی ضرور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ رہے مرزا غلام احمد قادیانی، سو تعجب ہے کہ عورت ذات کے ساتھ ان کے تعلقات کی عمر بھر کی نوعیت نے کس طرح گوارا کیا کہ حضرت حوا کو ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا جائے۔ اور یوں بھی کسی شریف النفس انسان کا جذبہ مروت و فتوت صنف نازک پر ایسے

رکیک حملہ کی تاب نہیں لا سکتا۔"

اسی انداز میں چند باتیں علامہ اقبال کی زبان سے جناب مرزائے قادیانی آنجہانی کے صاحب زادہ بلند اقبال کی نسبت بھی صادر ہوئیں جو اس وقت ذہن سے اتر گئی ہیں۔ بہرحال یہ بات تو متحقق ہو گئی کہ متنبی قادیان کے عقائد کو مسلمانوں کے عقائد سے دور کا انتساب بھی نہیں۔ نصرانیت کی ترجمانی کا ڈھنگ البتہ انہیں خوب آتا ہے۔

ہمارے علماء نے قادیانیوں کو ان کے باطل عقائد کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا لیکن بوالعجبی ملاحظہ ہو کہ کسی سربرآوردہ قادیانی کا ذکر جب ناموس مصطفویؐ کے ان پاسبانوں کے حلقہ میں آتا ہے تو وہ بلاتکلف اسے "مولوی" یا "مولانا" کے لقب سے ملقب فرما دیتے ہیں مثلاً اگر وہ اندلسی قادیانیوں کے امام مسٹر محمد علی کا نام لیں گے، جو مسلمانوں کو "ذریتہ البغایا" قرار دینے میں اور علمائے امت پر گالیوں کا جھاڑ باندھنے میں اپنے کسی بڑے سے بڑے دمشقی خواجہ تاش سے کم نہیں، تو انہیں "مولانا محمد علی" کہہ کر یاد کریں گے۔ جب ان لوگوں کے عقائد بقول علامہ اقبال عیسائیوں کے سے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ علمائے کرام اور عامتہ المسلمین ان کو مولوی کہہ کر پکاریں جو صرف ذی علم مسلمانوں کا امتیازی وصف ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہہ دے کر حضرت مولانا لائڈ جارج نے یوں فرمایا اور حضرت مولوی سیموئل ہور کا یہ ارشاد ہے۔ بہتر ہو گا کہ آئندہ سے ہر قابل ذکر قادیانی کو عام اس سے کہ وہ اندلسی ہو یا دمشقی، مسٹر کہہ کر مخاطب کیا جائے اور جو ان کے امام ہوں انہیں پادری کے معزز لقب سے یاد کیا جائے اور موسیو کا لقب تو موسیو مرزا بشیر الدین محمود کے لیے وقف ہو ہی چکا ہے۔

(زمیندار ۶۔ جولائی ۱۹۳۲ء)

نوٹ: مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیوں کے دو معروف فرقوں کے لیے دمشقی اور اندلسی قادیانی کی بدیع اصطلاحات وضع فرمائی تھیں۔ دمشقی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو مرزا غلام احمد کو مستقل نبی مانتے ہیں۔ اس فرقے کے امام مرزا بشیر الدین محمود تھے۔ اندلسی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو متنبی قادیان کو مجدد کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس طائفہ کے امام مسٹر محمد علی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ دونوں فرقوں کا یہ فرق صرف لفظی ہیر پھیر ہے حقیقت میں دمشقی اور اندلسی قادیانی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ (جعفر)

ضمیمہ — ۳

متفرق تحریریں

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید و تشکیل

(علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی تقاریر)

قادیانیوں اور ان کے حامیوں کے نام مسترد کر دیے گئے باشندگان لاہور کا عظیم الشان جلسہ عام

لاہور۔ ۳۔ جولائی آج رات کے نو بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں مسلمانان لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ زیر صدارت میاں عبدالعزیز صاحب صدر بلدیہ لاہور منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد ابتدا میں پانچ ہزار کے قریب اور اختتام کے وقت آٹھ ہزار سے متجاوز تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور علامہ سر محمد اقبال کی تشریف آوری پر حاضرین جلسہ نے اللہ اکبر کے پرجوش نعرے بلند کیے۔ مولوی محمد یعقوب نے قرآن حکیم کے ایک رکوع کی تلاوت کی اور مولوی احمد یار خاں نے علامہ اقبال کی ایک نظم گا کر سنائی۔ صاحب صدر کی درخواست پر علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کے متعلق تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

علامہ اقبال کی تقریر

"علامہ اقبال نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے اسباب و علل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں ایک بیان اخبارات میں شائع کرا چکا ہوں اور بعض اخبارات نے مرے اس بیان پر تنقید کی ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود کی طرف سے بھی میرے اس بیان کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب الجواب کے لیے میں اخبار کے صفحات کے بجائے اس جلسہ کو ترجیح دیتا ہوں جو میرے مشورہ کے مطابق مسلمانان لاہور نے منعقد کیا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا کہ مسلمانوں میں ابھی سیاسی زندگی کا آغاز ہے اس لیے ضروری ہے جمہور اسلام ہر معاملہ پر اچھی طرح غور کریں اور ان کے سامنے تمام مسائل پر پوری روشن ڈالی جائے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات مٹا کر ایک ہو جائیں اور

سیاسیات حاضرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے لیے مفید راہ تلاش کریں۔

آپ نے کہا کہ پچیس تیس سال ہوئے جب لاہور میں آل انڈیا کشمیر کانفرس کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کانفرنس میں صرف اہل خطہ حضرات اور کشمیری قومیت رکھنے والے شامل ہو سکتے تھے۔ میں نے اس وقت بھی اس امر سے اختلاف کا اظہار کیا تھا اور میری رائے تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جس میں ہندوستان کے وہ تمام افراد شامل ہو سکیں جو اہل کشمیر سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ چنانچہ میں اس کانفرنس میں شامل نہیں ہوا۔ اس کانفرنس نے کشمیر کے مسلمان لڑکوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ریاست میں ملازمتیں نہ ملیں۔ چنانچہ وہاں اضطراب پیدا ہوا اور زبردست تحریک شروع ہو گئی۔ اس تحریک کے جاری کرنے کا الزام میرے اور سر محمد شفیع مرحوم کے سر تھوپا گیا۔ ان دنوں میں شملہ میں تھا۔ وہاں پر ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ چونکہ عام طور پر خیال یہ تھا کہ اس کمیٹی کی ضرورت چند روز کے لیے عارضی طور پر ہو گی' اس لیے اس کا کوئی آئین یا ضابطہ نہ بنایا گیا اور اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر ہوئے۔ کشمیر کے اندرونی حالات کے تغیر کے طول پکڑ جانے کے باعث اس کمیٹی کے کام کو جاری رکھنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تین چار سال تک یہ حالات درست نہ ہو سکیں گے اور کشمیر کمیٹی کو زندہ رکھنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

قادیانیوں کی ضرورت ۔

شملہ میں قائم ہونے والی عارضی کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود تھے جن سے کمیٹی کے بعض ارکان کو اختلاف پیدا ہوا اور تجویز کی گئی کہ نئے انتخاب عمل میں لائے جائیں۔ مرزا صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی نے عارضی طور پر مجھے صدر اور ملک برکت علی کو سیکرٹری مقرر کر دیا تھا کہ کمیٹی کے ضوابط مرتب کر کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اس کے بعد محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں کمیٹی کے ضوابط کا آئین پیش کیا گیا۔

اس موقع پر علامہ سر اقبال نے اس جلسہ کی داستان سنائی اور حاضرین کو بتایا کہ اس جلسہ میں قادیانی ممبروں نے اس قسم کی ترمیمیں پیش کرنی شروع کر دیں جن کا مقصد میں یہ سمجھا کہ یہ لوگ کمیٹی کے اندر قادیانی حلقہ کی ایک اور کمیٹی بنانا چاہتے ہیں۔ جس سے کام خوش اسلوبی سے نہیں ہو سکے گا چنانچہ میں نے جلسہ کا رنگ دیکھ کر اپنی رائے ظاہر کر دی اور زبانی طور پر استعفیٰ پیش کر دیا۔ دو دن کے بعد میں نے اخبارات کو بیان دیا اور عامتہ المسلمین سے اپیل کی کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے لیے عام جلسہ منعقد کریں۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے سیاسی انجمنوں میں قادیانیوں کی شمولیت پر مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں اگرچہ میں ان کے عقائد کو غلط سمجھتا ہوں لیکن کشمیر کمیٹی کے واقعات نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ قادیانی کسی غیر قادیانی انجمن میں پوری وفاداری کے ساتھ کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہر جگہ اس ذہن کے ساتھ جاتے ہیں کہ ان پر اپنے امام کی اطاعت' جسے وہ نبوت کے سلسلہ سے تعبیر کرتے ہیں' ہر شے پر مقدم ہے۔ مرزا صاحب کی طرف سے میرے اس اعتراض پر جو جواب شائع ہوا ہے اس میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا گیا۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ بعض دوسری اسلامی انجمنوں میں بعض قادیانی کام کر رہے ہیں۔ لیکن میرا جواب یہ ہے کہ ان انجمنوں میں ابھی تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ جس سے قادیانیوں کی وفاداری کا امتحان ہو سکتا۔ علامہ سر محمد اقبال نے مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان کی تکذیب کی کہ مسلم کانفرنس میں ان کے برابر کسی نے چندہ نہیں دیا۔ جس کی تعداد تین ہزار روپیہ تھی۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ (میں) آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں اعلان کر سکتا ہوں کہ بعض مخیر مسلمانوں نے بیک وقت آٹھ آٹھ ہزار روپیہ کی رقمیں مسلم کانفرنس کو دی ہیں۔ قادیانیوں کا دعویٰ غلط ہے۔

کمیٹی کی تشکیل کا مسئلہ

علامہ اقبال نے کہا کہ اب یہ معاملہ محمڈن ہال سے نکل کر آپ کے سامنے آگیا ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا کشمیر کمیٹی کی ہیئت ترکیبی وہی رہے جو پہلے تھی یا اسے بدل دیا جائے (آوازیں کشمیر کمیٹی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر ہے تو وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں۔)

علامہ اقبال نے اپنی تقریر کے آخری حصہ میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کی تجویز سے حاضرین کو آگاہ کیا کہ کشمیر کمیٹی کی جگہ ایک آل انڈیا مسلم سٹیٹ ڈیفنس کمیٹی بنائی جائے جو تمام ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لے۔

صاحب صدر کا تبصرہ

ازاں بعد صاحب صدر نے حاضرین سے کہا کہ علامہ سر اقبال نے تمام حالات آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں ان کا یہ مقصد نہیں کہ کسی کو اس کے مذہبی عقائد کی بنا پر کمیٹی سے نکالا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد صحیح اصول پر قائم کی جائے تاکہ کمیٹی کشمیر کے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو (ایک آواز۔ مگر کمیٹی میں مرزائی نہ رکھے جائیں کیونکہ انہوں نے اسے تبلیغ کا میدان بنا لیا ہے)

ملک برکت علی کی تقریر

ملک برکت علی نے اس مختصر مگر پرزور تقریر کے بعد حسب ذیل قرارداد پیش کی۔
"اہل لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی اس تجویز کو صمیم قلب سے تسلیم کرتا ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو ایسے طریق پر تشکیل دیا جائے جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کی آرا کی پورے طور پر نمائندگی ہو تاکہ نہایت موثر طریق سے مسلمانان کشمیر کے جائز حقوق کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن اور پروپیگنڈا ہو سکے تاکہ وہ اپنے ملک کی خدمت میں ذمہ دار طور پر شریک ہوں۔ یہ عظیم الشان اجتماع ڈاکٹر سر محمد اقبال پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے انہیں اس بات کا پورا حق دیتا ہے کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیادی انجمن کے ارکان نامزد کریں اور یہ مجلس کمیٹی کا آئین تیار کرے اور جیسا مناسب ہو' کمیٹی کے نام تبدیل کرے۔ عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لائے اور دیگر امور کا تصفیہ کرے جو کمیٹی کے کاروبار کے لیے ضروری ہوں۔ اور یہ مسلمانان ہند کی اس بہترین آرگنائزیشن کے شایان شان ہو۔"

حاجی شمس الدین نے اس قرارداد کی تائید کی اور قرارداد منظور ہو گئی۔ صرف دو قادیانیوں نے اختلاف کا اظہار کیا۔

نئی کمیٹی کی تشکیل

ازاں بعد صاحب صدر نے علامہ اقبال سے درخواست کی کہ وہ نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ارکان کے نام نامزد کریں۔ حضرت علامہ نے اٹھ کر کہا کہ بعض حضرات نے مجھے نئی کمیٹی کے لیے اسماء کی ایک فہرست دی ہے۔ میں وہ فہرست اس جلسہ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جلسہ کا اختیار ہے کہ جسے چاہے ممبر رہنے دے اور جسے چاہے نکال دے۔ ملک برکت علی نے نام پڑھ کر سنائے اور حاضرین منظور منظور کے نعرے بلند کرتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب نام پڑھ کر سنائے گئے۔ حاضرین نے قادیانیوں اور لاہوری مرزائیوں کے علاوہ مولانا سید حبیب آف سیاست اور مولانا غلام رسول مہر' مولانا عبدالمجید سالک' مولانا اسمٰعیل غزنوی اور.... وغیرہ کے نام مسترد کر دیے اور ان کی جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولوی مظہر علی اظہر' مولانا داؤد غزنوی' غازی عبدالرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن کے نام شامل کیے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر

ازاں بعد حضرت مولانا ظفر علی خاں نے دوسری قرار داد پیش کی جو شیخ محمد عبداللہ اور دیگر اسیران سیاسی کی رہائی اور مقدمات کی واپسی کے مطالبہ پر مشتمل تھی۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص اور دلفریب انداز میں فرمایا کہ "آج میری طبیعت خوشی سے باغ باغ ہے۔ آج میں اپنی سالہا سال کی جدوجہد کے آثار اس جلسہ کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ اس وقت کونے کی اینٹ کون ہے۔ مرزا بشیر محمود کا وہ مقولہ سنا ہو گا کہ ہم کونے کی اینٹ ہیں' جس پر یہ اینٹ گرے گی' وہ سرپاش پاش ہو جائے گا اور جو کھوپری اس اینٹ سے ٹکرائے گی وہ ٹوٹ جائے گی۔ آج یہ مقولہ اس اجتماع کے حق میں تبدیل ہو گیا اور آپ حضرات نے ثابت کر دیا کہ کونے کی اینٹ کون ہے۔

حضرت مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ مجھے کشمیر سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میرے والد محترم اپنی عمر کا ایک حصہ کشمیر میں بسر کر چکے ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ کشمیر کے چپے چپے پر پھر چکا ہوں۔ آج میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں کیونکہ آپ نے مجھے اس کمیٹی کا رکن بنایا ہے اور اب یہ کمیٹی آپ کی تشکیل کردہ جماعت بن گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم ان واقعات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ کشمیر میں ایک پتلا دبلا ڈوگرہ ایک موٹے تازے مسلمان کو بید سے مارتا تھا اور مسلمان اس کے سامنے بچے کی طرح بلبلا کر روتا تھا۔ میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن اب مظالم سے تنگ آ کر وہاں کے مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کی اور ہمت مردانہ کے ساتھ ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے وہ اپنے حقوق اور جائز مطالبات کے لیے سرکفن میدان میں نکل آئے ہیں۔ آپ نے مسلمانان کشمیر کے اندرونی اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان اختلافات کی وجہ یہی قادیانی تبلیغ ہے۔ بعض مسلمانوں نے غلطی کی کہ اس کام میں قادیانیوں کو ساتھ ملایا۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آج ہم علامہ اقبال کو پھر اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں چاہئے کہ حکومت کشمیر سے اپیل کریں کہ وہ کھونٹا جس کے بل بوتے پر یہ فسادات رونما ہوئے تھے' اکھاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی قادیانیوں کی مفسد جماعت کو کمیٹی سے باہر نکال دیا گیا ہے اور اب یہ خالص مسلمانوں کی جماعت بن گئی ہے لہٰذا حکومت کشمیر کو چاہئے کہ اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو کر اپنے ہاں امن قائم کرے۔

کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کے ہاتھ میں دینے کے نتائج آپ نے دیکھ لیے۔ اہل کشمیر اور ان کے لیڈر مجبور تھے کہ قادیانیوں کو اپنے ہاں رسوخ بڑھانے دیں۔ شیخ محمد عبداللہ مجبور تھا کہ

قادیان سے تعلق رکھے۔ اب وہ لوگ مسلمانوں سے رشتے استوار کریں گے اور شیخ عبداللہ کو قادیانی تصفیہ کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

دوسری قرارداد

مولانا ظفر علی خاں نے حسب ذیل قرار داد پیش کی جس کی تائید مولوی محمد الدین فوق نے کی اور قرارداد منظور ہو گئی۔

"مسلمانان لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ کشمیر کے افسوس ناک حالات حاضرہ کو بہ نگاہ اضطراب دیکھتا ہے جس کی بنا پر بلا امتیاز کشمیر کے لیڈرز اور ان کے رفقاء کو اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا ہے کہ اس طریق عمل سے مختلف اسلامی طبقوں میں صلح و آشتی پیدا ہو گی۔ اس جلسہ کی پختہ رائے یہ ہے کہ موجود قابل افسوس حالات کو رو براہ لانے کے لیے شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے اور ریاست بھر میں جس قدر مقدمات گزشتہ فسادات کشمیر کے زیر سماعت ہیں' ان کو واپس لے لیا جائے۔"

تیسری قرارداد

(تیسری قرارداد کرسی صدارت کی طرف سے پیش کی گئی اور منظور ہوئی اس قرارداد میں کہا گیا کہ مسلمانان ہند کشمیری مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کریں اور اپنے اندرونی اختلافات مٹا کر متحد ہو جائیں۔ ملخص از جعفر)

آخر میں مولانا ظفر علی خاں نے نئی کشمیر کمیٹی کی مالی امداد کے لیے اپیل کی اور بہ نفس نفیس مبلغ سو روپیہ دینے کا اعلان فرمایا۔ اور مولانا محمد بخش مسلم نے عید میلاد النبی کے جلوس کا اعلان کیا۔ جلسہ رات کے بارہ بجے برخاست ہوا اور دعا مانگی گئی۔

(زمیندار' ۱۰۔ جولائی ۱۹۳۱ء (ص ۱۴)

جشن استقلال

(روزنامہ زمیندار کا ایک اداریہ)

آج جشن استقلال منایا جا رہا ہے۔ یہ مظاہرہ ہماری صد و پنجاہ سالہ جدوجہد کا حاصل ہے۔ بے شمار قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ آزادی کے لیے کیا کچھ نہ کیا گیا لیکن ان باتوں کا تذکرہ بعد از وقت ہے۔ ہر قوم کو آزادی کے لیے ہر ممکن قربانی کرنا پڑتی ہے۔ اس بیش بہا جنس کی جو قیمت ہمیں ادا کرنا پڑی' اس کی نظیر و مثال کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جتنی قربانیاں ہمیں چند ماہ میں کرنا پڑیں اتنی کسی قوم نے چار سو برسوں میں بھی نہ کی ہوں گی۔ پاکستان کیا ہے؟ ۷۰ لاکھ مسلمانوں کی خانہ بربادی کا پھل ہے۔ لاکھوں فرزندان توحید کی شہادت کا ثمرہ ہے۔ اور جو مالی نقصان ہوا اس کا تذکرہ ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جان اور عزت کے مقابلے میں مال کی کوئی حقیقت نہیں جو قوم لاکھوں انسانوں کی جانیں پیش کر سکتی ہے۔ اس کے نزدیک مالی قربانی کیا چیز ہے؟ جب پاکستان ہمیں اتنی قربانیوں سے ملا ہے تو اس کے ایک ایک ذرے کی حفاظت کے لیے کٹ مرنا ہمارا فرض ہے۔ آیئے آج اپنے خدا سے پیمان باندھیں کہ جئیں گے تو پاکستان کی حفاظت کے لیے جئیں گے' مریں گے تو میدان جہاد میں مریں گے اور دشمن کو مار کر مریں گے۔ مظلوم کی حمایت کریں گے ظالم کو فنا کر دیں گے۔ حق کا بول بالا کریں گے اور باطل کو نگوں سار کر کے دم لیں گے اور سب سے بڑا کام پاکستان میں قانون شریعت کا نفاذ ہے۔ جب تک اس ملک میں قانونی طور پر خدا کی حکومت نہ ہو گی نہ چین سے بیٹھیں گے نہ ارباب اقتدار کو چین کی سانس لینے دیں گے۔ مسلمان حکومتوں کی تبدیلی پر قناعت نہیں کیا کرتا۔ وہ نظام و آئین کی تبدیلی چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی قانون کوئی چیز نہیں۔ وہ صرف ربانی قانون کا پابند ہے۔ کیونکہ مسلمان خلیفتہ اللہ ہے اور فریضہ خلافت صرف قوانین خداوندی کا نفاذ ہے۔ جب تک خدا کی حکومت قائم نہیں ہوتی جشن استقلال نامکمل ہے اسے مکمل بنانے کے لیے کسی صحیح و صالح جدوجہد سے دریغ نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی جب تک مہاجرین از سر نو بحال و آباد نہ ہوں گے تو بھی ہمارا جشن مکمل نہ ہو گا۔ اس وقت ہماری خوشیوں سے غم بھی جھلک رہا ہے۔

نغموں میں آہیں بھی شامل ہیں۔ زمزموں میں چیخوں کی بھی آمیزش ہے اور جشن میں کچھ ماتمی اثر بھی ہے۔ کیونکہ ہمارے چار پانچ لاکھ بھائی ابھی کیمپوں میں پڑے ہیں انہیں اپنا مستقبل تک معلوم نہیں۔ ان کی قسمت اس سفینے کی طرح ہے جس کا طوفانی ریلے کے سوا کوئی ناخدا نہ ہو۔ ہزاروں لڑکیاں ابھی غیروں کے قبضے میں ہیں جن کی عزت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہزاروں مہاجرین مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آیئے آئندہ جشن سے پہلے ان فرائض سے سبکدوش ہو جائیں پھر ہمارا جشن مکمل ہو گا۔ لیکن یہ نامکمل جشن بھی ہزاروں مسرتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ ہماری آزادی کی عید ہے اور اس عید پر ہزاروں معمولی عیدیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ ہم عید استقلال پر سب سے پہلے قائداعظم کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں کیونکہ وہی پاکستان کے معمار اعظم ہیں۔ اس کے بعد مہاجرین کرام کی خدمت میں مبارکباد کا ہدیہ پیش کرتے ہیں جنہیں پاکستان کی قیمت عدیم النظیر قربانیوں سے پیش کرنا پڑی۔ پھر انصار کو مبارکباد کہتے ہیں۔ اور آخر میں سب سے درخواست کرتے ہیں کہ آیئے پاکستان کی خوشحالی اور جاودانی آزادی کے لیے دعا کریں۔

پاکستان زندہ باد

(زمیندار۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء)

مکتوب مولانا ظفر علی خاں

بنام حضرت علامہ اقبال و دیگر عمائد ملت

مخدوم و مطاع بندہ- زاد مجد کم- السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ'

اس نازک مرحلہ پر جب کہ انگریزوں سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہندو مسلم مفاہمت ناگزیر ہے' دلدادگان طریقہ انتخاب جداگانہ اور حامیان انتخاب مخلوط کی باہم آویزی مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کر رہی ہے' جس سے بجز خسران و خذلان کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا- دونوں فریقوں کو ایک نقطہ خیال پر جمع کرنے کی غرض سے بہت سی کوششیں پہلے بھی ہو چکی ہیں جو ناکام رہیں- لیکن اگر خدائے بزرگ و برتر کی رحمت شامل حال ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے المناک تشتت و انتشار کو رفع کرنے (کی) کوئی مخلصانہ کوشش اگر باسلوب مناسب آئندہ کی جائے تو اس کا حشر بھی وہی ہو جو مساعی سابقہ کا ہوا-

مسلمانان لاہور کی خواہش ہے کہ جانبین کو مسئلہ زیر بحث میں کوئی درمیانی راستہ اختیار کر کے ایک نقطہ نظر پر جمع کرنے کی ایک آخری کوشش اور کی جائے اور اس غرض سے کوئی بہت بڑی مشترکہ کانفرنس منعقد کرنے کے بجائے چیدہ چیدہ قائدین کرام کو دعوت دی جائے اور وہ سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور کسر و انکسار سے کوئی ایسا سیاسی کلیہ ملت کے لیے تجویز کریں جس سے سب کو اتفاق ہو تاکہ خانہ جنگی کی جو بلائے مہیب اس وقت مسلمانوں کے سر پر معلق ہے وہ ٹل جائے اور مسلمان اس قابل ہو جائیں کہ وہ اپنا متفقہ مطالبہ مہاتما گاندھی کی فیصلہ کن وساطت سے' جو کسی ایسے مطالبہ کے لیے بیحد مضطرب نظر آتے ہیں' برادران ہنود کے سامنے بطور حجت آخر پیش کر سکیں- اس نہایت ہی اہم اجتماع کے لیے جو وقت کی فوری ضرورت ہے' دعوت دینے کا منصب مجھے تفویض کیا گیا ہے اور مجھے مجاز کیا گیا ہے کہ حسب ذیل حضرات کو بہ تعین تاریخ لاہور میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دوں-

مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا شوکت علی
علامہ مفتی محمد کفایت اللہ	سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون

ڈاکٹر مختار احمد انصاری	علامہ سر محمد اقبال
خواجہ عبد الرحمن غازی	میاں سر محمد شفیع
مولانا عبد القادر قصوری	مولانا حسرت موہانی

پس میں جناب سے اسلام کی سیزدہ صد سالہ روایات کے نام پر' مسلمانان ہند کی عزت کے نام پر جو خطرہ میں ہے' اور ملت بیضا کی تاریخی وحدت و اکتناز کے نام پر صمیم قلب کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ اس عاجزانہ دعوت کو قبول فرمائیں اور یکم مئی کی شام یا ۲- مئی کی صبح تک رونق افروز لاہور ہو کر مسلمانان لاہور کی عزت بڑھائیں اور ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کا کوئی متفقہ حل سوچ کر اس بدنصیب ملت کی دعائیں لیں جو زیادہ دیر تک اپنے شیرازہ کی پریشانی کو سوہان روح بنائے رکھنے کی تاب نہیں لا سکتی- دوران قیام لاہور میں جناب کی فروکش کا مناسب انتظام کیا جا چکا ہے- اس عریضہ کا جواب بواپسی لطف ہو-

دعاگوئے ملت اسلامیہ

ظفر علی خاں

لاہور- ۲۱- اپریل ۱۹۳۱ء

(زمیندار- ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء)



اقبال اکادمی پاکستان